

عید نمبر 2

رداءاتِ محسن

SEPTEMBER

2012

PDFBOOKSFREE.PK

ماڈل: صائمہ یاس
میک اپ: مہرین بیگم
فوتو گرافی: مسیحی ارشد

سلسلے وار ناول

- ۲۸ رگ جاں سے جو قریب تھے صالحہ محمود
کبھی عشق ہو تو پتہ چلے شازیہ مصطفیٰ عمران ۱۶۰
بند قبا کھلنے لگی سعدیہ عابد ۹۶
سانس، شرک اور سکوت نانکھ طارق ۸۰

مکمل ناول

- ۱۸۰ اس دل میں بسے ہو تم انعم خان
تمہارے بن نہیں رہنا عابدہ سبین ۲۰۴
دلوں کے ملن قمر و شہک ۴۲
میری عید تم ہو انعم نذیر ۱۱۶

ناولٹ

- رب مہربان تو مہربان سعدیہ عابد ۵۴

ستمبر 2012ء

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 9

قیمت 50 روپے

پبلشر و ایڈیٹر صالحہ محمود نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

مقام: اشاعت ۱۲۹۰/ ذی ہجرت ۱۴۱۰ - پی۔ او۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ماہنامہ "رداء" جو انجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فیوچرل یا ڈرامہ "رداء" کی تشکیل اور سلسلے وار کسی بھی ذیل کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کرادے گا اس لئے مباشرت اجازت لینا ضروری ہے ادارہ "رداء" پبلیکیشنز



افسانے

- ۶۹ کیسے کروں میں شکر ادا عائشہ الیاس
۹۱ حال دل کیسے بتائیں سائرہ ناز شفیق
۱۴۲ میرے وطن کے اداس سیدہ طوبی
۱۵۲ میرا تہوار تم ہوں سمیرا غزل
۱۷۰ دل کا رشتہ اور اعتبار ام کلثوم حسین
۱۹۰ محبت اشک کی صورت رابعہ بصری ملک
۱۹۸ تنہا زندگی فرزانہ عمر دراز

ذریعہ بذریعہ رجسٹری

600 روپے



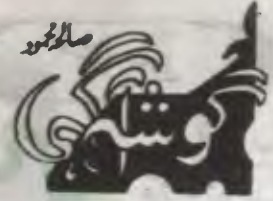
34535726

مستقل سلسلے

- ردائے جنت صالحہ محمود ۲۵ سندیے
ردا کی ڈائری صدف سعد ۲۱۶ کچن
ذرا پھر سے کہنا شہلا مشائق ۲۲۶ سنگھار
خوشبو نورین ملک ۲۲۳ اشعار
اس ماہ میں نورین ملک ۲۲۰ گوشہ چشم

- ۲۳۲ صالحہ محمود
۲۳۷ ثریا اقبال
۲۴۱ شہلا مشائق
۲۱۸ ادارہ
۲۳۶ ادارہ

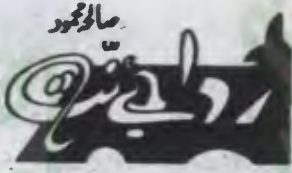




موسم، رنگ اور عید کی خوشیاں، دونوں اس بار ٹوٹ کر برسی ہیں، بادلوں سے بھرا آسمان خوش رنگ پھول، صحرا کی مہکتی ہوئی راتیں، اپنے رب کی عطا کی ہوئی نعمتیں ہیں، پہاڑ اور زمین کے نیچے دفن کی ہوئی ایک رائی بھی اللہ کے حکم سے باہر آ جاتی ہے، یہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، سچائی اور درگزر نہیں آپ کے دل کی روشنی ہے، وہ روشنی جو اللہ نے ایمان کی حرارت بنا کر ڈال دی ہے۔

زندگی عمل کی روشنی ہے، اس روشنی کو اپنے دل کے اندر تلاش کیجئے، دین کے لیے عمل کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ کا اخلاق کیسا ہے، اور آپ دوسروں کو کیسے نظر آتے ہیں؟ اگر انسان کا عمل نہ ہوتا تو انسان بے زبان پرندوں کی طرح ہے، مسلمان کی پہچان اس کا عمل ہے، ورنہ کبھی بھی ملائیتیا، چین، ریشیا، بھارت اور افریقہ میں ہمارا دین نہ پھیلتا۔ یہ مسلمانوں کا عمل تھا جس نے سامنے والے پر اپنے عمل سے اللہ کے اسرار و رموز کو ظاہر کیا۔ سامنے والے نے دیکھ کر اس پر جو عمل کیا وہ اللہ کی ہدایت تھی۔ ہدایت سربستہ راز ہے وہی نور ہے وہی عمل ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل کے اندر ایمان کی حرارت رکھیئے۔ ظاہری لبادہ اوڑھ لینے سے آپ کا عمل چھپ نہیں سکتا، یہ اللہ کا وعدہ ہے، ورنہ کبھی پہاڑ اور زمین کے نیچے سے رائی کا دانہ نکل آنے کی امید حضرت لقمان کبھی اپنے بیٹے کو کبھی سورہ لقمان میں ہدایت نہ دیتے۔

نئے لکھنے والوں سے ہمیں اُمید ہے کہ اپنی کاوش کے ساتھ ساتھ ”ردّاً“ پر تفصیلی خط ضرور لکھیں گے تاکہ ہماری کارکردگی، ہمارے کام کرنے کا اندازہ، ہماری فکر، ہمارے رائے و نظریات کی تحاریر، ان کا اندازِ بیاں، ان کی محنت، اچھی تحریر کی پہچان، بہتر سے بہتر ہو سکے، تاکہ ”ردّاً“ کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔ آپ اپنا خیال رکھیئے گا، نئے لکھنے والے اپنا سفر ”ردّاً“ کے ساتھ جاری رکھیں، ”ردّاً“ ان کے لیے ہے۔



اہل و عیال پر خرچ

☆ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”ایک وہ دینار جس کو تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا ایک وہ دینار جسے تم نے کسی مسکین پر خرچ کیا اور ایک وہ دینار جسے تم نے اپنے اہل و عیال پر خرچ کیا ان میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کا باعث وہ دینار ہے جسے تم نے اپنے اہل و عیال پر خرچ کیا ہے۔ (مسلم)

☆ جس سرمائے کو تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خرچ کرو گے اس پر تمہیں اجر ملے گا یہاں تک کہ جس قدر کو تم اپنی اہلیہ کے منہ میں ڈالو گے (اس پر بھی تمہیں اجر ملے گا)“ (بخاری)

ارشاد نبوی ہے۔ ”تم جو کچھ اپنی خورد و نوش پر خرچ کرو گے وہ بھی صدقہ ہے جو اپنی اولاد کو کھلاؤ پلاؤ گے وہ بھی صدقہ ہے اور جو کچھ تم اپنی اہلیہ کو کھلاؤ گے وہ بھی صدقہ ہے۔ (متدرک، حاکم حدیث صحیح ہے)

فرشتوں کی دعا

☆ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ”روزانہ جب اللہ کے بندے صبح کے وقت اٹھتے ہیں تو دو فرشتے (آسمان سے) اترتے ہیں۔ ایک کہتا ہے: ”اللہ تعالیٰ تجھے عطا فرما دوسرا کہتا ہے: ”اللہ تعالیٰ تجھ کو مال بلا کر کر۔“ (بخاری، مسلم وغیرہ)

مسلمان کو کھانا کھانا

☆ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی کو پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہے اور پانی پلاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے سات خندق میں دوڑ فرمادیتے ہیں۔“ (دو خندقوں کا درمیانی فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت ہے)۔ (متدرک حاکم)

اچھی بات کرنا اور کھانا کھانا

☆ حضرت حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ کون سا عمل جنت کو واجب کرنے والا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”تم اچھی طرح بات کرنے اور کھانا کھانے کو لازم پکڑو۔“ (بخاری)

ملازمین سے حسن سلوک

☆ حضرت عمرو در رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری حضرت ابو زرر رضی اللہ عنہ سے مقام ربذہ میں ملاقات ہوئی وہ اور ان کا غلام ایک ہی قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا (کہ کیا بات ہے آپ کے اور غلام کے کپڑوں میں کوئی فرق نہیں ہے) اس پر انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے غلام کو برا بھلا کہا اور اسی سلسلے میں اس کو مال کی غیرت دلائی۔ (یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”ابو زرر! تم نے

اس کو ماں کی غیرت دلائی ہے؟ تم میں ابھی جاہلیت کا اثر باقی ہے، تمہارے ماتحت (لوگ) تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارا ماتحت بنایا۔ لہذا جس کے ماتحت اس کا بھائی ہو اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے اور وہی پہنائے جو خود پہنے ماتحتوں سے وہ کام نہ لو جو ان پر بوجھ بن جائے اور اگر کوئی ایسا کام لو تو ان کا ہاتھ بٹاؤ۔“ (بخاری)

مسلمان کو کپڑا پہنانا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ ”جو مسلمان کسی مسلمان کو کپڑا پہناتا ہے تو جب تک پہننے والے کے بدن پر اس کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی رہتا ہے پہنانے والا اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتا ہے۔“ (ترمذی)

مسکین کو اپنے ہاتھ سے دینا

حضرت حارث بن نعمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”مسکین کو اپنے ہاتھ سے دینا، بری موت سے بچاتا ہے۔“ (مسلم)

امانت دار خرانچی

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”وہ مسلمان امانت دار خرانچی جو مالک کے حکم کے مطابق خوش دلی سے جتنا مال جسے دینے کو کہا گیا ہے اتنا اسے پورا پورا دے دے تو اسے بھی مالک کی طرح صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔“ (مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”جو مسلمان درخت لگاتا ہے پھر اس میں سے جتنا حصہ کھالیا جائے وہ درخت لگانے والے کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے اور جو اس میں سے چرالیا جائے وہ بھی صدقہ ہو جاتا ہے یعنی اس پر بھی مالک کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے اور جتنا حصہ اس میں سے درندے کھا لیتے ہیں وہ بھی اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے اور جتنا حصہ اس میں سے پرندے کھا لیتے ہیں وہ بھی اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے (غرض یہ کہ) جو کوئی اس درخت میں سے کچھ (بھی پھل وغیرہ) لے کر کم کر دیتا ہے تو وہ اس (درخت لگانے والے) کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

بنجر زمین

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”جو شخص بنجر زمین کو کاشت کے قابل بناتا ہے تو اسے اس کا اجر ملتا ہے۔“ (ابن حبان)

ہدیہ کا بدلہ

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”جس شخص کو ہدیہ دیا جائے، اگر اس کے پاس بھی دینے کے لئے کچھ ہو تو اس کو بدلے میں ہدیہ دینے والے کو دے دینا چاہیے اور اگر کچھ نہ ہو تو (بطور شکریہ) دینے والے کی تعریف کرنی چاہیے کیونکہ جس نے تعریف کی اس نے شکریہ ادا کر دیا اور جس نے (تعریف نہیں کی بلکہ احسان کے معاملے کو) چھپایا اس نے ناشکری کی۔“ (ابوداؤد)

ارک جہاں سے جو قریب تھے

رومی ایک جھکے سے اٹھل کے سینے سے آگئی، وہ پینے سے شرابور تھی، وہ ڈور سے خوف سے نرمی طرح کانپ رہی تھی۔

”رومی! کیا ہوا، ہوش میں آؤ، میں ہوں اٹھل!“ اس نے سہل کو آن رکھا تھا۔

”چلو باہر آؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ تھا، پتھرت سے باہر لایا، پیچھے پیچھے ایزل بھی میاؤں میاؤں کرتی باہر آگئی تھی۔

”اٹھل! میں ایزل کو لینے یہاں آئی تھی اس کو یہاں کسی نے ٹھیل کے ساتھ باندھ دیا تھا، میں جو بھی ایزل کی جانب بڑھی کہ اسے کھول دوں باہر سے دروازہ بند ہو گیا اور میں اندر لاک ہو گئی، میں نے اتنی آوازیں دیں، اتنی دیر میں نہ جھنجھی رہی، آخر کار میں تھک کر بیٹھ گئی، نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ تم مجھے آج ڈھونڈو گے۔“ وہ اٹھل کا مضبوط ہاتھ تھا، کھڑی پول رہی تھی۔

”اٹھل!“ وہ بے ساختہ پھر رو پڑی تھی۔

”میں دوپہر دو بجے کی یہاں لاک ہوں۔“

”یہ دروازہ خود بخود کیسے لاک ہو گیا، شکر کرو کہ وہ تو مجھے بڑے صاحب نے بتا دیا کہ تم اس طرف ایزل کو لینے آئیں نہیں۔“

”مجھے خود نہیں معلوم مجھے مادی نے کہا تھا کہ پتھرت میں ایزل شاید پھنس گئی ہے۔“

”کیا... نام نے تمہیں بتایا تھا کہ ایزل یہاں ہے؟“ تو اس نے آتسو پوچھ کر سر کو اثبات میں ہلایا تھا۔

”ایزل صبح سے بھوکی پیاسی صبح ہے ہمارے ساتھ قید تھی۔“ وہ بڑی شرمندہ سی اپنا دوپٹہ سنہالتی ہوئی آگے بڑھی، اٹھل بھی اس کے ساتھ تھا، وہ زینہ چڑھتا ہوا اوپر جا رہا تھا ان سے پہلے ایزل اچھلتی کودتی ہوئی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی اوپر پہنچ گئی تھی۔ جو بھی رومی پسینہ پوچھتی ہوئی اپنے بیڈروم میں آئی اٹھل نے جلدی سے فریج کھول کر گلاس میں جوس ڈال کر اس کی طرف بڑھایا تھا، وہ پریشان سی جھجکی اپنے ماتھے کو پونچھ رہی تھی، اس نے سب لیتے ہوئے ایک نظر اٹھل کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں بھی اسی کی جانب گئیں۔

”سوری رومی!“

”کس بات کی؟ تم مجھ سے ناراض ہوا بھی تک؟“

”نہیں اٹھل! میں کیوں تم سے ناراض ہونے لگی، ناراض تو اپنوں سے ہوا جاتا ہے۔“ تو وہ اس کی اس بات پر چونک گیا۔

Express
your thoughts
beautifully

”سے بی، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس ڈراپ سین کو بہت جلد ختم کر دوں گا، ڈونٹ وری، یہ بلیوی رومی! کہ میں تمہیں خود سے رخصت کرتے وقت یہ سوچتا ہوں کہ تم کہاں جاؤ گی؟“

”وہ تمہارا ہیڈنگ نہیں ہے، مجھے آپ بتایا لوقہ کے گھر ڈراپ کر دیں، میں سب کہہ دوں گی کہ میں خود آئی ہوں، آپ پر کوئی حرف نہیں آئے گا، میں وادی اور ماموں کو بھی یہ بتا دوں گی کہ وہاں اب میری ضرورت ہے، ویسے بھی اب ارسلان بھائی — کی شادی قریب آگئی ہے۔“

”آئی نو، بہر حال وہاں تمہیں تکلیف ہوگی۔“

”میں تکلیف کی عادی ہوں۔“

”لیکن میں تکلیف کا عادی نہیں ہوں، اس لیے مجھے بار بار یہ خیال آئے گا کہ تم میری وجہ سے ڈسٹرب ہو کر وہاں گئی ہو، رومی! سچ میں سنیر ٹی بی بات کر رہا ہوں۔“

”میں نے کب کچھ کہا؟“ اس نے اپنی کوشیٹ کر بیڈ سے اُتار رکھا۔

”میں پاپ کو کیا جواب دوں گا، پلیز رومی جو ہونا تھا وہ تمہارے ساتھ ہو چکا، اب ہمارے بیچ ایسا کچھ نہیں ہے، فرینکھی میں یہ تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم تھوڑے دن ویٹ کرو، میں یہ معاملہ سولو کروں گا، اور یہ چھوٹی بات نہیں ہے میں مام سے بات کروں گا۔“

”خیں اشل نہیں، تم مامی سے بات نہیں کرو گے۔“

”چلو ٹھیک ہے، میں تمہاری خاطر اس بات کو بھول جاتا ہوں۔“

”لیکن تم ابھی اسی وقت مجھے میرے تایا بابا کے گھر چھوڑ کر آؤ۔“

”تم اس وقت غصے میں جا رہی ہو، اس لیے اسکیوز می!“ اس نے اس کا ہاتھ اپنی طرف گھٹایا اور باہر کی طرف نکل گیا، وہ احتجاج کرتی رہی مگر اس نے اس کی ایک نہی اور ہاتھ پکڑے آگے بڑھتا ہی رہا۔

”اشل! میرے بال۔“

”میں سنو اردوں گا یا!۔“

”بکو اس مت کرو۔“ وہ ہنس پڑی۔

”لوکیاں یہی تو چاہتی ہیں۔“

”جی نہیں۔“ اس نے دروازہ دھڑ سے کھول کر اندر دھکا دیا تھا۔

”شرافت سے بیٹھیں آپ۔“

”میں تمہارا موڈ ابھی ٹھیک کر دوں گا، ہم سائینڈ پر چلتے ہیں، تمہیں پانی بہت پسند ہے نا؟“

”سو داٹ، مجھے پسند ہے؟“

”اس لیے کہ پانی مجھے پسند ہے۔“ اشل اس کی طرف منہ پھیر کر مسکرایا، اس نے گاڑی کی اسپینڈ بڑھادی تھی۔

”دیکھو اشل! ہمارے اور تمہارے درمیان کچھ نہیں ہے، پھر بھی تم اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کر رہے ہو، میں تم سے کوآپرٹ کر رہی ہوں، لیکن دنیا میں ایک ہی چیز ہے جو میں برداشت نہ کر سکی کہ کوئی مجھ پر بولنے سے پہلے ہی۔“

”شک کرنے۔“ اشل بول پڑا۔

”آئی نو یا! یہ ہماری بدھیشی ہے کہ پاپ نے اتنے اچھے دوست کو بیوی کے رشتے میں باغداد دیا، میری بیڈلک۔“

یو نورومی! تم اتنی اچھی لڑکی ہو کہ واقعی اگر حقیقی زندگی میں تم میری بیوی ہو تیں تو میں غصے کی ایک نظر بھی نہیں ڈال سکتا تھا۔“ رومی نے اس کی جانب پلٹ کر دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔

”تو تم یہ پوچھنا چاہتی ہو کہ میں ارج کے ساتھ کیسا رہا ہوں، ویری سیمیل، میں اس سے محبت کرتا ہوں، وہ میری بیوی ہے مگر ہم دونوں جتنی ڈسٹنس پر رہتے ہیں، وہ نرم مزاج نہیں ہے، میں اکثر اس سے الجھ پڑتا ہوں اس کی سنگدلی پر، لیکن یار! مجبوری ہے وہ پھر مجھے متا لیتی ہے اور تم تو جانتی ہو کہ میں کسی سے ایک دن کیا ایک گھنٹے ناراض نہیں رہ سکتا، اب ہنس بھی دوروی!“ وہ مسلسل اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور اشل کی شرارت بھری آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”اشمل پلیز!“ اس نے بہت تیز گاڑی چلائی اور بریک لگائی تو وہ اُچھل پڑی۔

”تم ایک بار بتلا دو کہ تمہاری خواہشات کہاں تک ہیں اور تم کیا چاہتے ہو؟“ اشل نے ہنستے ہوئے اس کے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ کو دیکھا جو ابھی تک مل رہا تھا، اس کے چپ رہنے پر وہ بول پڑا۔

”ایک تو یار! تم اتنا کھلم کھلا مجھے ذلیل کرنی ہو کہ میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔“ وہ ہلکے سے مسکرا کر بولی۔

”جب یہ طے ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صرف ایک دوستی کا رشتہ ہے تو پھر کیوں ناں، تم ایک بار ہی سب کچھ ڈسکس کر لیں۔“ تو اشل اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا تم مجھ سے اتنی جلدی چھٹکا کرنا چاہتی ہو؟“

”ظاہر ہے، میں آپ کو زیادہ دن الجھا ہوا اور پریشان نہیں دیکھ سکتی۔“

”او..... آئی نو تو یہ بات ہے، تو تم اب لوٹنا چاہتی ہو؟“ تو رومی کی براؤن آنکھوں میں ایک سمندر سا اُبل پڑا۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ کوئی میری نیت پر شک کرے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، پھر وہی جملہ۔“

”تھوڑا سا میری خاطر برداشت کرو، میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں، دراصل میں عورتوں کو آج تک نہیں سمجھ سکا۔“ رومی نے بہت غور سے اس کی جانب دیکھا، تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور بولا۔

”کم از کم ان عورتوں کی دوز میں تم شامل نہ ہو۔“ تو رومی کے ہونٹ بھی ہلکے سے مسکرائے۔

”دیکھو ناں یار! نام کیا کیا چکر چلانے لگی ہیں، اب تمہیں کیا خبر کہ آج کل وہ کن چکروں میں ہیں، دوسری طرف ارج نے بھی ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ جلدی واپس آؤ، ہر بار دھمکی دیتی ہے، ورنہ میں خود آ جاؤں گی۔“

”تو یا لو ناں۔“ تو پلٹ کر اشل نے بہت غور سے اس کو دیکھا تھا۔

”تو تم میرا راجا چاہتی ہو، پاپ اسی دن مجھے اپنی زندگی سے بے دخل کر دیں گے۔“

”خیں ایسا نہیں ہوگا تمہارے ساتھ، میں ان کے سامنے آ جاؤں گی، میں نے سہی لوگوں سے سکھ لیا ہے، گیوا اینڈ ٹیک والا معاملہ ہوگا، تم ارج کے رہو گے لیکن اس کے بدلے تمہیں بھی کچھ دینا ہوگا۔“ اشل نے چونک کر بہت غور سے دیکھا تو وہ ہنس کر بولی۔

”میں بھی اس دوز میں شامل ہوگئی ناں۔“

”کچھ کہہ نہیں سکتا تمہارے اس جیلے کو میں ابھی تک سمجھ ہی نہیں سکا۔“

”کسی نہ کسی دن سمجھ جاؤ گے۔“ وہ ابھی تک اشل کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

زندگی کی رفتار، ویرانیاں، رنگوں بھری شام وہ گھر وہ آنگن سب کچھ اُس تھا، حماد چند مقنوں رہ کر جانے کی تیاری

کر رہے تھے، نرم سنہری دھوپ پورے ایئر پورٹ کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی، شام کا پہراُترنے کو تھا، ماہم اماں کا ہاتھ تھا، آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی، حماد گاڑی سے اُتر کر اماں کی باجی کا ہاتھ دیکھ رہے تھے، اماں کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں تھے، البتہ ایک اداسی ضرور تھی، ماہم سامنے کھڑے حماد سے بولنے لگی۔

”بھائی! جلدی جلدی آیا کریں۔“ حماد نے اماں کو دیکھ کر سہلایا تھا، اماں کا سرخ گداز ہاتھ تھا، ہوئے ماہم کی گرفت ان کے بازو پر پخت ہوئی تھی، وہ اداس اس لیے نہیں تھی کہ حماد جا رہے تھے، اداس وہ اپنی ماں کے لیے تھی کہ اس کی ماں اداس ہے، اس کی ماں دیکھی ہے اور حماد بھائی جا رہے ہیں۔

”میں آیا کروں گا ہر سال، تم لوگ اماں کا خیال رکھا کرو۔“ حماد کی سیاہ گہری آنکھیں بوجھل بوجھل جھکی سی تھیں، چہرے پر پڑیں گاؤں منہ پھیر گئی، دکھ کے بادل کہیں دور برس گئے تھے، زندگی کی اس بھٹیڑ میں وہ اماں کا ہاتھ تھا، گھر لوٹ آئی تھی۔ اتنی دیر تک اماں حماد کے خالی کمرے کو دیکھ کر روتی رہی تھیں۔

”جاؤ یہاں سے تم، کیوں پیچھے پیچھے آ رہی ہو؟“ اماں بھی کسی کے سامنے نہیں روتی تھیں، اس وقت بھی وہ اپنا دکھ تنہائیوں میں چھپا رہی تھیں، خاموشیاں گہری ہو گئی تھیں، ایک گہرا سناٹا اور خاموشی تھی، سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ زویہ بھائی اور عماد بھائی اپنے کمرے میں تھے، اماں کے بیڈ روم میں ثروت باجی، ماہم اور انعم بیٹھی تھیں، ماہم کو پھر یوں لگ رہا تھا کہ ہمارے بیچ شانزے کھڑی ہوئی تھی، پھر چپکے سے اُتر کر اماں کے قریب ہو کر بیٹھ گئی تھی، اماں بار بار اپنے نیکے کوچھاڑے جا رہی تھیں۔

”جاؤ جا کر اس کمرے کی گنڈی لگا دو، سب کچھ میں نے اس کے لیے کیا تھا۔“ اماں کے دکھ سے آنسو نکل آئے تھے، ثروت باجی اماں کے کمرے میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھی تھیں، انہوں نے اپنے دونوں پیر اماں کے بیڈ پر رکھے ہوئے تھے۔ ماہم نے دور کھڑے ہوئے ثروت باجی کو اشارے سے کہا تھا کہ۔

”پیر تمہارے گندے ہیں، اپنے جیر ہٹاؤ۔“ اماں بے حد نفاست پسند تھیں، کوئی ان کے بیڈ پر جیر رکھے یہ انہیں پسند نہیں تھا، شاید اسی لیے ثروت باجی نے تھملا کر ماہم کو دیکھا اور جیر ہٹا لیے اور جاتے جاتے آہستہ سے ماہم سے بولی تھیں۔

”اپنے بیروں کی طرف ذرا غور کر لو۔“

”ہاں تو اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اماں کو نہیں پسند کہ کوئی گندے جیر ان کے بیڈ پر رکھے۔“ وہ بہت نفرت بھرے انداز سے دیکھتی ہوئی چلی گئی تھیں، پھر کچھ دیر بیٹھ کر ماہم بھی اپنے گھر چلی گئی۔ اس رات اداسی بال کھولے ماہم کو یوں لگا شانزے کی مرقہ پر رو رہی ہے، اُسے اماں کی بے قرار آنکھوں کے آنسوؤں میں شانزے نظر آتی تھی، پلکوں سے ٹوٹ کر گرنے والے آنسوؤں میں شانزے کی شبیہ بھی، دکھ کے ڈھیر دال آنکھوں سے برس گئے، مگر طویل رات پاگل کتے کی طرح ماہم کو اپنے گھیرے میں لپیٹے رہی، ماہم کے شوہر اس سے بول رہے تھے۔

”تمہاری ماں بہت شریف ہے اور تمہارا بھائی پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بھی بالکل بیوقوف ہے، یقین نہیں آتا اتنا جینس آدمی بے بس نظر آتا ہے، دو جوتے اتار کر لگائے ابھی ٹھیک ہو جائے، عصمت کو ایسی عورت ہے وہ، لیکن تم لوگ ہو کہ کچھ بولتی ہی نہیں ہو، ہمارے ہاں ایسا ہوتا تو اماں جان خود جوتے لگاتیں، بہو بیگم کو، لیکن تمہاری اماں نے تو بڑھ چڑھ کر ان کا سامان رکھوایا، یہ کیا بات ہوئی؟“ لیکن ماہم اپنے میکے کی پرسنل لائف کبھی اپنے شوہر سے ڈسکس نہیں کرتی تھی۔

”میں بھی اس گھر میں انٹر فیر نہیں کرتی اور نہ اماں پسند کرتی ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی، ہماری بہنیں تو بہت کرتی ہیں انٹر فیر۔“ ماہم کے شوہر بولے۔

”اس گھر کی کہانی کچھ اور ہے اور اس گھر کی کہانی کچھ اور ہے، ہم اماں کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتے، اماں کو پسند نہیں آئے گا، سب کچھ تو بتایا تھا اماں کو، مگر اماں میری سنی نہیں تھیں، بتایا تھا کہ کالج میٹ شہناز کہتی ہے کہ تمہارا کوئی مگنہ نہیں کاظمی باؤس لے کر جا رہا ہے، لیکن اماں نے ہمیں دھکی دی کہ وہ حماد کو بتا دیں گی سب کچھ، اماں کو سب کچھ یاد ہے، کہتی ہیں بیٹا ہم کیا جانیں ایسے لوگوں کو، کیسے دھوکے باز اور فراڈیے لوگ تھے۔“ ماہم نے کہہ کر سونے کے لیے کمرٹ بدلی تو کھٹاک سے شیر شاہ کی پہاڑیوں کے اوپر سرخ سورج ڈوب رہا تھا، اور وہیں چمپاک سے شانزے اُتر کر آ رہی تھی، کاظمی کی سفید کرلا کا بارن بخر رہا تھا۔

”ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں شانزے! یہ والدہ لوگ غریب بستیوں میں علم خریدنے جاتے ہیں، خود تو پڑھتے نہیں ہیں سارے جاہل ہیں، چنو، منو، ججو، بھیا کو خرید رہے ہیں اور ہماری اماں ان کے جال میں پھنس چکی ہیں، یہ ایسے نہیں ہیں جیسے نظر آتے ہیں یا را!“ اس نے شانزے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا۔

”تمہیں کیسے پتہ لگا کہ یہ لوگ ایسے نہیں ہیں؟“ شانزے بولی۔

”ان کے چہروں کی طرف میں جب دیکھتی ہوں تو ان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، ان کے چہرے پر ایک خول چڑھا ہوا نظر آتا ہے، چلو چھوڑو، کوئی اور بات کرتے ہیں۔“

”کل مس شان کہہ رہی تھیں ہر لڑکی کو اپنے دفاع کے لیے اپنی شلواری کی پاکٹ میں پستول نہ سہی ایک چاقو تو رکھنا چاہیے، تو غیچہ جعفری ہنس کر بولی، مس! جب تک ہم اپنا عیالاد پر کریں گے چاقو نکالنے کے لیے وہ تو کام کر چکے ہوں گے، پوری کلاس ہنس کر پاگل ہو گئی تھی مس شان کو غصہ آ گیا تھا۔“ شانزے خود ہنس نہ کر پانی کلاس کا قصہ سنارہی تھی۔

”چلو چلو، اماں نیچے سے آواز دے رہی ہیں۔“ شانزے نے اپنے بکھرے ہوئے کانڈسمیٹ لیے تھے، نیند کی گہری وادی میں ماہم شانزے کا ہاتھ پکڑ کر اُتر گئی تھی، کس پہرہ سوئی یا جاگی کچھ پتہ نہ لگا، صبح جب اُٹھی تو رات کا یہ خواب اس کی آنکھوں میں منڈلا رہا تھا۔

”تورات شانزے مجھ سے ملنے آئی تھی، اماں کی وہ چھپت وہ شیر شاہ کی پہاڑیوں پر چمکتا ہوا سورج، سب کچھ تو دیباہی تھا، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔“ وہ بڑی خوش اور مطمئن سی بیٹھی کوئی کپڑا اسی رہی تھی، اماں کی طرح اُسے بھی کپڑے سینے کا جنون تھا۔

☆.....☆.....☆

بڑی وادی کا فون آیا تھا، ارسلان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی، تیاریاں زور دیاں پر تھیں، کلثوم نے جو جمع پونجی ایٹل کے لیے کر رکھی تھی وہ سارہ ٹیلی کی ساری زویا کے لیے نکال کر رکھ دی۔

”دیکھو ایٹل! یہ سیٹ ہے تو تمہارا، تم نے اپنی نوکری کے پیسوں سے بنایا ہے، پر کیا کریں عزت کی بات ہے، ایسے ایسے تو وہ دیسی سیٹ لے کر آئے گی، پتہ ہے ایٹل! زویا کی خالہ دینی سے آ رہی ہے اور ماموں امریکا سے، چچا چچی بھی تو مسعودیہ سے آئیں گے، ان کے ہاں تو سونے کی ریل پیل ہوگی، ایسا کرتے ہیں کہ تمہارا یہ سیٹ ارسلان کی بری میں رکھ دیں گے، جب واپس آئے گا تو میں ایک دو دن کے بعد زویا سے کہہ کر واپس لے لوں گی۔“

”دیکھ لیں اماں! زویا آسان ہے لیٹا ہوا مشکل ہوتا ہے، خواہ مخواہ بد مزگی ہوگی لینے میں۔“

”ارے ایسی تھوڑی ہے زویا، کھاتے پیچے گھرانے سے ہے، ایسے سیٹ تو مجھے اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے نظر

آتے ہیں، تم گھر کی حالت دیکھ لو، اوپر کا پورشن انہوں نے کنٹریشن کر دیا ہے کہ ہم لوگوں کو تکلیف نہ ہو، وہ تو پجاری ایک کمرہ لے گی، بس تمہاری وادی بیچ میں رخنہ بنی ہوئی ہیں، ہر بات میں اور اب تم ان سے ذکر کرنے مت بیٹھ جانا، ورنہ وہ تمہارے باپ کو لے کر بیٹھ جائیں گی کہ میں تو جو کچھ کر رہی ہوں غلط کر رہی ہوں۔“

”اماں! ہمیں دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے، آپ دے دیں بلکہ جیولر تو ہمارا جاننے والا ہے، آپ کہیں تو میں زویا کے لیے دو کڑے کی بات کر لوں؟ قسطوں میں اُتار دوں گی، اماں میری دوست کا بھائی جیولر ہے، بہت بڑی ان کی گولڈ کی شاپ ہے، اکثر ان کی اماں سب کی مدد کرتی ہیں۔“

”پہلے کیوں بتایا مجھے؟ ٹوٹی چھوٹی چیزیں میں انہوں نے پونے دام بیچ کر آئی ہوں، کیا ملا ہے ایک لاکھ ہاتھ میں آیا ہے، سونا دیکھو آسان پر پہنچ رہا ہے، یہ تم نے ٹھنڈی کی کہ سیٹ بنوایا۔“

”اماں! میں نے نہیں یہ تو دادی نے تھوڑا تھوڑا کر کے بنوایا۔“

”اچھا، اچھا بس، ساری تحریفیں دادی کی، اپنے بابا کے سامنے مت لے کر بیٹھ جانا یہ بات، بری میں بھی میں چھپا کر پرس میں لے جاؤں گی اور زویا کی ماں کے ہاتھ میں رکھ دوں گی، ارے بس دکھا دے، انہیں ضرورت تو ہڈی ہے، بس دعا کر دو، تجربے سے دو چار دن وہ گئے ہیں، گزر جائیں گے، ابھی! ہم نے تو صاف کہہ دیا ان سے کہ مہندی کی رسم نہیں ہوگی، کیا کریں پیسے ہی کچھ بیچ جائیں گے، ہاں وہ اپنی طرف خوب دھوم دھام سے کریں، کہہ رہے تھے آج شام تک فرنیچر آ جائے گا، تمہارے ابا دو پہر کے عائب ہیں، اللہ جانے کہاں نکل گئے اور ارسلان کے تو واماں ہی نہیں مل رہے، مجھے تو لگتا ہے روٹی کا بھوت ابھی نہیں اُتر اس کے ذہن سے۔“

”اماں پلیز! ایشل نے اپنا سر پکڑ لیا۔“

”ضروری ہے کہ ہر وقت گھر میں دھنکا فساد ہو، اور ہر بات میں آپ روٹی کو لے کر آئیں۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”آگ لگتی ہے جب تمہیں دھمتی ہوں، سامنے پتہ ہے زویا کی ماں ابھی یہی کہہ رہی تھی کہ آپ لوگوں کو روٹی کے بجائے ایشل کو کیا ہاتھ، کتنی کوشش کی بخاروں نے ارسلان کے ساتھ تمہارا بھی نہیں شتہ ہو جائے، لیکن سب ہماری اسلیت جانتے ہیں کہ دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اب تم دیکھنا جو ہمارے گھر کی شان و شوکت ہو گئی ہے ارسلان کے روم میں زویا کا فرنیچر ہوگا تو تمہارا رشتہ ایک دن میں طے ہوگا۔“ وہ ہر امید سا ہو کر بولیں۔

”اماں! گھر اور فرنیچر دیکھ کر رشتہ طے نہیں ہوتا، رشتہ انسانوں کے درمیان ہوتا ہے۔“

”چپ کر جا ایشل! اللہ اللہ کر کے وہ دن آ گیا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا کہ میرا بھی شاندار گھر ہو، یہ سب کچھ زویا کی وجہ سے ہو رہا ہے، اس کے باپ نے کنٹریشن ہمارے گھر کی فری کر دئی ہے، ایک ایک کمرے میں ماربل اور ٹائل لگے ہیں، واش روم تو جا کر دیکھو، کیا جگہ گارہا ہے۔“ وہ بڑے پر جوش انداز میں بول کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”میں کب کہہ رہی ہوں اس دوڑ میں مجھے شامل کر رہے ہو؟“

”شیور، تم بہت جھنکس ہو، مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے ایک اچھا دوست کھو دیا۔“

”میں کوئی زیادہ تمہارا امتحان نہیں لوں گی۔“

”میں تمہارے امتحان میں پورا اُتر دوں گا، بس اس وقت تم باہر آؤ۔“ جونہی وہ دو قدم اُتر کر باہر چلا تھا، تبھی اس کے آئی پیڈ پر بیچ کلک ہوا۔

”او، ارج! از آں لائن۔“ اس نے آسان کی طرف دیکھا، وہ سیاہ بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔

”روٹی! اون منٹ۔“ کہتے ہوئے ایشل بولا۔

”ہیلو، ہیلو ارج!“ ایشل کھٹکھٹا کر منٹ پڑا تھا۔

”تمہیں خبر ہو گئی کہ میں اس وقت باہر نکلا ہوا ہوں؟“

”اویار! میں بہت خوبصورت جگہ پر ہوں، جہاں سمندر ہے، ریسٹورنٹ ہے، ہمارے ملک کی خوبصورت ہوائیں ہیں، اور ساتھ میں ایک خوبصورت دوست۔“ وہ روٹی کی طرف دیکھ کر منٹ پڑا، روٹی وہ قدم ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”یو شٹ اپ، مجھے اس طرح کے جوک اچھے نہیں لگتے، وہ تمہاری دوست نہیں ہے، میں تمہاری وائف ہوں، بیچ بیچتاؤ ایشل! تم اس وقت اس کے ساتھ کیا روٹینس کرنے آئے تھے؟“

”کہانا یا ر! وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔“

”یعنی بہت اچھی لڑکی ہے؟“

”میں یہ کب کہہ رہا ہوں ارج! تم بس ہر بات کو پکڑ لیتی ہو، الجھا کر رکھ دیتی ہو۔“

”اچھا، تو اب میں تمہیں الجھا کر رکھ دیتی ہوں، سارے میز زمیں نے تمہیں سکھائے ہیں، تم تو سوسائٹی میں موو کرنا بھی نہیں جانتے تھے، پاکستانی سوسائٹی کے چیپ لڑکے۔“ وہ ہتھبہ لگا کر منٹ پڑا۔

”یار! آہستہ روٹی سب سن رہی ہے۔“

”سوواٹ؟ وہ سن رہی ہے۔“ وہ پھر کھٹکھٹا کر منٹ پڑا۔

”اس سے کہو کہ وہ تم سے دو میل دور چلی جائے۔“

”میں کیسے کہوں؟“

”تو میری بات کر آؤ، میں کہہ دیتی ہوں، وہ ہمارے درمیان کیا کر رہی ہے اس وقت؟“

”اس وقت یار! وہ کنگر اٹھا اٹھا کر سمندر میں پھینک رہی ہے۔“

”تو... شی از دیری ویری ایشل! جنٹ۔“

”او، ہوشی از دیری ویری ایشل! جنٹ۔“

”ٹو ڈاؤٹ۔“

”شاید اسی لیے وہ اتنی جلدی سے فریج سے لے گئی۔“

”ہاں، تو ہم نے فریج کیا تو وہ ہو گئی۔“

”بس ایشل! میں نہیں زیادہ دن برداشت کر سکتی اس کھیل کو، اس کو کھڑے کھڑے ڈائیو رس دو، اور واپس آؤ، پھوپھو جانی جو کہہ رہی ہیں اس پر عمل کرؤ۔“ ارج کے لہجے میں خند سی تھی۔

”یار! تم کیسی باتیں کرتی ہو، پہلے میں نے اس بے چاری کو دھوکا دیا، اب میں اُسے آدھے راستے میں چھوڑ کر امریکہ آ جاؤں؟“ وہ کچھ پشیمانی و جیرانی سے بولا۔

”ہم اُسے اتنا دے دیا دیں گے کہ اسے دکھ نہیں ہوگا، وہ خوشی خوشی تم سے ڈائیو رس لے لے گی۔“ ارج کے لہجے میں ایک گھمنڈ سا تھا۔

”لیکن ارج! یہ بات یاد رکھنا کہ وہ خود مجھ سے ڈائیو رس لے گی تو میں دوں گا، میرا دوست فاخر کہتا ہے کہ ایسا مت کرنا روٹی کے ساتھ، لیکن پھر بھی وہ کوآپر بیٹھ لڑکی ہے، مجھے صرف اپنے باپ کا ڈر ہے، تم انہیں نہیں جانتیں، اگر

انہوں نے سب کچھ ہم سے لے لیا تو ہم بیدل ہو جائیں گے، میرا امریکہ کا کاؤنٹ انہوں نے بند کر دیا، تم دیکھو کتنی مشکلات آ رہی ہیں۔“

”تمہارا باپ بڑھا کھڑوس ہے۔“ وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔

”باپ کو ایک لفظ بھی مت کہنا۔“ وہ کچھ غصے سے بولا۔

”کیوں، برا لگ گیا؟ پچھو جانی تو خود انہیں بڑھا کھڑوس کہتی ہیں، تمہیں بہت برا لگ رہا ہے۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”وہ ان کی وائف ہیں۔“ اس نے اسے باور کرایا۔

”تو میں تو تمہاری زندگی ہوں، سوچ لو تم، جان مجھ سے ملنا چاہ رہا ہے، کرلوں اس کے ساتھ ایک ڈیٹ؟“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”جان سے بارودوں کا تمہیں اور جان کو، آ کر قتل کر دوں گا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”اوہو، اتنا خلیس ہو رہے ہو، کیوں تم ہر وقت رومی کے ساتھ ساتھ نہیں گھوم رہے ہو، میں ایک ایک پل کی خبر رکھ رہی ہوں، زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کرنا اس سے، اب تو سنا ہے تمہارے خیالات بھی بدلنے لگے ہیں۔“ وہ مسلسل اسے زچ کیے جا رہی تھی۔

”کیا کہا، کیا کیا تم نے؟“ اب کے وہ چونک کر بولا۔

”جو تم نے سنا، تمہیں وہ بہت اونٹ لگتی ہے، دو ٹکے لڑکی، جس نے خود کوچ دیا، تمہارے ساتھ راتیں گزار رہی ہے، یہ جانتے ہوئے کہ تم میرے ہو۔“ اب اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ و تغر دونوں تھا۔

”ارج! بس، بس اس ٹاپک پر دوبارہ بات مت کرنا، میں اس کے بیڈ پر کبھی نہیں سویا، وہ مجھے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھتی، آئی سویئر، میں گلٹ مل کرتا ہوں کہ ایسی لڑکی کو مام نے دھوکا دیا۔“ وہ رومی کا سوچ کر شرمندہ سا ہو کر بولا۔

”نان نینس، اس کو دھوکا نہیں کہتے، اس کو سودا کہتے ہیں، اس کو اس چیز کا بھاری معاوضہ ملے گا، وہ زندگی بھر عیش کرے گی۔“

”ارج! میں نے کہا ناں مجھے برا لگتا ہے، جب تم اس کے لیے بیلینکو تیج نو ز کرتی ہو۔“ وہ اپنے ہی جذبوں سے الجھ کر بولا۔

”اچھا، اچھا، ذرا مجھے بھی تو اس کا جلوہ کراؤ، وہ جل پری اس وقت کیا کر رہی ہے، پانی میں ہے یا پتھروں سے کھیل رہی ہے؟“ وہ کچھ حسد سے اور کچھ تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

”وہ تمہاری طرح نہیں ہے، وہ اس وقت بہت دور نکل گئی ہے، اور کسی بچے کو گود میں اٹھائے کھڑی ہے۔“ تبھی اسے کچھ لوگ دوڑتے ہوئے رومی کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

”سوری ارج!“ وہ بہت تیزی سے رومی کی طرف دوڑا، جب وہ گھبرا ہوا قریب پہنچا تو ایک کپل بار بار رومی کا ہاتھ پکڑ کر تھینک پکڑ رہا تھا۔

”آپ نے ہمارے بچے کی جان بچائی۔“ سمندر میں طغیانی آئی ہوئی تھی، آگے جانا منع تھا، پھر بھی وہ آدمی اپنے بیوی اور بچے کو چھوڑ کر گھرے سمندر میں گیا تھا، جونہی پانی کی لہر گزری تو اس آدمی نے سر اٹھا کر اپنی بیوی کو کہا تھا۔

”پکڑو، پکڑو، چھوڑنا مت۔“ مگر اس کی بیوی نے غلطی سے بے اختیاری میں بچے کو چھوڑ دیا تھا، لہر نے اس بچے کو

اٹھا کر پتھروں کی جانب پھینکا تو رومی نے اپنے دونوں ہاتھ پھینکا کر بچے کو پکڑ لیا تھا، لہر نے پورا رومی کو پتھروں پر گر دیا تھا، وہ جگہ جگہ سے زخمی ہو گئی تھی، مگر اس نے 3 سالہ بچے کو اپنے سینے سے بچھڑا رکھا تھا، شمل جب بھاگ کر وہاں پہنچا تھا تو وہ لوگ اس کے زخموں کو دیکھ رہے تھے اور وہ ہنس کر کہہ رہی تھی۔

”اٹس اوکے، ایسا ہوتا ہے، اس میں ماں کا قصور نہیں، اس موسم میں اتنے گہرے سمندر میں آپ گئے کیوں؟“

”میں نے تو کہا تھا اس کو پکڑو۔“ وہ آدمی اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں بھی تھی کہ آپ کہہ رہے ہیں اس کو چھوڑ دو۔“ بچے کی ماں بولی۔

”اگر یہ بچے کو نہ پکڑیں تو لہر نے ہمارے بچے کو پتھروں پر پھینک دیا ہوتا، کل ہی ایک ایسا حادثہ ساحل سمندر پر ہوا ہے، بچہ آن اسپاٹ سر پر چوٹ لگنے سے مر گیا تھا۔“ بچے کا باپ بولا، تو رومی پلٹ کر بولی۔

”اس کے باوجود آپ اس بچے کو چھوڑ کر گئے؟“ رومی نے کچھ برہمی سے پوچھا۔

”خیر چلیں، آپ کا بے حد شکر ہے، آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں، آپ کو جگہ جگہ چومیں لگیں مگر آپ نے میرے بچے کو چھوڑا نہیں، اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔“ ماں بچے کو گود میں لے کر آنسو پونچھ رہی تھی، بچے کو گود میں لیے لیے اس عورت نے پھر ایک بار رومی کے ہچکے ہوئے جسم کو خود سے لپٹا کر پیار کیا تھا۔

”میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی، آپ نے ہمیں ایک بڑے حادثے سے بچالیا۔“ پھر شمل کی طرف دیکھ کر بولی۔

”بہت خوبصورت کپل ہے، لیکن آپ کی وائف بہت خوبصورت، نازک اور حساس لگتی ہیں۔“ وہ عورت ان دونوں کو دیکھ کر بولی۔

”شیوور، اب ہم چلتے ہیں۔“ شمل نے رومی کا بازو تھام لیا تھا، اسی دوران ارج بار بار شمل سے کانٹیکٹ کر رہی تھی۔

”ارج! اس وقت میرا نکل موڈ نہیں ہے بات کرنے کا، میں گھر جا رہا ہوں، رومی کو بہت چومیں آئی ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا اور آگے کی طرف بڑھنے لگا۔

”میری بد دعا لگی ہے اس چیل کو۔“ ارج کی آواز رومی نے سن لی تھی تو شمل نے گھبرا کر موبائل آف کر دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں شمل! کسی بھی بیوی کا یہی ری ایکشن ہوگا جو ارج کا ہے، تم شرمندہ مت ہو۔“ لیکن پھر بھی وہ جھینپا جھینپا سا ڈرائیو کر رہا تھا۔

”ارے یہاں کہاں؟“ گاڑی رکتے کے ساتھ ہی وہ بولی تھی۔

”کیوں یہ چومیں تمہیں نظر نہیں آرہیں؟“ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

”یہ بہت معمولی چومیں ہیں۔“ نجائے اس کی آواز میں کون سا دکھ، کون سی کہانیاں چھپی تھیں کہ شمل نے اپنا رخ باہر کی طرف پھیر لیا اور وہ خود بھی اس وقت خاموش بیٹھی رہ گئی کہ جیسے ہوئے عہد زبان پر کیے آ گئے۔

”اب وہ ہمارے بارے میں کیا سوچے گا؟“ جب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترے تو ہنس کر بولا۔

”میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں سوچ رہا اور نہ ہی کچھ جانتا جانتا ہوں رومی!“ وہ کچھ دگر رفتہ سا بولا۔

”لیکن تم جان تو گئے۔“ وہ اندر دگی سے نظریں جھکا گئی۔ بڑے سے بلیک آئینل کو وہ تھامے ہوئے بظاہر شمل کے ساتھ چل رہی تھی، لیکن ذہن کی اسکرین پر ایک خالی فلم سی چل رہی تھی۔

”کاش! ایسا نہ ہوتا، یہ ہماری فیلنگ ہے بے خبر ہوتا۔“ جب وہ کلیٹک سے باہر آئے تو اس وقت بھی وہ رومی کا

باتھ تھاے ہوئے لفٹ سے باہر آیا تھا۔

”آپ کیوں اتنی حفاظت سے میرے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں؟ کیا میں شے کی گڑیا ہوں جو ٹوٹ جاؤں گی؟“ وہ مسکرایا۔

”گڑیا تو نہیں، بریو بہت زیادہ ہو، اور میں بہت بزدل اور کمزور ہوں۔“ رومی کے دل میں ایک گہرا اسناٹا اتر تھا، وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی رخ پھیرنا چاہ رہی تھی۔

”پتہ ہے رومی! میں بھی بہت بہادر ہوں، ایک بار میری کلاس کا بچہ پانی میں ڈوب رہا تھا۔۔۔“

”سمندر میں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”سنو تو یار! تسلسل ٹوٹ گیا، دیکھو دیکھو غور سے سنو، میری کلاس کا بچہ ڈوب رہا تھا پانی میں، میں نے جمپ ماری

اور اس کو بچا کر باہر لے آیا۔“

”اشمل! تم اشمل! یو آر گرینٹ!“

”سب نے بہت شاماشی دی، ٹیچر نے پوچھا کہ تم نے اپنے دوست کو بچا لیا تو میں بولا۔“

”جی سر! کیوں نہ بچاتا، اس کی جیب میں میرا روپیہ تھا۔“ وہ پرانا قصہ یاد کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”اشمل۔۔۔!“ رومی بہت زور سے جیٹی تھی، پھر ہنسنے لگی۔

”اتنی غور سے مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ گاڑی کے قریب جاتے ہوئے بولی تھی۔

”تم اس وقت بہت خوبصورت لگ رہی ہو، خاص طور پر ہنسنے ہوئے۔“

”مجھے اپنی تعریف اچھی نہیں لگتی۔“ اس کے لہجے میں انفرادیگی سی تھی۔

”آئی نو، پھر بھی کبھی بکھار تو چلتا ہے ناں، سچ تو سننا پڑتا ہے ناں، سچ سننے کی عادت ڈالو۔“ وہ اسے سمجھاتے

ہوئے بول رہا تھا۔

”سچ سننے کی بہت پرانی عادت ہے مجھے، آپ فکر نہ کریں۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

”آج کی رات بہت خوبصورت تھی، کیا خیال ہے تمہارا؟“ وہ اس کی جانب مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا، اشمل! تم اس وقت کچھ زیادہ ایموشنل نہیں ہو رہے؟“ وہ چونکی۔

”سوچ رہا ہوں جو کڑی جانوروں سے اتنی محبت کرتی ہو، وہ انسانوں سے کتنی اونچ ہو گی، رومی! سچ سچ بتا دو، جب تم

مجھ سے جلد ہونگی تو کیا برداشت کر لو گی یا نہیں؟ مجھے صرف اس بات کا جواب چاہیے۔“ اس کا لہجہ بے سوچ سمجھا، جیسے وہ

کسی گہری سوچ میں ہو، اور کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا ہو۔

”کیا ضروری ہے جواب دینا؟“ وہ عجیب دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”ویری اپورٹنٹ۔“ اس کے لہجے میں اصرار تھا۔

”چھوڑو، اشمل!“

”میں نے تمہارا ہاتھ تو نہیں پکڑا۔“ وہ شرارت سے ہنسا، گاڑی گھر کے بہت قریب آ چکی تھی۔

☆-----☆-----☆

(جاری ہے)

قمر و شہک

مکمل ناول

دلور کا دل

”دوسو کروڑ...“ انا بیہ شک نہ تھی اور جتنی شک نہ وہ تھی اس سے کہیں زیادہ پریشان فاروق خان تھے۔
”مگر بابا! یہ اتنی بڑی رقم کہاں سے دیں گے ہم؟“

”ہاں بیٹا! رقم تو بڑی ہے اور مہلت بھی ایک ہفتے کی ہے۔“
”تو آپ بینک سے لون لے لیں اور پھر میرے پاس جو گولڈ اور جیولری ہے وہ کس کام آئے گی؟“ اس سے اپنے عزیز از جان بابا کی پریشان حال صورت دیکھی نہیں جاری تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کچھ کر دے۔
”میرا بچہ! تمہارا باپ اتنا بے غیرت نہیں ہے کہ اپنا قرض چکانے کے لیے اپنی بیٹی کا زیور بیچ دے۔“ انہوں نے انا بیہ کے سر پر دست شفقت سے ہاتھ رکھا تھا، مگر ان کی بے بسی انا بیہ سے جھپی نہیں رہ سکی۔
”ایسا کیوں بول رہے ہیں آپ، جو چیز میرے پیارے بابا کے کام نہ آئے وہ میرے لیے بے کار ہے۔“ اس نے ان کا کمرور ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تمام لیا تھا۔
”پھر اس ٹاپک کوئی الحال چھوڑو، اور زیادہ پریشان مت ہو، یہ میرا ہیڈک ہے، میں خود ہی ہینڈل کر لوں گا۔“
”نہیں بابا! یہ آپ کا ہیڈک نہیں ہے، مجھے بہت فکر لگ گئی ہے اور میں آپ کو اپنا سارا زیور لاکر دوں گی، اگر آپ نے نہیں لیے تو میں خود جیولرز کے پاس جا کر سیل کر دوں گی۔“



”ہاں ٹھیک ہوں، تم سناؤ! کیسے فون کیا؟ اور اگر وہ سو کروڑ کے لیے فون کیا ہے تو ابھی تک میں انتظام نہیں کر سکا ہوں، جیسے ہی کچھ ہوتا ہے میں خود تمہیں کال کروں گا۔“

”ارے یار! اتنے فائل کیوں ہو رہے ہو؟ اور میں تمہیں کیا انتظام لگتا ہوں؟“ اتنا بدلہ بدلہ انداز، یقیناً کوئی بات تھی، ورنہ سرد اصفہانی کالاچی روپ تو وہ دیکھ ہی چکے تھے۔

”مطلب کی بات کرو۔“

”مطلب کچھ خاص نہیں ہے، ہاں اگر تم چاہو تو دوسروں کو مدد کرنا کیے جاسکتے ہیں۔“ بہت پراسرار انداز تھا۔

”تم پہیلیاں کیوں بھجوا رہے ہو، جو کہنا ہے کل کر کہو۔“ وہ چڑ گئے تھے۔

”دیکھو فاروق! میں اپنے دوسروں کو مدد کر سکتا ہوں، اگر تم اپنی بی بی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔“

”سرد....! بے غیرت، بیچ انسان! تمہیں یہ بات سوچتے ہوئے بھی شرم نہیں آتی؟“ وہ غصے میں بری طرح دھاڑے تھے۔

”شرم کسی یار! ہاں اگر تم میری دو بیویوں کے بارے میں سوچ رہے ہو تو بے فکر رہو، انابیہ ان دونوں کے ساتھ نہیں رہے گی، اس کو تو میں الگ الگ بنا کے دوں گا، جس میں وہ رانی بن کر راج کرے گی، بالکل شہزادیوں جیسی آن بان ہوگی اس کی۔“

”بکواس بند کرو اپنی سرد اصفہانی! ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“ وہ غم و غصے کی شدت سے تقریباً ہاگل ہی ہونے لگے تھے، بس نہیں چل رہا تھا کہ سرد اصفہانی سامنے ہو، اس کے سینے میں اتنی گولیاں ماریں کہ وہ جو پھٹتی چھٹتی ہو جائے، ریشہ ریشہ پھڑک جائے۔

”اتنی ہمت ہے تم میں؟ خیر تو بعد کی بات ہے، میں نے بھی سوچ لیا کہ تمہیں میں نے بہت مہلت دے دی ہے، مگر اب نہیں، ٹھیک آدھے گھنٹے کے اندر اندر میرے آدی آر ہے ہیں انابیہ کو لینے، جب دوسو کروڑ دے دو تو اپنی بی بی کو لے جانا۔“ سرد اصفہانی کا انداز بالکل چیخ ہو چکا تھا، فاروق خان کے دل میں بہت زور کا درد اٹھا تھا، وہ بہت زور سے چیخے تھے۔

”سرکار! کوئی سید ابہتاج عالم آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ اس دوران ملازم اندر داخل ہوا تھا، مگر اندر کے منظر نے اس کے ہوش دھواں کر دیئے تھے، وہ اُلٹے قدموں واپس بھاگا تھا۔

☆.....☆.....☆

اُسے ہوش آ گیا تھا، دھیرے دھیرے وہ خوفزدہ ہونے لگی تھیں، اس کا وجود کسی نرم و گرم شے پر جیسے بے جان تھا، ذہن کی اسکرین اس وقت بالکل سیاہ تھی، آنکھوں سے ہر منظر مٹ چکا تھا، اُسے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کے بے ہوش ہونے سے پہلے کیا کیا ہوا تھا، دھندلا دھندلا سا صرف یہ یاد آ رہا تھا کہ وہ بیڈ پر نیم دراز کوئی ناول پڑھ رہی تھی کہ دو افراد اس کے بیڈروم میں بغیر ناک کیے اندر ہوئے، دونوں ہی بہت جلدی میں تھے۔ ایک نے جلدی سے اس کے کچھ بھی کرنے سے پہلے ہی کوئی شے اس کی ناک پر رکھ دی، جس سے روم کی ہر شے گھومتی ہوئی اپنا اثر کھوٹی چلی گئی، آنکھوں میں مکمل اندیرا چھا چلا گیا، اس کے بعد کیا ہوا، وہ کہاں تھی، کچھ نہیں جانتی تھی، مگر ایک بات اُسے یاد رہی تھی کہ اس کی نیم بے ہوشی میں اس کا نکاح ضرور پڑھوایا گیا تھا، بس یہاں تک اُسے یاد تھا، پھر اس سے آگے ایک سوالیہ نشان اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اپنے کھوتے سرو کو تھامے وہ آٹھنی سے آٹھنی، اس بے ہوش کر دینے والی دوا کا نشہ ابھی بھی اس کی نس میں گردش کر رہا تھا، بلیک کرائون سے ٹیک لگائے تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں موند گئی۔

تھی، سیاہ جھینری چٹکوں کو بمشکل اوپر اٹھایا، ان ہرئی آنکھوں میں اس قدر حیرت تھی، وہ کہہ رہا تھا کوئی محل؟ کیا تعریف کرتی وہ اس روم کی، اس قدر حسین، اتنا بڑا روم، اور روم میں موجود ہر شے اپنی مثال آپ تھی، ایک ایک چیز عمدہ و انبلی، اس کا اندازہ وہ یوں لگا سکتی تھی کہ جیسا حسین و مزینا بنگلہ ان لوگوں کا تھا اس کمرے کے مقابلے میں شاید وہ کچھ نہ ہو، مگر کسی کے ذوق کی وہ قائل ضرور ہو گئی تھی، یہ بیڈروم جس کا بھی تھا یقیناً اس کی پسند بہت زبردست تھی۔

”وہ کہاں ہے، یہاں کون لایا ہے اُسے، اور سب سے بڑھ کر اس کے بابا....!“ اپنے سرو کو تھامے وہ آٹھنی تھی۔

”بابا کہاں ہیں، مجھے کچھ یاد کیوں نہیں آ رہا، اُف اللہ....!“ پھر سے بری طرح پتھر آ پتھا، اور زیادہ دیر وہ بیٹھ نہیں سکی، تو پھر سے سر تکیے پر گر آیا، آنکھوں کے گرم سیال بہتے بہتے تکیے پر جذب ہونے لگے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پورے جسم میں درد ہو رہا ہے، ایک ایک جوڑ دکھ رہا ہے، شاید اُسے بخار ہو رہا تھا، جلن کے مارے آنکھیں تک کھولی نہیں جاری تھیں، سفید لٹھے کا شلوار گرتا اس پر بھاری براؤن شال ڈالنے پر قہرے سے بال بنائے، مضبوط جسم کا مالک، لمبے چوڑے سے سید ابہتاج عالم کی شخصیت دیکھنے والوں کو آپ ہی مودب کر دیتی تھی، سرخ و سفید رنگت کا مالک سید ابہتاج عالم جس کے چہرے پر زمانے بھر کی بنجیدگی تھی، عنابی گداز لبوں کے جوڑے کے اوپر کھنسی سیاہ موٹھیں بہت ڈشنگ لگتی تھیں، وہ اس وقت T.v ٹی وی میں بیٹھا T.v پر کوئی نیوز دیکھنے کے ساتھ ساتھ بلیک کافی بھی پی رہا تھا۔

”ابہتاج بڑا! تجھے کتنی بار منع کیا ہے کہ یہ کالا پانی مت پیا کر، مٹا خواں جلائی ہے۔“ بی جان اپنے بیڈروم سے نکل کر آئیں تو رات کے 9 بجے سید ابہتاج عالم کو یوں کافی پیتا دیکھا تو کہے بنا نہ رہ سکیں۔

”ارے بی جان! آپ.....“ اس نے کافی کا کپ میز پر رکھا، جلدی سے کھڑا ہوا، اور انہیں تھامے صوفے تک لایا اور آہستگی سے بٹھادیا، وہ اپنی بی جان سے بہت محبت کرتا تھا، اپنی جان سے بھی زیادہ، ان کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی، مگر یہ بلیک کافی والی عادت چھوڑ کے بھی چھوڑ نہیں پایا تھا، ہمیشہ رات کو ان کے سو جانے کے بعد ہی پیتا تھا، مگر آج بی جان کی اچانک آمد نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔

”میرے چاند! اتنا دماغ کھاتے ہو، گاؤں کی ہزاروں مالیت کی زمینیں دیکھنا، پھر یہاں کراچی میں آفس دیکھنا، آئے دن پاکستان سے باہر جاتے ہو کام کے سلسلے میں، پھر جب تم یہ کالا پانی پیتے ہو تو اپنے ساتھ ساتھ میرا بھی خون جلا کر رکھ دیتے ہو۔“ لفظ ”کالا پانی“ پر سید ابہتاج عالم ہولے سے ہنس دیا تھا۔

”ارے بی جان! یہ خون نہیں جلائی بلکہ میں تو انابیہ پیتی ہے۔“

”مجھ سے باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے، تم تو کمزور نہیں ہو، تمہارے لیے ملائی والا گرم دودھ لے کر آتی ہوں۔“ وہ اُٹھنے لگیں تو سید ابہتاج عالم نے انہیں روک دیا۔

”بی جان! آپ پریشان مت ہوں، اچھا نہیں پیتا یہ کالا پانی۔“ وہ مسکرا کے ان کے برابر میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ کوئی کہہ سکتا تھا۔ اتنا بنجیدہ و سوبرم گوسا سید ابہتاج عالم یوں لاڈ اٹھوا سکتا ہے، اس کی شخصیت ہی ایسی تھی جو کوئی دیکھتا تو وہ بیبی اخذ کرتا کہ سید ابہتاج عالم کو کئی سخت گیر، مغرور قسم کا بندہ ہے۔

”ہاں اتنا ہی تو تو میرا فرما کر دار ہے۔“

”یہ کیا بات کی آپ نے، اچھا پوچھیے بلکہ حکم کیجئے کیا کرنا ہے؟“

”مانو گے میری بات؟“ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”کبھی آپ کی بات مانی ہے؟“

”تو پھر ٹھیک ہے، شادی کر لو۔“

”بی جان! پھر وہی ضد؟“

”پورے 38 سال کے ہو گئے ہو، تیری عمر کے لڑکے تو 3، 4، بچوں کے باوا ہو گئے ہیں۔“ بی جان نے آج لگتا تھا کہ ٹھکان لی تھی، سید ابہتاج عالم سے ہاں کرا کر رہیں گی۔

”بی جان! آپ بھی نا۔“ وہ بڑی طرح جھینپ کر رہ گیا۔
”کیا بی جان! نس مجھے نہیں معلوم، میں اب تیرے لیے لڑکی دیکھنے لگی ہوں، کچھ بھی ہو، اب تیری ایک نہیں سنوں گی۔“

”ارے میری پیاری بی جان! صبر، تھوڑا اور صبر، اچھا ٹھیک ہے، مجھے کچھ اور مہینے کی مہلت دیں، پھر آپ جیسا چاہیں گی ویسا ہی ہوگا۔“

”چاہے اس دوران میری آنکھ ہی کیوں نہ بند ہو جائے ہمیشہ کے لیے؟“ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”اللہ نہ کرے بی جان!“ سید ابہتاج عالم نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں نرمی سے تھام لیے۔

”آج کے بعد ایسا مت بولیں گے گا، آپ کو تو میری عمر بھی لگ جائے۔“

”مجھے تیری عمر نہیں چاہیے، تیرے بچے چاہئیں وہ بھی دس، بارہ۔“

”خدا کا خوف کریں، اتنے سارے....؟“ اس کی تو آنکھیں جی پھیل گئیں۔

”ہاں تو اتنا بڑا محل جس کے تو مجھے ابھی تک یہی پتا نہیں چلا کہ کتنے کمرے ہیں اس میں، وہ سب خالی پڑے ہیں،

مجھے اس محل کی خاموشی میں تیرے بچوں کی ہنسی، قلقاریاں، ان کی شرارتیں دیکھنی ہیں، بس یہی میری آخری خواہش ہے۔“

”آف..... پھر الٹی بات، اوکے آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی، مگر تھوڑا سا اور وقت۔“ اس نے لاڈ سے کہتے ہوئے ان کے کمرہ درشانے پر اپنا سر دھر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، ایک مہینہ، اس کے بعد میری چلے گی۔“

”ایک مہینہ بی جان! ایک مہینہ تو بہت کم ہے۔“

”بس اس سے آگے ایک لفظ نہیں، ورنہ میں پھر گاؤں جا رہی ہوں، حوٹلی میں واپس۔“ انہوں نے سختی سے ڈانٹتے ہوئے دھمکی دی، جو کارآمد ثابت ہوئی، وہ پھر آگے سے کچھ بول ہی نہیں سکا۔

☆.....☆.....☆

”آخر کہاں جا سکتا ہے فاروق اور اس کی بیٹی؟“ سرد اصغہانی جلے پیر کی لمبی طرح ٹہل رہا تھا۔

”سر! جب ہم وہاں پہنچے تو پورا بنگلہ خالی تھا، انسان تو کیا ایک چیز یا کچھ بھی وہاں نہیں تھا۔“ مسلح گارڈ سر جھکائے بول رہا تھا۔

”ایسا کیا ہو سکتا ہے، آدھا گھنٹہ پہلے میری بات ہوئی تھی، کراچی شہر کا کوئی ایسا کونہ، کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں تم لوگوں نے نہیں دیکھا، پھر آخروہ کہاں جا سکتے ہیں؟“ سرد اصغہانی بہت غصے میں تھا، بازی پلٹ گئی تھی، بلبل اس کے ہاتھوں سے اڑ گئی تھی، اُسے فاروق خان کے غائب ہونے کا کوئی افسوس نہیں تھا، انا بیہ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی، یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

”سر! میں نے سنا ہے سید ابہتاج عالم آگئے ہیں اس شہر میں۔“

”سید ابہتاج عالم....!“ وہ حیران نظروں سے گارڈ کو دیکھنے لگا۔

”وہ کب آیا یہاں؟“

”شاید آج ہی۔“ وہ دھڑسوج انداز میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا تھا۔

”اگر آج ہی آیا ہے تو پھر فاروق خان اتنی جلدی اُسے کچھ نہیں بتا سکتا، یقیناً وہ انا بیہ کو لے کر کہیں چھپ گیا ہے ڈر ہے۔“

”پھر بھی سر! اگر آپ کہیں تو ہم سید ابہتاج عالم کی عمرانی کر سکتے ہیں۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے، تم جانے نہیں ہو کیا سید ابہتاج عالم کی پادرو؟ اگر اُسے ہم پر ذرا سا بھی شک ہو گیا تو وہ کیا حشر کرے گا ہمارا، یہ تم سوچ کبھی نہیں سکتے۔“

”اور اگر فاروق خان کا ان سے رابطہ ہو گیا تو....؟“

”یہ ناممکن ہے، لیکن مجھے ہر حال میں یہ دونوں چاہئیں، اس سے پہلے کہ سید ابہتاج عالم سے وہ ملیں، دونوں کو کہیں سے بھی ڈھونڈ کر میرے پاس لے آؤ، انا بیہ اب میرے لیے چیلنج بن گئی ہے، پہلے تو میں سوچا تھا کہ اُسے اپنی رکھیل بنائے رکھوں گا، مگر نہیں، اب میں فاروق خان کو سبق سکھاؤں گا، انا بیہ سے نکاح اُسی کی نظروں کے سامنے کروں گا، انا بیہ کو میری بیوی بن کر رہنا پڑے گا۔“ وہ فاروق خان کو نفرت سے سوچتا ہوا گارڈ کو گھورنے لگا۔

”جاؤ اب نامم ضائع مت کرو، جتنی جلدی ممکن ہو، ان دونوں کو ڈھونڈ کر میرے پاس لے کر آؤ۔“ حکم صادر ہوا، گارڈ تیزی سے باہر نکلا تھا۔

☆.....☆.....☆

سید ابہتاج عالم اپنی خواب گاہ میں فل سائز بیڈ پر نیم دراز مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ پڑھ رہا تھا، دروازے پر دھیرے دھیرے دستک دی جا رہی تھی، اس نے بگ اپنے چہرے سے ہٹائی۔

”آ جاؤ۔“ اندر آنے کی اجازت ملی تو اس کا وفادار ملازم اندر داخل ہوا تھا، سر کو جھکائے مؤدب سا سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

”سامیں! نوری آئی ہے، وہ بتا رہی ہے جب سے انہیں ہوش آیا ہے، وہ روئے ہی جا رہی ہیں، کچھ بھی کھا نہیں رہیں، یہاں تک کہ بانی کا ایک کھونٹ بھی حلق سے نیچے نہیں اُتارا، اور انہیں بہت تیز بخار بھی ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے، چلو تم اور وہاں دراز میں میرا فرسٹ ایڈ باکس پڑا ہے، وہ بھی لے کر چلو، میں آتا ہوں۔“

”حکم سامیں!“ وہ سائیڈ ٹیبل کی دراز کی طرف بڑھا، بڑی سی دراز کھولے فل سائز فرسٹ ایڈ باکس نکالا۔ سید

ابہتاج عالم نے بگ سائیڈ میں رکھی، گھرے بھاری شال مضبوط چوڑے کندھوں پر ڈالے وہ دروم سے باہر نکلا، پہلے بی جان کا کمرہ چیک کیا، وہ کھل اوڑھے بے خبر نیند کی وادیوں کے زیر اثر سو رہی تھیں، ان پر پیار بھری ایک نظر ڈالتا وہ اپنے بڑے سے حسین ترین محل کے دوسرے حصے کی جانب بڑھا تھا۔ وہ جیسے ہی اندر دروم میں اتر ہوا، نوری جو بار بار منتیں کر رہی تھی، مگر وہ اس کی ایک نہیں سن رہی تھی، بس روئے جا رہی تھی، نوری نے سید ابہتاج عالم کو دیکھا تو ایک طرف ہو گئی۔

”جاؤ تم۔“ نوری جس نے ہاتھ میں کانچ کا گلاس پکڑ رکھا تھا، وہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی فوراً اس کمرے سے نکلی تھی، دروازہ بند کرنا نہیں بھولی تھی، سید ابہتاج عالم نے بغور اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ بیس سال کی وہ لڑکی حسن کا جیتا جاگتا شاہکار تھی، میدے جیسی رنگت اس پر اس کے خوبصورت سے نقوش، ہر نی جیسی بڑی بڑی آنکھیں، جن میں ایک سمندر

موجود تھا، نازک سا دلکش قیامت خیز سراپا، کسی شاعر کی غزل جیسی وہ نازکی دلربا سی لڑکی، بخار کی شدت سے اس کا نازک جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا اور شاید نہیں یقیناً اس کی کھڑی ستواں ناک بالکل سرخ ہو رہی تھی، اگر وہ سانس

روک لیتی تو کسی ماہر آرٹسٹ کا بنایا گیا وہ مجسمہ لگتی جسے اس آرٹسٹ نے دن رات ایک کر کے بڑی محنت سے بنایا ہو۔ اسے دیکھ کر ایسا ہی لگ رہا تھا کہ اللہ جب بہت فرصت میں ہوگا، جب اس کا مجسمہ تیار کیا ہوگا، تو پھر سرمد اصفہانی جیسا رنگین مزاج، دل پھینک کیوں نا اُسے پانے کی جستجو کرتا، اور ان سب کچھڑوں سے وہ بے چاری معصوم سی لڑکی بالکل انجان تھی، وہ یہاں کیوں ہے اُسے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا، وہ کچھ جانتی ہی نہیں تھی، سرمد اصفہانی کا سوچ کر ہی اس کی رگوں میں لاوا دوڑنے لگا تھا، آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں۔

”نہیں سرمد اصفہانی! میں تمہیں جیتنے نہیں دوں گا، اب تم دیکھو کہ میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں، تم خود سب کچھ نہ اگل دو تو میرا نام بھی سید اجتاج عالم نہیں، فی الحال اس مسئلے پر بعد میں غور کروں گا، پہلے ذرا ان محترمہ سے تو مٹ لیا جائے۔“ وہ مضبوط قدم دبیر کا ریٹ پر دھرتا ہیڈ کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ انابیہ نے کچھ محسوس کر کے ذرا کی ذرا خوفزدہ ہوئی آنکھیں اوپر اٹھا لی تو وہاں کسی اجنبی کو کھڑے دیکھا جو اسی کو بغور دیکھ رہا تھا، انابیہ نے اس روم میں صرف اب تک ایک عورت کو ہی دیکھا تھا، کسی مرد کو نہیں دیکھا تھا، تو پھر یہ کون تھا؟

”جی تو محترمہ! آپ نے کل کیا پوری گائے کھائی تھی، جوکل سے کھانے کے لیے پریشان کر رہی ہیں؟“ کھمبیر لب ولہجے میں کہتا وہ وہاں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ انابیہ آج تک کسی ناخرم کے سامنے نہیں آئی تھی بغیر حجاب کے، تو پھر اترتی بے پردگی، وہ فوراً سے چیتر وہاں اس بیڈ سے دوسری سائیڈ سے اترنے لگی کہ اس کی محرومی نازک کلائی سید اجتاج عالم کی مضبوط قبضہ میں قید ہو کر رہ گئی، انابیہ نے نہایت بے بسی سے اُسے دیکھا تھا اور اپنی محرومی گوری کلائی اس کی مضبوط گرفت سے آزاد کروانے کی مزاحمت کی، جو کہ ناکام ثابت ہوئی۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟“ لب ولہجے میں معمولی سی سختی در آئی۔

”کون ہیں آپ، چھوڑیں میرا ہاتھ، بابا کہاں ہیں میرے؟“ بس روانی سے ان ہر نی آنکھوں سے پانی سہے جا رہا تھا۔

”ان سب کو چھوڑو، پہلے تو مجھے اپنا چیک اپ کرواؤ، پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا چاہیے۔“ سید اجتاج عالم کے ایک ہاتھ میں اس کی کلائی تھی، جسے پھڑکانے کی وہ جی جان سے کوشش کر رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس نے فرسٹ ایڈ باکس کھولا، اس میں سے قمر مایٹر، اسٹیٹو اسکوپ نکالا، مگر وہ چیک کرنے کہاں دے رہی تھی، بُری طرح روتے ہوئے اپنی کلائی کھینچ رہی تھی۔

”جی...“ سید اجتاج عالم نے بُری طرح اُسے ڈانٹا تھا۔

”بالکل چپ، اب ایک آواز بھی نہیں نکلی چاہیے، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“ انابیہ تو بُری طرح ڈر کر رہ گئی،

دل کی دھڑکن سوا ہو گئی، آنکھوں سے آنسو بہنا بند ہو گئے، شکر فی لب آپس میں یوں جڑ گئے جیسے اب کھلیں گے ہی نہیں۔ سید اجتاج عالم نے پوری طرح اس کا چیک اپ کر لیا تو 102 بخار تھا۔ سید اجتاج عالم نے جب اس کے چہرے کی جانب نظر اٹھائی تو اس کی رنگت لٹھے کی طرح سفید ہو گئی تھی، آنکھیں خوف و ہراس سے پٹی ہوئی تھیں، سانس جیسے اگر نہ لیتی تو وہ کہیں مر ہی نہ جائے۔ صحیح معنوں میں گڑبڑانے کی باری اب اس کی تھی۔

”اجتاج! میں نے آج تک اپنی پھولوں جیسی بیٹی کو ہلکا سا ڈانٹا نہیں ہے، بہت نازوں سے پالا ہے میں نے انابیہ کو۔“ سید اجتاج عالم کے کانوں میں فاروق خان کا یہ جملہ پورے زور و شور سے گونجتا تھا۔

”اوہ گاڈ!“ وہ سب کچھ چھوڑ کے آگے بڑھا تھا۔

”انابیہ! انابیہ!“ اس کا سفید پڑتا زخار تپتہ پتہ، مگر دیر ہو گئی تھی، وہ بے ہوش ہو کر اس کی ہانپوں میں جھول گئی

تھی۔ سید اجتاج عالم نے جھک کر اس نازک پیکر کو آہستہ سے ہینڈ پر لٹا دیا اور ایک بار پھر اسٹیٹو اسکوپ سے اس کے دل کی دھڑکنوں کو چیک کرنے لگا جو بہت ست روی سے چل رہی تھیں۔

”انابیہ!“ اس نے انابیہ کے چہرے پر جھک کر نہایت نرمی سے اس کو پکارا تھا۔ سید اجتاج عالم نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور بغور اس کا چہرہ دیکھا، جس کی رنگت اب معمول پر آنے لگی تھی۔

”تو سید اجتاج عالم! اب تم پر یہ وقت بھی آ گیا ہے کہ کسی پری ویش کے ناز و خیرے اٹھاؤ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے خود سے کہتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا اور کھڑا ہو گیا اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا، بی جان نوٹ کر رہی تھیں کہ سید اجتاج عالم کے معمولی زندگی میں کچھ بدلاؤ آ رہا تھا، ان کے فرائض و خدمت میں کوتاہی تو نہیں برت رہا تھا، مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی دوسری ذمہ داری بھی ہے، جسے وہ نبھاتا رہا ہے، اور وہ کیا ہے؟ ایک سوالیہ نشان ان کی بوڑھی آنکھوں کے گرد گھومتا رہتا تھا۔

”اللہ بخش!“

”جی مالکانی! حکم؟“

”یہ اجتاج کہاں ہے؟“

”جی سائیں محل کے دوسرے حصے میں ہیں۔“

”کیوں...؟“

”جی... جی... وہ۔“ لگتا تھا وہ بُرا پھنسا، اب کیا جواب دیتا؟ بی جان کی جہاندیدہ نگاہوں سے اس کا ہلکا سا گھبرانا چھپا نہ رہ سکا۔

”اللہ بخش! میں نے پوچھا تیرا سائیں وہاں کیوں ہے؟ کیا ہو رہا ہے وہاں؟“ وہ سختی سے بولتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

”کچھ... کچھ بھی تو نہیں۔“ آگے کھائی، پیچھے کنواں والا حساب تھا اس کے ساتھ اس وقت۔

”پہلے تو مجھے شک تھا مگر اب یقین ہو گیا ہے، تجھے اس طرح گھبراتے دیکھ کر، کچھ تو ہو رہا ہے محل کے اس حصے میں، مجھے جاننا ہی پڑے گا، دیکھو تو صبح آخر کیا ہو رہا ہے وہاں؟“

”وہ... مالکانی جی! میری بات سنیں۔“ وہ صبح معنوں میں گھبرا کر رہ گیا۔

”ہٹ میرے راستے سے۔“ انہوں نے اُسے بُری طرح جھڑک دیا اور آگے بڑھنے لگیں۔ وہ کچھ بھی نے بغیر محل کے دوسرے حصے کی طرف بڑھیں، یہاں تک کہ اللہ بخش کو اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ وہ جلدی سے فون ہی کر دیتا سید اجتاج عالم کو، بی جان نے بغیر ناک کے دروازے کو دھڑ سے کھولا تو سامنے کے منظر نے ان کی پوری طرح آنکھیں کھول کے رکھیں۔ وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی کم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر حسین تھی کہ دیکھنے والا اس کے حسن کو سراہے بغیر اور اللہ کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ بیڈ پر نگاہیں جھکا کر بیٹھی تھی، بیڈ کے پاس سید اجتاج عالم جس کے ہاتھ میں اورنج جوس تھا، وہ اس کو تھمانے کی کوشش کر رہا تھا۔

بی جان کو جانے کیا ہوا، کیوں ان کے دل کو ناگوار گزرا، ان کا بیٹا بھی کر سکتا ہے؟ جس بیٹے پر بہت مان تھا، جو ان کا خیر، ان کا غرور تھا، کیا وہ ایسا بھی کرے گا؟ نہ دل مان رہا تھا نہ دماغ اس بات کو تسلیم کر رہا تھا، مگر ان آنکھوں کا کیا کرتیں جو سب حقیقت دیکھ رہی تھیں۔ سید اجتاج عالم نے دروازہ اس طرح کھولے جانے پر پیچھے ہٹ کر دیکھا تو

اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”بی جان!“ اس نے گلاس بھیل پر رکھا اور بی جان کی سمت بڑھا تھا۔

”مت کہو مجھے بی جان! اب تاج! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی، تو ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے؟ کیا کی رہ گئی تھی میری تربیت میں، کون سی کوتاہی ہوئی ہے میری پرورش میں؟“ بی جان نے اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ نرمی طرح جھڑکا تھا۔

”بی جان! پلیز، میری بات تو سنئے۔“ وہ تو حواس باختہ ہو کر رہ گیا تھا۔

”نہیں سنوں گی میں تیری کوئی بات، اب یہ نوبت آگئی ہے کہ تو یہ کرنے لگا ہے؟“

”بی جان پلیز! وہ تو تڑپ کر رہ گیا اس الزام پر۔“

”نفس قابو میں نہ رہا تو اب یہ کام کرنے لگا ہے، جیسی میں سوچوں کہ شادی سے کیوں انکاری ہے، بول اور کتنی رکھی ہیں اس محل میں؟ میں بومدی جان، تو نے سوچا ایک کمرے میں پڑی رہوں گی اور تو یہاں عیاشی کرتا پھرے گا، بڑا محل ہے، میں کیا جانو یہاں اور کتنی ہوں گی؟“ وہ نان اسٹاپ بولے چلی جا رہی تھیں، سید ابھتاج عالم کو موقع ہی نہیں دے رہی تھیں، ان کا ایک ایک لفظ اس کی ذات پر تازیا نے کی طرح لگ رہا تھا، اس کے وجود کے پرچے اڑا رہا تھا۔

”بی جان! بس بہت ہو گیا، یہ جوڑ کی آپ دیکھ رہی ہیں، یہ کوئی اور نہیں میری منکوحہ ہے، نکاح کیا ہے میں اس سے۔“ وہ پل بھر کے لیے خاموش رہا۔

”بی جان! آج آپ نے مجھے میری ہی نظروں میں نرمی طرح گرا دیا ہے۔“ دکھ و تاسف سے انہیں دیکھتا وہ پھر نہیں، کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ بی جان تو ہوتی ہی ہو کر رہ گئیں، یہ کیا ہو گیا تھا انہیں، اپنے عزیز از جان بیٹے کا دل کتنی نرمی طرح دکھایا تھا انہوں نے، بالکل بے یقین کر دیا تھا پل بھر میں، اس کے لب و لہجے سے نکلنے تکلیف دہ الفاظ کتنے چوڑے میں بکھرتے ان کے دل کے ہزاروں ٹکڑے کرتے چلے گئے تھے، انہوں نے نظر اٹھا کے بیڈ کی سمت دیکھا جہاں وہ ہوشربا حسن کی ملکہ انہیں ہی ٹکر ٹکر بڑی معصومیت سے دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”صاحب کوئی ابھتاج عالم آئے ہیں۔“ ملازم نے اندر آ کر دیکھا تو وہ چکر اکر رہ گیا، فاروق خان کی رنگت ہلکے کی مانند زرد پڑ گئی تھی، وہ دل پر ہاتھ رکھے بیڈ پر بیٹھتے چلے گئے تھے، وہ اُلٹے قدموں بھاگا تھا اور سینکڑوں میں ابھتاج عالم اندر داخل ہوا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا، فاروق خان کا موبائل اٹھایا اور ریکارڈ کا بٹن آن کر کے

فاروق خان اور سرد اصغہانی کے مابین ساری گفتگو سن لی تھی، غصے سے اس کا پارہ پوری طرح ہائی ہو گیا تھا، مگر یہ وہ جوش کا نہیں، ہوش سے کام لینے کا تھا۔

”اللہ بخش!“

”جی سائیں!“ وہ تو حکم کا غلام تھا، پلک جھپکتے حاضر ہوا تھا۔

”جلدی سے فاروق صاحب کو اٹھاؤ گاڑی میں ڈالو، راجہ یار کو فون کر دو، اُسے بولو میرا پہلی کا پٹر تیار کرے، ہمیں اسلام آباد کے لیے ابھی روانہ ہونا ہے۔“ یہ بولتا ہوا وہ اتالیبیہ کے بیڈ روم میں داخل ہوا، یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کس حالت میں ہوگی، اُسے دس منٹ کے اندر اندر یہاں سے نکلتا تھا، وہ بیڈ پر بغیر دوپٹے کے سو رہی تھی، سید ابھتاج عالم نے بلکے تیزی سے کھینچا اور ایک سائیڈ میں پھینکتے ہوئے اس نازک اندام پیکر کو اپنے مضبوط آہنی بازوؤں میں اٹھالیا۔ اتالیبیہ اجا یک افتاد گئے لیے قطعی طور پر تیار نہ تھی، یہ کیا ہوا، اس کے ساتھ؟ وہ کچھ نہیں جانتی تھی، پٹ سے آنکھیں کھولیں تو

کوٹھی کی بانہوں میں پایا تھا۔

”کون ہو تم، چھوڑو مجھے، کہاں لے جا رہے ہو؟ بابا...! بابا...!“ وہ ہاتھ پیر چلانے کے ساتھ ساتھ چیخ مچی رہی تھی، مگر سید ابھتاج عالم جیسے شخص پر کیا اثر ہو سکتا تھا، اسے لاکر اپنی پیچا رو میں ڈال دیا تھا۔

”کیا کر رہے ہو، کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟ دروازہ کھولو، میں جیتی ہوں دروازہ کھولو، بابا کہاں ہیں آپ؟“

”پہلے اس کو خاموش کرواؤ۔“ اللہ بخش نے رومال میں بے ہوش ہونے والی دوا ڈالی اور وہ رومال اس کی ناک پر رکھا، چند ہی لمحے میں وہ غودگی میں چلی گئی تھی۔ پورے گھر میں بس ایک ملازم ہی تھا، اُسے پیسے دے کر گاؤں بھیج دیا گیا تھا۔

”فاروق صاحب کو راجہ یار دوسری گاڑی میں لے گیا تھا، وہ اس وقت بیلی کا پٹر میں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ اللہ بخش نے کہا۔

”اوکے، جلدی چلو۔“ کچھ ہی گھنٹوں میں وہ سب اسلام آباد میں اسپتال میں موجود تھے۔

”اب کیسی طبیعت ہے فاروق صاحب! آپ کی؟“ سید ابھتاج عالم جھک کر ان سے پوچھنے لگا۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری ابھتاج! میری بیٹی کہاں ہے؟“ نقاہت و کمزوری سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی ان کی۔

”فکرت کریں، وہ صحیح سلامت ہے۔“

”ابھتاج! سرد اصغہانی بہت شاطر اور چالاک نکلا، اس نے دھوکا دیا ہے مجھے۔“

”میں سب کچھ جانتا ہوں، سب کچھ میرے علم میں ہے، سرد اصغہانی کی فطرت سے میں بہت پہلے ہی آگاہ ہو چکا تھا مگر اب جو ہو گیا سو ہو گیا، سرد اصغہانی کو دوسو کروڑ آپ کو دینے پڑیں گے۔“

”ابھتاج! اس کی نظر میری بیٹی پر ہے، مجھے لگتا ہے میرے پاس بہت کم ٹائم ہے، میری تم سے ایک ریکوریٹ ہے، میری بیٹی کو تم اپنے نکاح میں لے لو، کیونکہ مجھے تمہارے علاوہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں ہے، ایک مضبوط سائبان میری بیٹی کے لیے تم سے بہتر اور کوئی نہیں ہوگا۔“

”فاروق صاحب! ابھی ان باتوں کو چھوڑیں آپ۔“

”نہیں ابھتاج! اگر موت بھی آئی تو کم از کم روح پر سکون تو رہے گی۔“ اور پھر ان کی منشاء کے مطابق اتالیبیہ فاروق سے اتالیبیہ ابھتاج بنا دی گئی۔

☆.....☆.....☆

اس نے سب کچھ بی جان کو بتا دیا تھا، کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔

”میرے پتر! تو نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتا دیا؟ میں نے تجھے اتنی باتیں سنائیں۔“ دکھ و تاسف سے انہوں نے کہا، سید ابھتاج عالم اپنی ماں کی معصومیت پر دھیرے سے مسکرا دیا۔

”چلیں کوئی بات نہیں، آپ کچھ نہیں جانتی تھیں اور شاید میں بھی آپ سے یہ سب کچھ چھپانا چاہتا تھا۔“

سعدیہ عابد

ناولٹ

رج مہربان

”اماں! مجھے نہیں کرنی ہے شادی“
”اب کب اس کی ناتو نے بیا تو زبان کھینچ لوں گی“
وہ بیٹی کی ایک تکرار سے اشتعال میں آ گئی تھیں۔
”زبان نہ کھینچو اماں سولی پر لڑکا دو مگر اس کا لے



کلوٹے امجد سے میری شادی نہ کرو“۔ وہ رونے لگی۔
”تجھے اللہ نے اچھی شکل و صورت کیا دے دی تو
کسی کو اپنے آگے کچھ جھکتی ہی نہیں ہے میں صابرہ کو ہاں
کہہ رہی ہوں۔“
”میں مری جاؤں گی اماں! لیکن اس کا لے امجد سے
شادی نہیں کروں گی“۔ وہ تن فتن کرتی صحن عبور کر گئی
’ہاجرہ بھی اس کے سر پر پہنچ گئیں۔“

”میں کچھ کہہ نہیں رہی ناتو اس کا مطلب یہ نہیں
ہے کہ تو سن مانیاں کرنے لگے! امجد بس رنگ و روپ کا
سوہنا نہیں ہے! ورنہ وہ دل کا بڑا اچھا ہے! ایسا نیک

صفت و شریف لڑکا قسمت والیوں کا ہی نصیب بنتا
ہے۔“

”میں بد قسمت ہی بھلی“۔ اس نے غصا لگایا تھا ہاجرہ
نے اسے کان دھے پر ایک ہتھوڑا لگا دیا وہ بلبلاتا آئی۔
”پڑھ لکھ کر سب گدھے پر لادتی جا رہی ہے
بولنے سے قتل سوچنا کبھی مت“۔ وہ بھڑکی تھیں وہ
احتجاج بھی نہ کر سکی۔

”دیکھ بیا! امجد اچھا لڑکا ہے میری بچی برس روزگار
ہے ذمہ داریاں بھی نہیں ہیں شکل و صورت کوئی چاشنا
تھوڑی ہوتی ہے تن سے زیادہ من کا خوبصورت ہونا



ضروری ہوتا ہے بیٹا تو اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔“ اکلوتی بیٹی کو روتے دیکھ کر وہ ہلکی پڑ گئیں اور نہایت شفقت سے اسے پکارنے لگیں۔

”اماں! تو کیوں نہیں سمجھتی مجھے نہیں کرنی اس سے شادی تو توجہ کرتی ہے نا مجھ سے اماں تو میری اس بات کو مان لے وہ مجھے نہیں پسند میں رہ نہیں سکتی اس کے ساتھ۔“ وہ اماں کے ہاتھ تھامے لجا جت سے بولی مگر انہیں اس پل اپنی حسین بیٹی بہت بری لگی۔

”میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“ ہاجرہ نے سوچ لیا کہ وہ بیٹی کو کوئی رعایت نہیں دیں گی۔

”آج ہی صابروہ کو فون کر کے کہہ دوں گی کہ وہ شگن لے آئے۔“

”اماں! تو نے ایسا کیا تا تو میں جان دے دوں گی۔“ اس نے اب کے دمک لگائی تھی۔

”اور تو نے میری بات نہ مانی تو میں تیرے کپے پر عمل کروں گی۔“ وہ اس کے ہی لہجے میں بولتی اس کی حیرت بڑھا گئیں۔

”اماں! تم اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہو۔۔۔۔۔؟“ آنسو گرنے لگے۔

”تیری بھلائی چاہتی ہوں اور بس۔“

”کنویں میں ڈھیل رہی ہو اور کہہ رہی ہو میری بھلائی چاہتی ہو۔ اماں اگر تم نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور میری اس امجد سے شادی کی تو تم سے بھی بات نہیں کروں گی اور اس کا لے لکھوئے امجد کو بھی سب بتا دوں گی کہ میں اس کو ناپسند کرتی ہوں۔“ وہ ماں کی گھوریوں کو کسی خاطر میں ہی نہ لائی۔

”صرف ظاہری بدصورتی کی وجہ سے تو میرے جیسے شخص کو ٹھکرا رہی ہے۔“

”اماں! باطن کس کو بُنڈائی دیتا ہے اور جب ظاہر ہی اچھا نہ ہوگا تو۔“

”اپنے فلسفے اپنے پاس رکھ۔“ وہ اس کو بری طرح جھڑپیں کرے سے نکل گئیں بارہا ان کی اکلوتی

بیٹی تھی اور وہ دنیا میں بھی نہ آئی تھی کہ اس کا باپ معمولی بخار کا شکار ہو کر دنیا سے چلا گیا ہاجرہ اس وقت محض 23 برس کی تھیں پہاڑی بیوی انہوں نے بہت حوصلے و ہمت سے کزاری ہاجرہ قبول صورت کی خاتون تھیں جبکہ ولید کافی خوش شکل نو جوان تھا بارہ باپ پر ہی گئی تھی حسن و جمال میں بیکتا اپنے نام کی طرح اور بچپن سے ہی ہر طرف سے ستائش اور واہ واہ نے اسے کافی خود پسند بنا دیا ہر چیز اسے اعلیٰ و خوبصورت چاہئے ہوتی ہاجرہ پر انگری اسکول میں پڑھاتی تھیں، مکمل آمدنی کے باوجود انہوں نے بیٹی کو ہمیشہ ایک سے ایک پہنایا اور کھلایا بڑے ہی ناز و نعم میں اس کی پرورش کی بچپن میں تو اس کی یہ باتیں انہیں اچھی لگتی تھیں مگر وقت کے ساتھ بری لگنے لگیں مگر ان کے روکنے پھرنے کا اثر اس پر کبھی نہیں ہوا ایسے وہ ماں کی فرمانبرداری تھی مگر ضد نہ کر رہی تھی امجد ان کی بڑی بہن صابروہ کا اکلوتا بیٹا تھا صابروہ نے بیٹے کا رشتہ ڈالا اور جیسے ہی اس کو پتہ چلا اس نے واہ واہ چا ڈالا جبکہ کم صورتی کے علاوہ اس میں کوئی عیب نہیں تھا مگر اس کی نگاہ میں سب سے بڑا عیب یہی تھا کہ وہ کم رو کم صورت چیزیں پسند نہیں کرتی تھی اس کا کہنا بھی تھا کہ وہ جس سے بھی شادی کرے گی وہ بہت زیادہ خوبصورت ہوگا چاہے غریب ہی کیوں نہ ہو کہ اسے اپنے غریب ہونے کا کوئی ملال نہیں تھا کم پر بھی بخوشی گزارا کر لیتی قاعدت پسندی کا وصف ماں سے لیا تھا اور اسے دولت کی چاہ کبھی رہی نہیں کہ وہ تو اسیران حسن میں تھی۔

☆-----☆

”کیا تو نے محض اس لئے انکار کر دیا کہ امجد کم صورت ہے۔۔۔۔۔؟“ اس کی اکلوتی سہیلی جو اس کے ساتھ والے گھر میں ہی رہتی تھی سنتے ہی حیرانگی سے بولی تھی۔

”ہاں تو تو جانتی ہے میں بڑے سے بڑا سیکری فائر

اور کپڑا مائز کر سکتی ہوں مگر اس معاملے میں نہیں۔“ وہ دونوں چپت پر رکھی چار پائی پر بیٹھی تھیں۔

”تو پاگل ہو گئی ہے بیا جیوں ساتھی میں جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے وہ امجد میں بدرجہ اتم موجود ہیں تو ایک ایسی خالی کو کیوں دیکھ رہی ہے جس میں اس کا کوئی ہاتھ ہی نہیں ہے تو خوبصورت ہے تو اس میں تیرا کیا کمال۔۔۔۔۔؟“

”میں نے اپنی خوبصورتی پر کبھی ناز نہیں کیا ہاں شکر ضرور ادا کرتی ہوں خوبصورتی میرا فخر نہیں میری چوڑی ہے میں ضرورت کی ہر چیز خوبصورتی کو مد نظر رکھ کر لیتی ہوں تو شوہر میں بدصورت کیسے خفت کر لوں۔۔۔۔۔؟“ وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔

”رشتے آسانوں پر بنتے ہیں۔“

”فیصلے تو زمین پر ہی ہوتے ہیں نا اور کوئی لڑکی ڈاکٹر یا فوجی سے شادی کرنا چاہے تو ٹھیک میں کسی خوبصورت بندے سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو غلط میں ہر طرح کا کپڑا مائز کرنے کے لیے تیار ہوں بس اتنا ہی چاہتی ہوں کہ اس کا ظاہر و باطن خوبصورت ہو وہ خوبصورت شکل و صورت اور خوبصورت کردار کا حامل ہو امجد میں دوسری خوبی ہے میں اس سے انکار نہیں کروں گی اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرنے کا مجھے حق حاصل نہیں ہے میں نے ایسی کوئی نا جاز بات کر دی ہے امجد میرا کزن ہے میں نے بھی اس کو خود سے کمتر و حقیر نہیں سمجھا خوبصورتی پسند ہے مجھے غرور میں جلتا نہیں ہوں میں امجد کزن ہے کزن ہی رہے میں اس کو شوہر نہیں بنانے والی کہ میں جب بھی شادی کروں گی تو یہ دیکھ کر کہ میرا ہونے والا شوہر خوبصورت ہے یا نہیں کہ میں کم صورت بندے سے کسی طور پر شادی نہیں کروں گی۔“ اماں کے بعد چھو بھی سیکرہ کی بیٹی اسے سمجھانے آ گئی تھی اس لئے وہ اس سب سے بہت بڑی ہوئی تھی اس لئے اس نے ساری بھڑاس دوست کے سامنے نکالی تھی۔

”تو غرور نہیں کرتی اس کا اندازہ ہے مجھے مگر تو جس طرح کی اس معاملے میں شدت دکھاتی ہے اس سے غرور کی بوی آتی ہے امجد کی تو ہزار خوبیاں صرف ایک خالی کی وجہ سے نظر انداز کر رہی ہے تجھے اندازہ نہیں ہے مگر تو غلط کر رہی ہے مارکیٹ کا سب سے خوبصورت سوٹ اور بیگ لینا آسان بھی ہے اور تیرے اختیار میں بھی مگر یہ معاملہ تیرے اختیار سے باہر ہے کہ شادی تیری وہیں ہوگی جہاں اللہ کی مرضی ہوگی اور تیرا بلا وجہ کا انکار اللہ کو ناراض کر سکتا ہے۔“

”بلا وجہ کا انکار۔۔۔۔۔؟“ وہ اس کی اس بات پر انک گئی۔

”میری پسند ناپسند بلا وجہ کا انکار کیسے ہو سکتی ہے۔“ وہ دوست کو گھور رہی تھی۔

”او کے جودل میں آئے کرو۔“ وہ لا حاصل بحث سے اکتا گئی تھی۔

”تم سب لوگ آخر امجد کو سمجھ کیا رہے ہو۔۔۔۔۔؟ وہ اس دنیا کا آخری مردے کہ اس سے شادی نہ ہوئی تو میں کنواری ہی مر جاؤں گی تو پہلا رشتہ ہے آگے جو رشتہ آئے وہ میری پسند کے مطابق بھی تو ہو سکتا ہے مگر تم سب لوگ امجد کو اول و آخر سمجھ بیٹھے ہو۔“ وہ کہاں اپنے ذہن و دل کی بات اس سے کہے بغیر چین پاسکتی تھی اس کے بات ختم کر دینے کے اشارے کو کسی خاطر میں ہی نہ لائی۔

”تو اپنی جگہ صحیح ہے تیری پسند ناپسند کو بھی کوئی غلط نہیں کہہ رہا مگر تیرا موقف کچھ زیادہ ہی سختی لئے ہوئے ہے اور یہ غلط ہے اور جب امجد اس ایک کی کے علاوہ ہر لحاظ سے پرنکٹ ہے تو کیوں نا خالہ اماں تمہاری شادی اس سے کرنا چاہیں گی اور ویسے بھی رشتے تو آسکتے ہیں اور آئیں گے بھی انشاء اللہ لیکن کہتے ہیں لڑکی کا پہلا رشتہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور تم اللہ کی ناشکری کی مرتکب ہو رہی ہو کہیں تم نے چلک رکھی اس لئے اللہ نے بھی تمہاری پکڑ نہیں کی وگرنہ اللہ

کی بنائی ہوئی چیزوں کی تم بے عزتی کر جاتی ہو؟ کم صورت کہہ کر انہیں نظر انداز کر کے، مگر اس بات تم کسی کا دل تو زری ہو! مجدد تم سے محبت کرتا ہے اور تم اس کی ہزار خوبیوں.....“

”خوپیاں خوپیاں‘ اب امجد ایسی بھی خوپیاں کا مرقع نہیں ہے اب تم نے اس کی خوپیاں گنوائیں تو میں جھہیں جان سے مار دوں گی“۔ وہ غصہ سے کھول رہی تھی کہ ہر کوئی اسے امجد کی خوپیاں گنوائے بیٹھ جاتا ہے، وہ نہایت بدتمیزی سے کہتی بیٹھیاں اتر گئی۔

﴿.....☆.....﴾

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ تم نے مجھ سے شادی نہیں کرنی ہے۔“ اس کو ایک فیصلہ بھی یہ امید نہ تھی کہ وہ یہ بات ڈائریکٹ اس سے کر لے گا اور اس کے خوبصورت لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ شرمندہ ہو گئی تھی اپنا آپ اس کا مجرم لگنے لگا اور اسے غور سے دیکھا تو وہ کافی پریشانش لگا اور وہ اسے کالا کھونا کہہ رہی تھی جبکہ درحقیقت وہ گندی رنگت اور کھڑے نقوش کا کافی قبول و خوش شکل تھا مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو اس کے بارے میں سوچ ہی نہیں پایا، ماں کی ناراضی پر سوچنا چاہتا تو ذہن و دل میں سناٹے ہی گونجتے رہے۔

”وہ“ میں..... امجد“۔ وہ نگاہ جھکا کر لب کچنے لگی اور وہ اس حسن کے پیکر دشمن جاں کو دیکھنے لگا۔

”میں دعا کروں گا اللہ سے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ہر دعا ہر خواہش پوری کرے“ میں نے بارعزم سے بے انتہا بے تماشہ محبت کی ہے اور میں تمہیں خوش دیکھنا چاہوں گا، چاہے خوشیاں مجھ سے روٹ جائیں، تمہیں میں اپنے قابل نہیں لگتا، دعا ہے میری کہ تمہیں تمہارے قابل تمہارے معیار کے مطابق شخص کا ساتھ نصیب ہو، ہر پرانے یکطرفہ معلق کو الوداع کہتا تم سے رخصت جا ہوں گا، جہاں رہو خوش رہو۔ وہ اس کے تکیے میں نقش سے مزین چہرے کو نگاہوں میں جذب

کرتا وہاں ٹھہرا نہیں اور وہیں نہیں وہ شہر ہی نہیں ملک
 ہی چھوڑ گیا کہ اس دشمن جاں کو سامنے دیکھ کر بھلا نہ
 پاتا اور اسے اپنی نگاہ کے سامنے کسی اور کا ہوتے بھی
 دیکھ پانا کھن ہوتا اس لئے اس نے اپنے راستے ہی
 جدا کر لئے یہ اور بات کہ الوداع کہہ دینے سے
 رخصت لے لینے کے باوجود اس کی زندگی اسی کی
 یادوں سے مکی ہوئی تھی کہ بھولانے کی چاہ میں اسے
 شدت سے یاد رکھے ہوئے تھا۔

”شمینہ آپ! وہ پھپھو“۔ امجد کی بہن کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ساتھ ہی ہوتی بھی جا رہی تھی کہ اس نوجوان کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر چپ کر گئی نگاہ اسی پر جمی تھی کہ وہ دیو مالائی حسن کا مالک بالکل اس کے خوابوں کے شہزادے جیسا تھا‘ شہابی رنگت کھڑے نقوش بڑی بڑی گہری آنکھیں‘ بھرے بھرے عنابی لب‘ کسرتی جسم‘ وہ اگر اس کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی تو وہاں بھی بے خودی کا کچھ پونہی عالم تھا‘ گلابی چہرے کی اسمائل بارہ کو بے خود کر گئی تھی شمینہ نے دونوں کی ہی چٹکی لگا ہیں دیکھیں تو وہ نکھاری تو وہ دونوں ہی جھل ہو گئے۔

”بارعہ! یہ میرے جیٹھ احسان فاروقی ہیں اور احسان بھائی یہ میری اکلوتی ماموں زاد بارعہ جمال ہے۔“ اس نے ان دونوں کا تعارف کروایا تھا۔

”ٹاکس ٹومیٹ یوس بارعہ“ اس کی طرح اس کا لہجہ بھی انتہائی خوبصورت تھا اس نے کھن مسکرانے پر اکتفا کیا اور اس کی مسکراہٹ بلاشبہ اتنی حسین تھی کہ وہ ہری طرح چونک کر اس کی جانب متوجہ ہو گیا جو ٹمینہ کو صابرہ کا پیغام دے رہی تھی اور وہ اس کے نازک لبوں کی جنبش، دل تھام کر دیکھ رہا تھا کہ وہ وہاں سے چلی گئی اس کی کھوئی کھوئی کیفیت ٹمینہ نے محسوس تو کی، مگر بولی کچھ نہیں کہ اسی وقت احسان کی بیوی جو واش روم میں تھی وہ آگئی، ٹمینہ، کارجن سے ہوئے

نکاح کو دو سال ہو گئے تھے، رحمان آؤٹ آف کنٹری تھا اس لئے اس کے آتے ہی رخصتی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، رحمن دوبہی بھائی تھے، احسان بڑا تھا اور اس نے نمرہ سے محبت کی شادی کی تھی، ثمنینہ خالصتاً رحمن کی والدہ رقیہ کی پسند تھی، رحمن نے نکاح سے قبل اسے نہیں دیکھا تھا مگر نکاح کی شام دیکھا تو اسے سادہ سی ثمنینہ اچھی لگی اور وہ اکثر اس کو فون کر لیتا، رقیہ بیمار تھیں اس لئے رخصتی کی تاریخ رحمن کے بڑے بھائی بھادراج لینے آئے تھے اور اسی لئے ہاجرہ اور بارعہ ان کے گھر آئی ہوئی تھیں عین نکاح کے دن وہ بیمار ہو گئی تھی وہ شریک نہیں ہوئی تھی اس لئے رحمن اور اس کی بیوی سے پہلی دفعہ ملی اور جہاں احسان کو دیکھ کر دل کی دنیا زیر و زبر ہوئی تھی کچھ ہی دیر میں اس کی بیوی کو دیکھ کر بے یقینی سے وہ چکر اٹھی تھی کہ یہ تو گمان میں ہی کہیں نہ تھا کہ خوابوں کا شہزادہ کمرائے گا بھی تو غیر ہو جانے کے بعد وہ اداس ایسی ہوئی کہ بعد میں بھی یہ اداسی زائل نہ ہو سکی، امجد جو واپس نہیں آتا چاہتا تھا بہن کا مان، مان کا فرمان رکھنے کو رخصتی سے دو دن قبل آ گیا، وہ صبح 5 بجے آیا تھا اور شام میں مایوں، مہندی کی رسم، جس میں اسے ایک سال بعد دیکھا تو دل کی وہی تان، نگاہ میں وہی بے تابیاں تھیں اور وہ اسے چونکا کر بھی کہ تک سبک سے تیار رہنے والی بارعہ مہندی کی محفل میں بھی سادگی کی تصویر بنی ہوئی تھا، کاہی مہندی رنگ کے سوٹ میں آنکھوں میں جاہل اور لیوں پر گلابی لب اسٹک لگائے وہ اسے کافی سوکوا کر لگی۔

”یہ! تم ٹھیک تو ہو کیا بیمار ہی ہو.....؟“ اس کے لب و لہجہ میں اس کے لئے بے پناہ فکر چھپی تھی۔

”ہاں نہیں..... تمہاری بد دعا لگ گئی تھی مجھے۔“ وہ بری طرح چوکی اور آزر دگی سے بولی اور وہ اک نئے الزام پر تڑپ ہی تو گیا۔

”میں تمہیں بددعا دوں گا جو جب اللہ کے آگے
دست سوال بلند کرتا ہے تو پہلے تمہارے لئے تمہاری

خوشیوں کے لئے دعا کرتا ہے اور تم کہتی ہو کہ میں نے تمہیں بددعا دی ہے میں نے تو کبھی تمہارا برا چاہا ہی نہیں۔ وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا اور اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔

”مجھے تمہاری آہ لگ گئی ہے میری بد نصیبی تو دیکھو
ابجد کہ جس شخص کو خوابوں و خیالوں میں سوچا وہ جب
مجم میرے سامنے آیا تو میرا تھا ہی نہیں وہ جب میرا
نہ تھا تو کیوں میں نے اس کی شبیہ خیالوں میں
بسا کی.....؟ جس خواب کی کوئی تعبیر نہ تھی وہ خواب
میری پلکوں کی زینت کیوں بنا جس شخص کو دیکھ کر
سارے خواب حقیقت میں بدلنے لگے تھے وہ تو
میرے لئے تھا ہی نہیں وہ جب مجھے ملا تو بہت دیر
ہو چکی تھی۔“ وہ حیرانی و دکھ سے اس کو سن رہا تھا جس
کی آنکھیں روانی سے بہہ رہی تھیں اور لہجے میں ایسی
حکمت اور بے چارگی تھی کہ اس کے وجود میں اداسیاں
کھل گئیں اور وہ آنکھوں میں تاسف لئے اسے خود
سے لمحہ بہ لمحہ دور جاتے دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

”اماں! احسان میں برائی کیا ہے؟“

”برائی..... اچھائی کیا ہے اس میں ایک شادی
شدہ مرد جس کی بیوی بھی موجود ہے تم اس سے شادی
کے لئے یہ قرار ہو رہی ہو، محض اس لئے کہ وہ خود
ہے زندگی کی کنٹیناں خدا نہ کرے سبھی پڑ گئیں تو چھٹی شکل
و صورت کام نہ آئے گی وہ ایک دل بھینک شخص ہے
ایک بیوی کو چھوڑ چکا ہے دوسری کی موجودگی میں تیسری
کرنے کو تیار ہے۔ تیری تو مت ہی ماری گئی ہے مگر
میں تجھے یہ بے عقلی نہیں کرنے دوں گی، کسی قیمت پر
تیری شادی احسان سے نہیں کروں گی اس موئے شادی
شدہ احسان سے تو احمدا لاکھ گنا بہتر۔“

”امجد“ امجد سارا فساد پھیلایا ہوا ہی اس امجد کے ہے جب مجھے اس سے شادی ہی نہیں کرنی تو بار بار اس کا نام کیوں لیتی ہوا ماں اور جب مجھے احسان سے

شادی سے انکار نہیں ہے تو تم کیوں نہیں مان جاتے؟
مگر تم مانو گی تو جب اماں جب امجد کی اچھائی کا بھوت
تمہارے سر سے اترے گا، وہ اتنا بھی اچھا نہیں ہے
جتنا لگتا ہے اور نہ ہی احسان اتنے برے ہیں، تم میری
ان سے شادی نہ کر سکو اماں میں اگر شادی کروں گی
تو صرف احسان سے وگرنہ نہیں کہ مجھے ان کی دوسری
تیسری شادی سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور تمہیں بھی نہیں
پڑنا چاہئے کہ زندگی میں نے گزاری ہے تم نے
نہیں۔ وہ بدتمیزی و بدگلائی کی انتہا کرتی وہاں رکی نہ
تھی اور ماں کے کمرے کے باہر کھڑے امجد سے
نکراتے نکراتے بچی وہ اسے زہر خندنگا ہوں سے
گھورتی وہاں سے چلی گئی وہ ابھی کا سوچ رہا تھا کہ
جو کچھ سنا تھا وہ اس کے دکھ کو بڑھانے کے ساتھ بارے
کی بدتمیزی پر وہ اندر تک کھول گیا تھا، مگر وہ کچھ سوچ
کر خالہ کے کمرے میں داخل ہو گیا کہ اسے لگا تھا کہ
جتنی بدتمیزی بارے نے ماں سے کی ہے ان کو سہارے
کی ضرورت ہو گی کہ وہ جب اتنی تکلیف محسوس کر رہا
ہے تو وہ کس تکلیف سے گزر رہی ہوں گی اور اس کا
وہیں سے نہ پلٹنے کا فائدہ ہی ہوا کہ اس نے چکر اکر
گرتی خالہ کو قہقہہ لیا تھا اور انہیں لئے ہاسپٹل دوڑا تھا،
بہنی کی حد درجے ضد اور بدتمیزی نے ان کے دل پر گہرا
زخم لگا یا تھا اور وہ جو اپنی ہر بدتمیزی و غلطی سے بے حس
و ضد میں انجان بنی ہوئی تھی ماں کو آئی سی یوس میں دیکھ کر
ترپ اٹھی اور رہی سہی کسر امجد نے پوری کر دی۔
”اب کیوں رو رہی ہو.....؟ تمہیں تو خوش ہونا
چاہئے کہ آج خالہ ان حالوں پر صرف تمہاری وجہ سے
چٹخ چکی ہیں، خالہ کی اس حالت کی صرف اور صرف تم
ذمہ دار ہو تم نے اپنی منہ زور خواہشات اور بے جا ضد
کے لئے اپنی ماں کی ہر قربانی فراموش کر دی، تمہیں
احساس نہیں ہے کہ تم خالہ سے کس قدر بدتمیزی کر چکی
ہو اپنی اس ماں سے جس نے تمہاری پرورش تمہارے
اچھے حال و مستقبل کے لئے اپنی خوشیاں تباہ کر دیں“

محض 23 برس کی عمر میں بیوہ ہوئی تھیں دوسری شادی
کر سکتی تھیں لیکن انہوں نے نہیں کی تم کو ناز و دھم میں
پالا اور تم نے اس کا یہ صلہ دیا، ایک غیر شخص کے لئے
اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے اپنی عظیم ماں کی تذلیل
کی انہیں دکھ پہنچایا۔ امجد کو اس پر اتنا غصہ تو جب بھی
نہ آیا تھا جب اس نے شادی سے انکار کیا تھا، اس کی
قبول صورت کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا کہ وہ انکار و اقرار
کا اس کو حق دیتے ہوئے خود کو کیسے بھی کنٹرول کر گیا تھا
مگر باجہ اسے اپنی ماں کی طرح ہی عزیز بھی بارے کی
بدتمیزی اس کا رویہ اسے سخت برا لگا تھا، اس لئے اس کو
بری طرح رو تے جلتے ماں کے لئے پریشان ہوتے
دعائیں کرتے دیکھ کر وہ اس کو اس کے برے رویے کا
احساس دلانے پر مجبور ہو گیا کہ ماں اس لئے تو نہیں
ہوئیں کہ جب دل چاہا تو ان کی بات مان لی عزت
کر لی اور جب موڈ نہ ہوا تو بے عزتی کر دی، ضدیں
پوری کروانے کو جو منہ میں آیا کہہ دیا اور ضد پوری ہوئی
تو خوش ہو گئے۔
”ایسے مت کہو امجد! میں اماں سے بہت محبت کرتی
ہوں ان کو کچھ ہو گیا تو میں جی نہیں پاؤں گی ایک اماں
ہی تو میرا سب کچھ ہیں۔“ وہ سکتے ہوئے بولی تھی۔
”کاش تم محبت کی طرح خالہ کی عزت بھی کرتیں
تمہیں صرف اپنی نہیں خالہ کی بھی پرداہ ہوتی۔“ وہ
نہایت سی سے بولا تھا اور ڈاکٹر کو آئی سی یو سے نکل کر
ان کی طرف ہی بڑھتے دیکھ کر وہ اس کو کچھ کہنے کا ارادہ
ترک کرتی آنسو رگڑتی جلدی سے لپک کر ڈاکٹر تک خود
ہی چلی آئی اور باجہ کے ہوش میں آ جانے کی خبر سن کر
اس کی آنکھیں تشکر سے پنبے لگیں کہ باجہ ہی تو اس کا
سب کچھ تھیں، اپنی غلطیوں کو تباہیوں کا آج سے قبل
احساس تک نہ تھا، مگر ماں کو کھونے کا احساس ہوا تو
ساری منہ زور خواہشات، ضدیں، لہجے دور جاسوئیں
کہ وہ مجموعی طور پر بری نہیں تھی باجہ اس کی ہر جائزہ
نا جائزہ مان لیتی تھیں اس لئے اس کو کبھی احساس ہی نہ

ہوا کہ وہ کہاں غلطی مگر اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا
تھا اور وہ اپنی ماں کی خوشی کے لئے ایک احسان کی محبت
تو کیا ہزار محبتیں قربان کر سکتی تھی۔
☆.....☆.....☆.....
”مجھے معاف کر دو اماں! میں نے تمہارا دل دکھایا
ہے میں تم سے اپنے ہر برے رویے کی معافی مانگتی ہوں،
شرمندہ ہوں تم سے مجھے معاف کر دو۔“ وہ دودن ٹل ہی
ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوئی تھیں وہ چاہ کر بھی ماں سے
اپنے رویے کی تلافی نہیں کر سکی مگر آج سوپ پلاتے
ہوئے بے اختیار ہو گئی۔
”ارے باگل! میں تجھ سے نہ ناراض ہوں نہ تجھے
غلط سمجھتی ہوں، غلطی میری ہی ہے کہ تیرے بار بار انکار
پر بھی میں نے امجد کا نام تیرے سامنے لیا، تو احسان
سے شادی کرنا چاہتی ہے تو میں تیری شادی
احسان.....“
”نہیں اماں! میں احسان سے نہیں صرف اس شخص
سے شادی کروں گی جس سے تم چاہو گی، بس مجھے میری
ہر بدتمیزی و خطا کے لئے معاف کر دینا کہ تمہارا دل
دکھانا تو نہیں چاہتی تھی مگر میں نے ایسا کیا تم سے
بدتمیزی کی۔“ آنسو تیزی سے گر رہے تھے۔
”ارے بچی روئی کیوں ہے، جو ہوا وہ بھول جا اور
مجھے صرف تیری خوشی عزیز ہے اگر تجھے لگتا ہے کہ تو
احسان کے ساتھ خوش رہے گی تو میں دعا کروں گی کہ
تیری ہر خواہش، تیری ہر آرزو پوری ہو۔“ انہوں نے
اس کا سر سینے سے لگا کر تھکا تھا اور وہ پلٹنے لگی تھی۔
”اماں! مجھے معاف کر دینا، تمہیں تکلیف دینا
نہیں چاہتی تھی، مگر بس نہ جانے کیسے وہ سب تم سے کہہ
گئی، احسان تمہیں نہیں پسندتا اب کبھی وہ نام لب پر
بھی نہ لاؤں گی کہ تجھے تکلیف دے کر میں خوشی حاصل
کر ہی نہیں سکتی۔“
”بات پسند اور نا پسند کی نہیں ہے بیا اوہ پہلے سے
شادی شدہ ہے، صرف اس لئے میں تعال کا شکار ہوں

کہ تجھے جانتی ہوں تو سو کن کا دکھ برداشت نہیں
کر سکے گی کہ جس نے کسی بھی رشتے میں شراکت کا
دکھ نہ سہا ہو وہ ایک ایسے رشتے کو آدھے حق کے ساتھ
قبول نہیں کر سکتی کہ شوہر کا پیار اس کے حق بائنے کا
عورت تصور بھی نہیں کر سکتی میں تجھے سوچئے، مجھنے کے
لئے وقت دے رہی ہوں آگے تیرا نصیب۔“ وہ
بوجھل لہجے میں کہتیں بہنی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بات
سمیٹ گئیں کہ انہوں نے پہاڑ جیسی زندگی تنہا بہنی
کے سہارے گزاری اس کی معمولی سی تکلیف بھی ان
سے برداشت نہیں ہوتی تھی اس لئے تو وہ چاہتی تھیں
کہ اس کی شادی امجد سے ہو جائے کہ وہ ہر لحاظ سے
انہیں بہنی کے قابل لگتا تھا، مگر وہ کہتے ہیں نا کہ دل
آئے گدھی پر تو پری کیا چیز ہے وہ امجد کی سانولی
رنگت برداشت نہیں کر سکی اور احسان کی شادی اور
بیوی کو بھی برداشت کرنے کو تیار ہو گئی تھی یہ اس کی کم
عقلی و بے وقوفی تھی یا محبت.....؟
☆.....☆.....☆.....
”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپی.....؟“ شبنم نے بتائی
ہوئی بات پر کچھ ٹانچئے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکا تھا، یہ چند
لفظ بھی بمشکل زبان سے ادا ہوئے تھے۔
”بہنی سچ ہے امجد! احسان بھائی پاپا سے محض اس
لئے شادی کرنا چاہتے ہیں کہ بھائی ماں نہیں بن سکیں
اور انہیں وارث چاہئے، وہ شادی کا کافی عرصے سے
سوچ رہے تھے مگر بھائی نہیں مان رہی تھیں، مگر جب
احسان بھائی نے بیا کو دیکھا تو جیسے سارے فیصلے ہو گئے،
بھائی تو راضی اب بھی نہیں ہیں مگر احسان بھائی کے
چھوڑ دینے کی دھمکی انہیں خاموش کر گئی ہے احسان
بھائی نے بیاہ کو محض اس کی خوبصورتی کی وجہ سے منتخب
کیا ہے کہ وہ کافی حسن پرست ہیں اور ان کی تمام
محرومیوں کو دور کرنے کو بیا جیسے راضی ہے، لیکن میں
جانتی ہوں کہ بیا ان کے ساتھ خوش نہیں رہ پائے گی کہ
ایک تو ۱۰۰۰ اسے صرف اپنے مفاد کے لئے اپنا رہے ہیں

دوسری یہ کہ وہ کافی ہنورا صفت کے حامل ہیں اور بیا کافی سیدی سادھی بے وقوف سی لڑکی ہے جیسی تو انہوں نے اسے اتنی آسانی سے ٹریپ کر لیا ہے۔“ وہ کافی تفصیل سے بولی تھی۔

”یہ سب مجھے بتانے کا مقصد.....؟“ وہ خود کو کپور کرتا رہنے سے بولا تھا کہ بارے سے دوستانہ تعلقات تو پہلے بھی نہ تھے اب تو دونوں کے درمیان لائقیتي وسرد مہری کی در آئی تھی۔

”اور یہ سب آپ اب کیوں بتا رہی ہیں جب شادی میں مشکل سے تین دن بھی باقی نہیں ہیں۔“

”اس سب سے میں لاعلمی رات میں نے بھائی اور احسان بھائی کی باتیں سنیں تو میں آج یہ سب تم سے ڈسکس کرنے آئی کہ مجھے لگتا ہے کہ تم بارے کی زندگی خراب ہونے سے بچا سکتے ہو۔“ نرمی سے کہہ کر انہوں نے یکدم ہی بہت بڑی بات کہہ دی۔

”آہی.....“

”جانتی ہوں یہ مشکل ہے مگر تم نے بیا سے محبت کی ہے اور اسی محبت کے لئے اپنا ظرف اور دل بڑا کر کے اسے اپنا لاکھ اسے کھو کر تم بھی خوش نہیں رہو گے مگر وہ ناخوش ہوئی تو تمہارے اندر سے خوشی کا ہر ایک احساس مٹ جائے گا۔ تم صرف اپنی محبت اور خالہ کے لئے اس سب کے لئے راضی ہو جاؤ۔“ وہ بھائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھے امید سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آ رہیں میں اپنا ظرف بڑا کر بھی لوں تو کیا حاصل.....؟ بیا اس سب کے لئے راضی نہیں ہوگی۔“

”تم بیا کی فکر مت کرو میں اماں اور خالہ سے بات کر چکی ہوں اور ان دونوں کے ہی فیور کی روشنی میں تم سے بات کر رہی ہوں خالہ کہہ رہی تھیں کہ بیا وہ اوپلا ضرور کرے گی مگر پھر نارل ہو جائے گی جب اسے احسان کی اصلیت پتہ چلے گی تم شادی کے لئے راضی ہو جاؤ تو خالہ بیا کو خود ہی راضی کر لیں گی۔“ وہ تو

احسان سے بارے کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں اس کی اصلیت جان کر تو دل مزید خراب ہو گیا اور انہوں نے خود ہی سہ سے کہہ دیا کہ وہ بارے کو اپنی بہو بنائے صابرہ کی تو یہ دلی خواہش تھی کہ بیٹے کی خوشی سے وہ لاعلم نہ تھیں اور انہوں نے خود حامی بھر کر امجد سے بات کرنے کے لئے نمینہ کو بھیج دیا کہ دونوں بہن بھائیوں میں کافی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔

”آپ سب لوگ یہی چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وہ تو جیسے کھل ہی اچھی کہ اس نے بھی ہمیشہ بارے کو اپنی بھالی کے روپ میں ہی دیکھا تھا۔

”میں ای کو جا کر انہیں تمہارے راضی ہو جانے کا بتاتی ہوں۔“ وہ چھوٹے بھائی کا پیارے گال تھپتھپاتی روم سے نکل گئی تھی باہر تک امجد کا اقرار پہنچا تو بیا سے بات کرنے پہنچ گئیں۔

”اماں! جب میں تمہاری خوشی میں راضی ہو رہی تھی تو تم نے میری خوشی مان لینے پر زور دیا تو اب ان سب باتوں کا کیا مطلب.....؟“ وہ ساری تفصیل جان کر عام سے لہجے میں بولی تھی۔

”وہ تجھے دھوکا دے رہا ہے بیا! اسے تجھ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے وہ بس اولاد کے لئے۔“

”اماں! احسان نے مجھے کوئی دھوکا نہیں دیا میں یہ سب پہلے سے جانتی ہوں پر پوزل دینے سے کھل ہی انہوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا کہ ان کی بیوی ماں نہیں بن سکتی اور اس لئے وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے انہوں نے پہلی نگاہ کی محبت کی ہے وہ مجھے کھونا نہیں چاہیں گے صرف اس لئے ہر بات کھل کر بتائی کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دینا چاہتے تھے وہ مجھے الگ گھر میں رکھیں گے میرا ہر حق ادا کریں گے اور وہ جب مجھ سے محبت کرتے ہیں مجھے حق دینے کو تیار ہیں مجھے ساری سچائی کھل کر بتادی میں بھی ان سے محبت کرتی ہوں ان کو ہر خای و خوبی کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہوں تو ان سب تکلیف دہ باتوں کا کوئی مطلب نہیں

دیکھنا اور نمینہ آپ انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ سسرال کی باتیں ادھر ادھر کریں اس گھر کے عیب ڈھکنا اب ان کا فرض بھی ہے اور مجبوری بھی مگر وہ تو ہر بات طشت از با م کر گئی ہیں انہیں شرم.....“

”فضول کیوں کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور احسان مجھے نہ کل پسند تھا اور نہ آج ہے صرف تیرے خیال سے میں مجبوراً چپ کر گئی تھی مگر یہ بات میری برداشت سے باہر ہے میں احسان پر بھروسہ کر ہی نہیں سکتی ہوں ایک بیوی چھوڑ چکا ہے دوسری کو چھوڑنے کی دھمکی دے کر تیسری شادی کر رہا ہے اس طرح تمہیں بھی چھوڑ سکتا ہے کہ ویسے بھی تم سے تو اپنے مفاد کے لئے شادی کر رہا ہے مفاد پورا کر کے بھی چھوڑ سکتا ہے اور تم اس کی خواہش و امیدوں پر کھری نہ اتریں تو بھی جبکہ اولاد تو قسمت سے ہوتی ہے میں اپنی اولاد کو جانتے بوجھے کنویں میں نہیں ڈھیل سکتی۔“

”اماں! احسان ایسے نہیں ہیں جیسا آپ.....“

”وہ کیسا ہے؟ کیا نہیں اب مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ تمہاری اس سے شادی نہیں ہوگی۔“ اس کے چہرے پر سائے لرزاں ہو گئے۔

”اماں.....“

”یہ میرا آرنی فیصلہ ہے میں احسان کے گھر فون کر کے انکار کر رہی ہوں صابرہ سے میں نے بات کر لی ہے کل تیرا نکاح احسان کی بجائے امجد سے ہو جائے گا اور تو نے انکار کرنے یا واوپلا کرنے کی کوشش کی یا سن مانی کرنے کا سوچا تو ماں کا مرنا نہ دیکھے گی۔“ وہ ایک جھٹکے سے انھیں اور اس کو آدھویوں کی زد پر چھوڑ کر وہاں سے نکل گئیں۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی امجد! یہ تمہاری اچھائی کا ہی بھوت ہے جو اماں پر ہمیشہ سوار رہا لیکن میں نے بھی تمہاری زندگی کا عذاب نہ بنا دی تو میرا بھی نام بارے ولید نہیں۔“ رورود کر تھک گئی ماں کو

کسی طور پر راضی نہ کر سکی تو خالہ سے بات کی مگر وہاں بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی نمینہ تو الٹا اسے سمجھانے لگی اس نے امجد سے رابطہ کرنا چاہا تو اس نے اس کی کال ہی ریسو نہیں کی اور وہ بے بسی کی انتہا پر پہنچتی ماں کے فیصلے پر نہ چاہتے ہوئے بھی سر جھکا گئی مگر امجد کے لئے موجود نا پسندیدگی کی نفرت کے قالب میں ڈھل گئی اور اسی جذبے کو دل میں جگہ دیتے ہوئے اس نے نکاح نامے پر سائن کئے تھے اور دو آنسو پلوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلے تھے کہ محبت پانے کے مقام پر پہنچ رہی تھی تکلیف تو ہونا ہی تھی اور زخم تازہ تھا تو تکلیف بھی اسی مناسبت سے تھی۔

☆.....☆.....☆

”تم نے کیا سمجھا تھا کہ میں تمہارے انتظار میں بیٹھی رہوں گی ایسا سوچنا بھی مت کہ میں کبھی تمہارا انتظار کروں گی نہیں اور تم سے زبردستی جوڑے جانے والے رشتے کو رتی برابر بھی کبھی اہمیت دوں گی کچھ سمجھوں گی۔“ وہ زہور اتار کر سادے سے کاشن کے سوٹ میں داش روم سے نکلی تھی اور اس کی بے یقین نگاہیں خود پر محسوس کر کے انتہائی زہر خند لہجے میں بولی تھی امجد ایک سادہ سا بندہ تھا رشتوں کو اہمیت دینے والا اور رشتوں کے احترام میں محبت کے پاس میں اس نے یہ بات نظر انداز کر دی تھی کہ اس کی ہونے والی بیوی کسی اور سے محبت کرتی ہے اس نے طرف تو بڑا کر لیا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کم ظرف ثابت ہونے والی تھی اور اس کے صبر اور ضبط کو آزمانے والی تھی اس نے سختی سے لب پہنچ کر خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا اس کی خاموشی اس کو شیر بنا گئی۔

”نفرت کرتی ہوں میں تم سے امجد صابر! شدید نفرت صرف تمہاری وجہ سے آج میں یہاں ہوں صرف تمہاری وجہ سے میں احسان کی نہیں بن سکتی تم جانتے تھے کہ میں تم سے نہیں احسان سے محبت کرتی ہوں اس کے باوجود بھی تم نے مجھ سے شادی کی سر

بھی اہمیت دی، اسے خالہ کی نظروں سے گرا دیا اور وہ ملک چھوڑ کر چلا گیا، اس کے جانے کے بعد میں آزادی محسوس کرنے لگی کہ اماں سے شادی کے بعد میں نے کوئی رابطہ ہی نہیں رکھا تھا اور خالہ مجھے کبھی بھی کہیں بھی آنے جانے سے قطعاً نہیں روکتی تھیں، اماں کے گھر غربت کی وجہ سے جو خواہشیں، ادھوری سبک رہی تھیں، ان کو تکمیل کا راستہ مل گیا، شاپنگ پارٹی کا نہ رکے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک پارٹی میں احسان سے ملاقات ہوئی وہ عین ٹائم پر میرے انکار و فرار پر مجھ سے ناراض تھا، بات کرتے ہوئے دکھ کا شکار تھا اور میں پہلے کی طرح اس کی کچھ داریاں میں ابھرتی چلی گئی، اس کے کہنے پر میں نے امجد کو طلاق کا نوٹس تک بھیج دیا، میں اس کے ساتھ سنسیر بھی اس سے محبت کرتی تھی، مگر اس نے مجھ سے محبت تو کی ہی نہیں تھی، مجھے اس نے صرف طلب بنانا چاہا، اپنی طلب کے حصول کے لئے وہ پیش قدمی کرتا رہا سیدھا راستہ اس کی سرشت میں نہ تھا، مگر اولاد کی طلب نے اسے مجبور کر دیا اور اس نے میری طلب کو جائزہ حصول سے جوڑ دیا، مگر کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کرنے کی کوشش کی، میری عزت پر ہاتھ ڈالا، اس شخص نے جس پر میں نے بہت اعتبار کیا تھا، جس کی خاطر اپنوں اور روایات کے خلاف گئی تھی، ماں اور ماں سے جھوٹ بولے، امجد سے طلاق کا مطالبہ تک کر دیا، اس کو شوہر تسلیم ہی نہیں کیا، کیسے کیسے میں نے امجد کی تدبیل نہیں کی، یہیہ مگر اس نے یہ حق رکھتے ہوئے بھی مجھے چھوٹنے کی کوشش نہ کی، کیونکہ میں ایسا نہیں چاہتی تھی اور اس شخص نے میرے ساتھ کیا کرنا چاہا، جس پر میں نے بھروسہ کیا، تم سب لوگ ٹھیک کہتے تھے حسن و خوبصورتی ظاہری نہیں باطنی ہوتی چاہئے اور باطنی خوبیوں والے نے حق رکھتے ہوئے بھی میری رضا و خوشی کے احترام میں حق کا استعمال نہ کیا اور ظاہری خوبصورتی والے

فحش نے محبت کے نام پر دھوکا دیا اور عزت آگینہ چور چور کر دینا چاہا، میری سوچ و پسند محدود اور گھٹیا تھی، سب مجھے مکتی دیر میں سمجھ آیا۔۔۔ بولتے بولتے خود ہی تھک کر چپ کر گئی اور وہ تو اس کی حرکتوں سے انجان تھی مگر اب کہتی بھی تو کیا کر لگنے والی چوٹ نے اس کی عقل و آنکھیں کھول دی تھیں اور اب ایسے میں اس کے کچھ کہنے یا سمجھانے کی کوئی گنجائش بچی ہی نہیں تھی۔

”تم اپنے کئے پر نادم ہو، شرمندگی محسوس کر رہی ہو اس سب کی پہلے اللہ سے معافی طلب کرو اور اس کے بعد امجد کو آواز دے لو کہ وہ امجد اللہ کا انجام ہے تمہارے لئے، جس کی بہت ناقدری کر لی، اب عقل آگئی ہے تو سب سے پہلے اس کو واپس بلانا ہوگا، اپنے کئے کی معافی.....“

”وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔“

”ہاں، حق بجانب ہوگا وہ ایسا کرنے میں مگر تمہیں کوشش تو کرنی ہی ہوگی کہ معافی نہ ملنے کے ڈر سے معافی نہ مانگتے، بہتر ہے کہ معافی مانگ کر معافی ملنے کا انتظار کر لیا جائے۔“ وہ دوست کی پہلے بھی درست رہنمائی کرتی رہی تھی، آج بھی اسے درست راستہ ہی دکھایا تھا مگر وہ پہلے بھٹک گئی تھی اور اب ہمت نہیں بھی وہ اللہ سے صبح و شام اپنے کئے کی معافی طلب کرتی، امجد کے واپس آ جانے کی دعا نہیں مانگتی، خود سے فون کرنے کی اس کو ہمت نہ ہو پاری تھی کہ بات اس نے طلاق کی نوبت تک پہنچادی تھی رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہو گیا تھا، اس کے سجدے اور دعائیں بہت لمبی ہو گئی تھیں، صابرہ نے اس میں بدلاؤ محسوس کیا، انہیں اس کی تبدیلی اچھی لگی تھی کہ وہ نماز روزے کی بہت پابند نہ تھی مگر اب پورے روزے باقاعدگی سے رکھ رہی تھی، فرض نمازوں کے ساتھ قلمی نمازیں خاص کر تہجد اور دیگر تسبیحات پڑھتی رہتی۔

”یہاں امجد کو صرف ایک کال کر کے واپسی کا کہہ دو بیٹا کہ میں اسے جاتی ہوں، جس طرح گیا ہے وہ اب لوٹنے والا نہیں ہے، وہ تمہاری مثبت تبدیلی سے بھی انجان ہے۔“ سترہویں روزے کی افطاری سے قبل اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے کہ دل بھرا تھا اور وہ رو پڑی تھی جب صابرہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نرمی و شفقت سے کہا تھا اور اذان کی آواز پر مجبور اس کی طرف بڑھایا تھا، افطار کے بعد اس نے مغرب کی نماز ادا کی تھی اور امجد کا نمبر ڈائل کیا تھا، تیسری نفل پر کال ریسیو ہو گئی تھی اور اس نے ہیلو بولا تھا اس نے سلام دعا کے بغیر کھانا شروع کیا تھا۔

”امجد! لوٹ آؤ کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے، میں بھٹک گئی تھی، میں غلطی پر تھی، مجھے میری غلطیوں، گناہوں کا اندازہ ہو گیا ہے، اللہ سے معافی طلب کر چکی ہوں، مگر اللہ مجھے جب تک معاف نہیں کرے گا جب تک تم مجھے معاف نہیں کر دو گے، میں تم سے بہت شرمندہ ہوں، امجد معافی مانگ رہی ہوں، معافی نہ دو، سزا دو، لیکن واپس آ جاؤ، میری نہیں، خالہ جان کی خاطر واپس آ جاؤ، ہم سب تمہارے منتظر ہیں، امجد! خدا کے لئے واپس آ جاؤ۔“ وہ بہت درود کر بولی تھی اور اس کی سنے بغیر لائن کاٹ دی تھی، پھر شدتوں سے رونے لگی تھی، فون کے اس پار کھڑا شخص ساکت کھڑا کاکھڑا رہ گیا تھا، اس کی ساعتوں میں بارہ کی گریو زاری، اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں، اس کے دل کو کچھ لگ گئے تھے، اور اس نے ہاتھ میں موجود سیل فون سے اسی وقت نمبرز ڈائل کئے اور واپسی کی سیٹ کنفرم کروانے لگا، اس سے کہہ دینے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا، لیکن بے قراری کے انداز بدل گئے تھے وہ آہوں پر چوٹنے لگی تھی، نگاہ دروازے پر جمائے آنسو گرنے لگتے، اس نے رمضان کے مہینے میں جتنی ممکن عبادت کر سکتی تھی کی تھی، اور اس کا بے قرار اور منہر دل سجدوں میں ٹھہر سا جاتا تھا، مگر

راقمیں بے قراری سے ہنسنے پر کوئی بدلے لئے گزر رہی تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے رمضان کا پورا مہینہ ختم ہو گیا تھا، چاند رات، بڑی اداس اور خاموشی سے سرکئی جا رہی تھی، آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے اور بے کئی و بے قراری تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی، وہ کافی دیر تک رونے کے بعد سوئی جا گئی سی کیفیت میں تھی کہ اداہ کھلے کمرے کا دروازہ کھلا، کمرے میں نیم تاریکی تھی، اس نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ نکلے میں منہ دئے لیٹی تھی، اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی تمام لائٹس آن کر دیں، کمرہ روشن ہوا تو وہ سوئی جا گئی سی کیفیت میں بھی چونک اٹھی، سیدی ہوئی تو ادھ کی نگاہ سے وہ سامنے نظر آیا، جسے وہ ہم سمجھ کر بھی جھٹک نہ سکی، تو پوری آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیکھتی ہی رہی، وہ اس کو پورے چھ ماہ بعد دیکھ رہا تھا، وہ اٹھی اور اس کے عین سامنے آرکے، چہرہ چھو کر شک کو یقین میں بدلا اور اس کے سینے میں سا گئی اس نے اسے ضبط سے رونے دیا اور اسے کافی دیر بعد جیسے ہی احساس ہوا وہ اس سے دور ہو گئی، ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا اور اس کے مسکرانے پر اس کی شرمندگی نے اس پر حملہ کر دیا تو اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”امجد! مجھے معاف کر دو میں بہت بری ہوں، تم جیسے اچھے انسان کے میں ہرگز لائق نہیں تھی، تم تو اللہ کا انعام تھے، جس کی میں نے قدر نہ کی، صورت پر برتری رہی، سیرت اور کردار کو اہمیت نہ دی اور اس کا انجام بھی دیکھ لیا، میں تم سے بہت زیادہ شرمندہ ہوں، کیا تم مجھے میری ہر غلطی کے لئے معاف کر کے مجھے اپنا لو گے.....؟“ وہ روتے ہوئے اپنی غلطیوں کا اور اس کی اچھائیوں کا اعتراف کر رہی تھی۔

”تمہیں معاف کر دیا ہے، بیٹا! جیسی تو پاکستان لوٹ آیا ہوں کہ جس دن تم نے وہ سب اماں کو بتایا تھا، مجھے تم پر غصہ تھا اور میں ملک ہی چھوڑ گیا تھا کہ اماں کے سامنے نہ خود کو صحیح ثابت کر سکا تھا نہ تمہارا

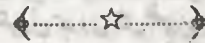
کب سے کروں شکر اور

ایک خراب ہوتے دیکھ سکتا تھا، مگر مجھے اس وقت زیادہ غصہ آیا جب تم نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ کیا میں نے سوچا تھا کہ میں تمہیں آزاد کروں گا اور جب میں نے اماں کو فون کیا تھا انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تم پر ظلم کرنے کی پاداش میں مجھے کبھی معاف نہیں کریں گی، میں لوٹ کر تمہیں خوشیاں دوں تمہارے حقوق ادا کروں، ورنہ وہ مجھے اپنا دودھ نہیں بخشیں گی، اماں کی بے انتہا سختی کے سبب میں نے طلاق کا ارادہ کینسل کر دیا لیکن واپسی کے لئے خود کو آمادہ نہ کر سکا اور یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ جو جیسا چل رہا ہے چلے دو جو ہوگا دیکھا جائے گا اس سبب میں کافی وقت گزر گیا، اماں نے بات تک کرنا چھوڑ دی پھر اللہ کو مجھ پر رحم آگیا اور تمہاری سوچیں بدل گئیں تمہارے ارادے بدل گئے تم نے لوٹ آنے کو کہا میں لوٹ آیا کہ تم سے خفا بھی ہوں، تم پر غصہ بھی ہوں تمہاری حرکتوں سے ناراض بھی ہوں، لیکن میں اس سب کے باوجود تم کو کوئی سزا نہیں دے سکتا کہ تم میری ماں کی خوشی ہو میری خوشی تو بہت پیچھے بہت پہلے ہی رہ گئی تھی رشتہ قائم تھا تو اماں کی وجہ سے اور رشتہ قائم رہے گا بھی تو اماں کی وجہ سے کہ میں تمہاری ہر تکی، نفرت اور ہر ایک بدتمیزی بھول سکتا ہوں معاف کر سکتا ہوں، بلکہ کر چکا ہوں، مگر تمہارا بھٹکا ہوا ایک قدم بھی برداشت نہیں ہے مجھے تم نے کہا لوٹ آؤ تم نے کہا اماں اور خدا کے لئے لوٹ آؤ میں فوراً آگیا اور تمہیں معاف بھی کر دیا، دل وسیع کر سکتا ہوں، نظر وسیع کر سکتا ہوں، نفرت اور مردانگی کو نہ تمہارے نہ اپنے پیروں تلے چل سکتا ہوں میں وہاں ہو کر بھی انجان نہ تھا اور تم میرے دل سے اس وقت اتر گئی تھیں جب تم نے میرے گھر کی دہلیز پار کی تھی اور احسان سے روابط بڑھائے تھے روابط کی نوعیت اور ٹوٹنے کے اسباب سے لاعلم ہوں، مگر تم میرے دل سے اپنا مقام کھو چکی ہو کہ تم نے میرے

نکاح میں ہو کر مجھ سے بے وفائی کی ہے اور میرے نزدیک بے وفائی کی کوئی معافی نہیں ہے۔ وہ یہ تذلیل ایک دفعہ تو بھول گیا تھا کہ اس نے اسے ٹھکرادیا تھا اور احسان کی حاجت کی تھی، مگر وہ یہ تذلیل اب نہیں بھول سکتا تھا کہ وہ اسی شخص کی خاطر اسے چھوڑنا چاہتی تھی اس کے بعد اس کی دعائیں اس کے حق میں اچھے ہی ثابت ہوئے تھے کہ امجد نے اس سے رشتہ توڑا نہ تھا اور جڑے ہوئے رشتے سے آگے ہر ایک اچھی امید رکھی ہی جاسکتی ہے۔

”تم نے ٹھیک کہا امجد! میرا قصور معافی کے لائق ہرگز نہیں ہے مجھے تمہاری سزا قبول ہے میں اللہ سے دعا کروں گی کہ وہ میرے مشکوک ہونے والے کردار کو تمہاری نگاہ میں ایک نہ ایک دن سرخرو ضرور کر دے آمین مگر تم یہ یقین ضرور رکھنا امجد کہ میں بھگتی ضرور تھی، مگر کرتے کرتے سنبھل بھی گئی ہوں میں نادانی کرنے چلی تو تھی، لیکن اللہ نے میری حفاظت کی تھی اور اسی لئے میں آج تم سے نظر ملانے کے قابل ہوں کہ میں نے تمہاری امانت میں کوئی خیانت نہیں کی ہے۔ وہ زنجی مسکراہٹ کے سنگ بولی تھی اور آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

”تم سفر سے آئے ہو فریش ہو جاؤ میں تمہارے لئے کھانا لے کر آتی ہوں۔“ صبح عید تھی اس کی عید کچھ اداس کچھ اطمینان کے ساتھ گزر گئی تھی وہ اسی پر خوش تھی کہ اس نے ات معاف کر دیا ہے اور اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس کے دل و نگاہ میں اپنا کھویا ہوا مقام بھی پالے گی یہ عید نہ کسی آگے ابھی اس نے امجد کے ساتھ بہت سی عیدیں دیکھنی تھیں کوئی تو عید اس پر مہربان ہوگی کہ اللہ اس پر مہربان تھا، بھٹکتے بھٹکتے اس کو تھام لیا اور جب اللہ مہربان ہو تو عرش اور زمین پر بسنے والے بھی مہربان ہو جاتے ہیں۔



رات سے بارش زد و شور سے جاری تھی تیز برستی بارش نے ہر شے کو بھگو کر رکھ دیا تھا، مسلسل ہوئی بارش نے غریبوں کا سکون اڑا دیا تھا، کچے اور کزور مکانوں میں رہنے والے غریبوں کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی کتنے ہی مکان ٹوٹ کر گرے، کتنی بستیاں ڈوب گئیں اور نجانے کتنے ہی لوگ اس تباہی کا حصہ بن کر زندگی کی بازی ہار بیٹھے، کلثوم کی جان بھی سولی پر لٹکی ہوئی تھی ان کے گھر کا شمار بھی غریبوں کے کچے مکانوں میں ہوتا تھا، چالیس گزر کا چھوٹا سا دور کمروں پر مشتمل یہ مکان اپنی غربت کی حالت خود بتا رہا تھا، کمرے میں ٹین کی چھت سے مسلسل پانی ٹپک رہا تھا، کلثوم تو ادھ موٹی ہو گئی، کمرے سے بارش کا پانی نکالتے ہوئے چھ عدد بچوں نے الگ پریشان کر رکھا تھا، ٹھیک سے نہ سونے کی وجہ سے سب ہی کی ریں ریں جاری تھی تھپ تھپ سب اوپر تلے کے چھوٹے چھوٹے، کلثوم کا غصہ سا تو اس آسمان سے باتیں کر رہا تھا، ایسے وقت میں اس نے کس کس کو کوئے سے نہ دیئے ہوں گے برستی بارش کو بجلی والوں کو جنہوں نے پیچھے چودھ گھنٹے سے بجلی بند کر رکھی تھی اپنے میاں کو جو بے خبر سو رہا تھا، بچوں کو غربت کو تقریباً اس وقت ایسا کوئی نہ تھا جسے اس نے کوسا نہ ہو ساری رات اسی فکر اور پریشانی میں کٹ گئی، بے بسی سے وہ ٹین کی چادروں سے نچلتے پانی کو دیکھتی تو دل خون کے آنسو روتا، جس دن سے وہ اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی

اس نے اس گھر میں صرف اور صرف غربت دیکھی، غربت میں آنکھ کھلی اور غربت میں ہی زندگی بسر ہوئی آ رہی تھی، مزدور باپ کی بیٹی مزدور کے ساتھ ہی بیابھی گئی، اب جبکہ صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا، دن رات سوائے اس غربت کو کوئے کے اس کے پاس کوئی اور بات نہ ہوتی، فجر کے قریب بارش تھی تو کچھ سانس میں سانس آئی، خدا کی رحمت اسے اب زحمت لگنے لگی تھی، دل و دماغ اب صرف اور صرف مٹی سوچوں میں گھرنے لگے تھے، صبح کی ہلکی ہلکی جب روشنی ہوئی تو وہ باہر صحن میں نکل آئی، یہ سوچ کر کے نجانے اب باہر کیا تباہی پھیلی ہوگی، بچے رو دھو کر تھک کر سو گئے تھے پر پریشانی سے اس کی آنکھوں کی نیند غائب تھی، جب وہ باہر صحن میں آئی اور صحن کی حالت دیکھی تو دل چاہا اپنا سر پیٹ لے یا پھر یہاں سے کہیں دور ایسی جگہ چلی جائے، جہاں صرف سکون ہی سکون ہو، جہاں ایسی غربت بھری زندگی نہ ہو، پر یہ صرف سوچنے کو ایک خوش کن خیال تھا۔

اس نے گہری سرد سانس بھری اور جھاڑو اٹھا کر ٹوٹے پھوٹے صحن کو صاف کرنے لگی تیز ہواؤں کے چلنے کی وجہ سے گلیوں کا کچرا گھر میں آ گیا تھا اور جہاں جہاں سے صحن ٹوٹا ہوا تھا، وہاں سے صفائی کرنا مشکل ہو گئی تھی، بڑی مشکل سے اس نے صحن صاف کیا پراتی آسانی سے ابھی اس کی مشکل ختم نہیں ہوئی تھی، بے ساختہ جب اس کی نظر دروازے پر پڑی تو صدمے سے

ارد گرد اس کے منڈلانے لگیں جب سوچتے سوچتے
تھک گئی تو بار کر پرانے لان کے سوٹ کے دوپٹے سے
آنسو پونچھے اور آٹا گوندھنے لگی آٹا کم ہونے کی وجہ سے
اس نے پھوٹے چھوٹے چڑے بنائے تاکہ روٹی
زیادہ بن جائے چائے کے طور پر صرف قبوہ ہی تیار
کر سکی تھوڑی دیر میں ٹکلیل کرے سے نکل آیا ٹکلیل
اپنی جمائیوں کو روکتے ہوئے اور آنکھوں کو مسلتے ہوئے
اس کے پاس آ بیٹھا۔

”ناشتے میں کیا بنایا ہے؟“ وہ اپنی مسلسل آتی
جمائیوں کو ہاتھ سے روکتے ہوئے بولا ٹکلیل کے بولنے
کی دیر میں وہ تو گویا پھٹ پڑی۔

”کیا بننا ہے وہی بنا ہے جو روز کھاتے ہیں پوچھ تو
ایسے رہا ہے جیسے مجھے بڑے پیسے دیئے ہوں مرغ مسلم
بنانے کے لئے“ وہ روٹیوں کو روٹی کے کپڑے میں
لپیٹتے ہوئے جلے کٹے لہجے میں بولی ٹکلیل کے ماتھے پر
تیوریاں نمودار ہو گئیں۔

”تو سودا کی ناشکری رہنا“ اس نے ہاتھ
جھٹکتے ہوئے کڑوے کیلے لہجے میں کہا۔

”ناشکری؟ تو مجھے یہ بتا یہاں ایسا کیا ہے یا تو
نے آج تک مجھے ایسا کیا دیا ہے جس پر میں شکر کروں
جس دن سے میں نے اس گھر میں قدم رکھا ہے سوائے
غربت کے میں نے کچھ نہیں دیکھا تھک گئی ہوں میر
یہ غربت بھری زندگی گزار کے نہیں ہوتا مجھ سے اب
مزید صبر“ وہ بھری بیٹھی تھی جس کا سارا ابال اب ٹکلیل
پر نکلتا تھا۔

”واہ... بول تو ایسے رہی ہے جیسے تو مخلوق سے آؤ
ہو جو یہ زندگی نہیں گزاری جا رہی یاد کر لے تیرے باپ
گھر میں بھی ایسی ہی غربت تھی“ وہ تھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”اسی کا تو دکھ ہے آخر خدا نے کیوں میرا مقدر بدتر
جیسا بنایا اگر دنیا میں ایسی زندگی گزارنی تھی تو کاش میں
پیدا ہی نہ ہوتی“ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی ٹکلیل
نے اسے زہریلی نگاہوں سے دیکھا اسے کبھی بھی اس

برا حال ہو گیا ہواؤں کے زور کی وجہ سے زنگ آلود
دروازہ تقریباً آدھا دیوار سے علیحدہ ہو گیا تھا ویسے بھی
دروازے کی حالت پہلے سے ایسی تھی کہ کوئی ہلکا سا بھی
دھکا مارا تو وہ اگلے پل زمین بوس ہو جاتا تھا اس لئے وہ
زیادہ تر دروازے پر پردہ ہی لٹکا کر رہتی تاکہ آنے
جانے والا ہر کوئی اسے استعمال نہ کرے ایسا وہ صرف
اس خوف سے کرتی تھی کہ اگر دروازہ ٹوٹ گیا تو اتنے
بھی پیسے نہ ہوتے کہ وہ اسے دوبارہ صحت کر دیا پاتے ظاہر
تھا مزدور شوہر صرف اتنا کہتا جس میں صرف وہ کھانا
کھا پاتے تھے۔

”چلو اچھا ہی ہوا“ اس روز روز کی فکر سے جان تو
چھوٹی اب گرا تو تیرا گرا“ وہ غصے میں بھنا کر بولی جتنا
وہ اس کے لئے فکر مند ہوتی اتنی ہی تکلیف ہوتی
تھی لہذا اب صبر کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا
سورج کافی حد تک طلوع ہو چکا تھا سورج کی کرنیں ہر
طرف پھیلنا شروع ہو چکی تھیں اس سے پہلے کہ سورج
سر پر پہنچتا اس نے سوچا جلدی جلدی ناشتہ بنالے ساتھ
ہی وہ دوپہر کے لئے بھی کچھ نہ کچھ بنالیتی ویسے بھی کونسا
اس نے کھانے کے لئے اہتمام کرنا ہوتا تھا زیادہ تر
دال یا آلو ہی پکے تھے وہ مگن میں بنے ٹیمپری پکن
میں آئی چولہے کو سیدھا کر کے رکھا جو کہ بارش کی وجہ
سے اس نے اندر رکھ دیا تھا گیس سیلنڈر کے ساتھ
چولہے کا گیس بائپ جوائنٹ کیا روٹی بنانے کے لئے
جب اس نے آنے کا ڈبہ کھولا تو اس میں باشکل پانچ
روٹیوں کا آٹا تھا جو کہ آٹھ افراد کے لئے نہ کافی تھا اور
اگر ابھی یہ استعمال کر لیتی تو دوپہر اور رات میں کیا بناتی
اس نے ایک ایک کر کے دال چاول اور مسالوں کے
سب ڈبے چیک کر لئے سوائے پتی اور تھوڑی سی چینی
کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا اس کی آنکھیں بھگ گئیں اپنی تو
اتنی نہیں پر بچوں کی فکر تھی ابھی تو کچھ نہ کچھ کر کے انہیں
کچھ کھا دے گی پردوپہر اور رات میں کیا کرے گی پتا
نہیں ٹکلیل کو آج کوئی مزدوری ملنی بھی کب نہیں ٹکلیل



یہ ناشکری اچھی نہ لگتی تھی۔

”بس روتی رہنا اور ہمیشہ ناشکری کرتی رہنا اسی وجہ سے تو آج ایسی زندگی گزار رہی ہے۔“ وہ بولتا ہوا غسل خانے میں مہس گیا، پیچھے سے وہ روتی رہی۔ تھوڑی دیر میں بچے بھی اٹھ آئے اور بھوک بھوک کر نے لگے ان سب کو ناشکر کرانا بھی کسی مشکل سے کم نہ تھا ایک روٹی کے پیچھے سب ایسے لڑتے جیسے جیل کو سے گوشت کے ٹکڑے کو پھیننے کی کوشش کرتے تھے۔

”مت لڑو نخوس مارو کم از کم کھانا تو ذہنگ سے کھالیا کرو۔“ اس نے ایک دودھو کے سب کو جڑ دیئے۔

”اماں! اس نے میرا حصہ لے لیا ہے۔“ بڑے والے نے اپنے سے چھوٹے کی فوراً شکایت کی جو سب میں شاطر تھا۔

”اماں! جھوٹ بول رہا ہے میں نے نہیں لیا۔“

چھوٹے نے فوراً اپنی صحیح کی۔

”مت لڑو کوئی زیادہ بولا تو مار مار کر حشر بگاڑ دوں گی۔“ اس نے روٹی اور چائے کی پیالیوں سے کھیاں اڑاتے ہوئے جھڑکا۔ ٹکلیل تیار ہو کر جانے لگا تو اس نے پیچھے سے نکارا۔

”ناشہ تو کر لے۔“

”اونہہ۔۔۔ تیری نکو اس سے میرا پیٹ بھر گیا ہے۔“ وہ غصے میں بھنکا کر بولا۔

”کیوں ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟“ وہ بھی تلملائی۔

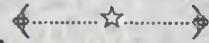
”یہ تو خود سے پوچھ۔“ وہ کہہ کر پلٹنے لگا تو اس نے بھر پکارا۔

”راش سارا ختم ہے نہ دوپہر کے لئے کچھ ہے نہ رات کے لئے اور نہ اگلے کئی دنوں کے لئے اور یہ بچہ دروازہ آج اس نے بھی دم توڑ دیا ہے۔“ وہ سخت لہجے بولی، ٹکلیل غصے میں بھناتے ہوئے نکل گیا۔

کی طویل لسٹ تھی اور دو پیسہ جیب میں نہ تھا، بے میں سوائے کڑھنے کے اور کچھ کبھی نہیں سکتا تھا، بچے سے وہ غصے میں برتن جتنے لگی۔

”ساری مصیبتیں میری جان کو ہیں خود تو چلا کر مزے سے جان تو میری لکھی ہے سوئی پر کیا دلوں کی کھانے کو ان کو مانگیں گے تو مجھ سے ہی۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی صبح سے شام ہونے کو ابھی بھی بچے سارا دن بھوک سے روتے رہے خود وہ بھی روتی رہی اور کڑھتی رہی سوائے کڑھنے کے اسے اور کچھ نظر بھی نہیں آ رہا تھا کتنی ہی دیر سے وہ دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی ٹوٹا پھوٹا بچہ دروازہ اپنی بے قدری کا ردِ نار و رہا تھا اس گھر میں کوئی بھی تو ایسی چیز نہ تھی جس کو دیکھ کر وہ خوش ہو سکتا تھا اب اسے حقیقت میں احساس ہو رہا تھا آخر کیوں آئے دن لوگ غربت سے تنگ آ کر خود کشیاں کر لیتے ہیں حقیقت میں تو اس وقت اس کا بھی یہی دل کر رہا تھا پیٹ میں جو بھوک کی آگ لگی تھی اسے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا یہ آگ اس وقت زیادہ بھڑک اٹھی جب بچوں کو بھوک سے روتا دیکھتی اس وقت اس کا بس نہ چلتا وہ کیا ایسا کرے جس سے ان کی بھوک مٹا دے کتنے ہی کھنے گزر گئے تھے سوچتے سوچتے بچے بھی صحن میں اس کے پاس روتے روتے سو گئے تھے۔

”پتا نہیں آج رات یونہی بھوکے پیٹ سو جانا تھا کچھ کھانے کو ملے گا بھی نجانے ٹکلیل کو مزدوری ملی بھی ہوگی کوئی کئے نہیں یا اس نے بھی خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔“ سیاہ آسمان پر نظریں جمائے سوچ سوچ کے اس کو دماغ مفلوج ہو رہا تھا اپنی قسمت اس سیاہ آسمان جیسی ہی لگ رہی تھی جس میں سوائے اندھیروں کے اور کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا پر سیاہ آسمان پر روشنی کی جھوٹی سی کرن لئے چاند ستارے جھلکاتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس اندھیرے پردہ غالب ہونے کی کوشش کر رہے ہوں اور یہ تاریکی رات بھی بھلا کب تک رہتی ہے۔



دروازے پر ہلکا سا کھکا ہوا تو اس نے فوراً چونک کر دروازے کی طرف دیکھا، ٹکلیل تھکا ہارا ٹکلیجے سے حملے میں اندر داخل ہوا اس کی نظر فوراً ٹکلیل کے ہاتھوں پر

پڑی جس میں اس نے کچھ تھیلیاں پکڑی ہوئی تھیں جن میں کیا سامان تھا یہ تو اسے سمجھ نہ آیا پر یقین تھا وہ کچھ کھانے کو لایا تھا وہ فوراً اٹھ کر اس کی طرف لپکی اور بناء اس کی خیریت دریافت کے اس پر چڑھ دوڑی۔

”یہ کوئی وقت ہے تیرے گھر آئے کا؟ دوپہر سے بھوکے پیٹے ہیں ہم پر کچھ کیا ہم جنس یا میریں.....؟“

”ہاں تو میں کون سا عیاشی کر کے آ رہا ہوں تم لوگوں کے پیٹ بھرنے کے لئے اپنی ہڈیاں توڑتا ہوں پر تجھ جیسی بے صبری اور ناشکری عورت کو کیوں احساس ہوگا میاں باہر سے تھکا ہارا آیا ہے بجائے اس کی خیریت پوچھنے کے اس کو پانی دینے کے اپنی چڑچڑ شروع کر دی۔“ وہ صحن میں رکھی کڑھری چار پائی پر بیٹھتے ہوئے غصے میں بولا اتنے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے تھیلیاں سائیز پر رکھیں۔ آگے سے کلثوم منہ میں بڑبڑانے لگی اور جھٹ سے چار پائی سے تھیلیاں اٹھا کر چپک کر نکلے گی۔

”یہ کیا بس تو پکانے کے لئے یہ دال چاول لایا ہے گھر میں سارا راشن ختم ہو گیا ہے ابھی یہ بنا کے کھالیا تو کل کیا بناؤں گی.....؟“ اس کا خالی کچے دال چاول دیکھ کر پارہ سا تو اس آسمان پر چڑھ گیا، ٹکلیل کے ماتھے پر تیریاں نمودار ہو گئیں اس کی بات سن کر سارا دن کس مشکل سے صرف اتنا کھا تھا کہ خالی دال چاول خرید سکا اس کا اندازہ صرف اسے ہی تھا سرکوں پر پیدل چل چل کے اس کا جم درد سے جو چور ہو رہا تھا اور جب اوپر سے کلثوم کا منہ بنتا ہوا جب دیکھا تو تکلیف کی شدت اور بڑھ گئی۔

”دفع ہو جا میری نظروں سے جولا کر دیا ہے ناں سیدھی طرح پکالے یہ میں جانتا ہوں اور میرا خدا کے کس مشکل سے میں بے لگ آ ہوا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں اتنا غصہ اتر آیا تھا کہ ایک پل کے لئے کلثوم بھی کچھ گھبرا گئی تھی اس لئے خاموشی سے دال چاول پکانے چلی گئی تھی دیر میں کھانا تیار ہوا وہ مسلسل بڑبڑاتی رہی غربت کو کستے کستے اب جیسے وہ خود بھی کھنے لگتی تھی۔

ٹکلیل نے ایک سرد آہ بھر کر صحن میں فرش پر لیٹے

اپنے بچوں کو دیکھا جو بے خبر سو رہے تھے اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی نجانے انہوں نے سارا دن کیسے بھوک کاٹی ہوگی کیا اس کا دل نہیں کرتا تھا اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے کو جتنا اس سے ہو پاتا تھا وہ کرتا تھا ہر قسمت کے آگے خود کو بے بس پاتا، مہنگائی جوں جوں بڑھتی جا رہی تھی حالات اتنے ہی تنگ ہوتے جا رہے تھے پر وہ اس کے باوجود خدا کی ذات سے مایوس نہ تھا جتنا ہو سکتا تھا وہ اپنے طور پر کوشش کرتا رہا تھا اس کی کتنی خواہش تھی اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کی۔ اس کی سمجھ بھی اسے تب آئی تھی جب خود کو رلتا ہوا دیکھا وہ پلٹیں سیٹ کر رہی تھی جب ٹکلیل نے اسے بغور دیکھا کیسی کھلتا ہوا گلاب تھی وہ جب وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی اور اب غربت نے تنگ دستی نے اس کی خوبصورتی تو خوبصورتی چہرے کی خوشی بھی چھین لی تھی اسے یاد پڑ رہا تھا پچھلے کچھ عرصے سے وہ مکمل کرکے مسکرائی ہوئی کہاں تو وہ زندگی سے بھرپور کھلکھلاتی ہنسی مسکرائی تھی سنوڑی سی رہتی تھی اور اب تو وہ ایک جوڑا مستقل چڑھائے رہتی جس کی رنگت دھو دھو کر نہیں کھو گئی تھی شاید اسی طرح وہ خود بھی نہیں کھو گئی تھی۔

کلثوم نے کھانا لگانے کے بعد بچوں کو اٹھایا، بچے گہری نیند سے آنکھیں ملنے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور سامنے لگے کھانے کے دسترخوان کو دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، بھلے کوئی مرغ مسلم نہ تھا پر بھوکے پیٹ کو بھرنے کے لئے یہ مرغ مسلم سے انہیں کم نہ لگا، بچے قنات کھانے پر ٹوٹ پڑے بچوں کی افرا تفری دیکھ کر کلثوم انہیں جھڑکنے لگی بچوں کو کھانا دینے میں وہ اتنی مشغول ہوئی کہ اسے ٹکلیل کی خبر ہی نہ رہی

اس کی یاد آنے پر اس نے چونک کر سانس کی طرف دیکھا جہاں وہ چار پائی پر بیٹھا خاموشی سے اسے ہی ایک تک دیکھ رہا تھا، کلثوم کو اس کا خاموش اور اداس چہرہ کہیں کھویا ہوا لگا۔

”تو کیوں اتنا خاموش بیٹھا ہے آکے کھانا کھا۔“ وہ اپنے مخصوص کرک انداز میں بولی تو وہ چونک اٹھا۔

”ہاں..... آتا ہوں ہاں ہاں منہ دھو کر۔“ وہ چپ چاپ کہہ کر اٹھ گیا، کلثوم کا دل ڈوب سا گیا، ٹھیک کے اداس چہرے کی وجہ جانتی تھی پر کیا کیا جاسکتا تھا یہ سوچ کر وہ بچوں کی پلیٹ بھرنے لگی۔

☆.....☆

ماہ و سال چپ چاپ مڑکتے جا رہے تھے ان کی زندگی کا وہی معمول تھا، ابھی ایک وقت پیٹ بھر کے کھانا کھالیا، تو دو وقت بھوک کا نئی پڑنی اور اگر خوش نصیبی سے تین وقت کا کھانا مل جاتا، تو اگلے دنوں کا پیمانہ ہوتا کلثوم کے مزاج میں کئی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، ٹھیک بھی اس کی اس عادت سے بیزار بنے لگا تھا۔

شام کا پہرہ تھا جب وہ رات کا کھانا پکانے کے لئے آلو چھیل رہی تھی، بچے کچلے میں کھیلنے گئے تھے اس لئے گھر میں بھی امن و سکون تھا، وہ خاموشی خالی ذہن آلو چھیلے جا رہی تھی اب وہ کسی بھی بارے میں زیادہ نہیں سوچتی تھی ماپوسی نے اس کے اندر مضبوط ڈیرے جمائے تھے اس لئے زندگی کی کوئی خوشی اور رقت اس کے اندر اب موجود نہ تھی، اب تو جیسے وہ ان حالات سے سمجھوتا کرنے لگ گئی تھی، دروازے پر پلکا سا کھڑکا ہوا تو وہ چونکی۔ سانسے سے

نورال دروازے پر لٹکے ہوئے پردے کو پھٹائی ہوئی اندر داخل ہوئی، نورال اس کی پڑوسن کی کم و بیش اس کے حالات بھی اسی کی طرح تھے تقریباً اس غریب محلے میں رہنے والے سبھی کی زندگی تنگ دہنی کا شکار تھی۔

”خیر تو ہے نورال! آج بڑے دنوں بعد آنا ہوا اور یہ کیا ہے.....؟“ نورال اس کے پاس چار پائی پر بیٹھ گئی، کلثوم نے اس کے بیٹھے ہی فوراً اس کی حیرت دریافت

کی ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں ایک جھوٹی سی پیالی کر چونکی جس پر پلیٹ ڈٹکے ہوئے کی وجہ سے معلوم ہو سکا اندر کیا ہے، نورال اس کو دیکھ کر دھیمسا سا مسکرا اور پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔

”یہ میں نے نیاز دلوائی تھی محلے میں بانٹنے لگی سو چاہیے پہلے اپنی پیالی اور پڑوسن کو دوں، وہ بھی کچھ دینے میں پڑوسنوں کا حق پہلے ہوتا ہے۔“

نورال نے رسانیات سے کہا، کلثوم نے پیالی اس کے ہاتھ سے لے کر تھامی، کلثوم کو تو اس کے انداز و اطوار پر رسانیات ہی نہ آ رہا تھا، وہ نورال جس کے گھر میں کھانے پینے نبھانے کتے جھگڑے ہوتے تھے وہ لوگ جو پائی پائی ترستے تھے آج وہ محلے میں کھیر بانٹتی پھر رہی تھی اسے یہ کسی مجرے سے کم نہ لگ رہا تھا۔

”نورال! یہ تیرے حالات اچانک کیسے سدھر گئے؟“ نورال کی کوئی اچھی نوکری لگ گئی ہے.....؟“

نورال نے اپنا اندازہ لگایا۔

”نہیں نوکری تو نہیں لگی پر مجھے خدا پر یقین ہے انشاء اللہ بہت جلد لگ جائے گی۔“ نورال پر یقین ہو

”نورال! مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، اگر بھائی کی نوکری نہیں لگی تو تو یہ کھیر کیوں بانٹتی پھر رہی ہے؟“

مطلب ہے تیرے گھر کے حالات تو ایسے ہیں جہاں تین وقت کا پورا کرنا مشکل ہے وہاں محلے والوں کے لئے گنجائش نکالنا تو بہت مشکل ہے۔

”بس کلثوم! گنجائش نکلتی نہیں ہے نکالنی پڑتی اور جب انسان ایک بار جی نیت کرے تو اللہ تعالیٰ بخود راستے بنا دیتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تو کلثوم

اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا، اسے آج نورال بڑی بدلی بدلی لگی، کہاں تو وہ ہر وقت گھر کے حالات کا رونا روٹی رہتی تھی اور آج اتنی صابر اور شاکر اچانک اس کے اندر کا بدلاؤ اسے سمجھ نہ آیا۔

”نورال! آج تو بڑی بدلی بدلی سی لگ رہی

”نورال کلثوم کی حیرت پر دھیمسا سا مسکرا رہا ہے۔“ نورال کلثوم کی حیرت پر دھیمسا سا مسکرا رہا ہے۔“

”اچھا ایسی کیا سید لی دیکھ لی تو نے مجھ میں.....؟“ ”کہاں تو؟ تو ایک روپے کے لئے ترستی تھی اور اب ایسی صابر اور شاکر۔“ کلثوم نے بنا لگی لپٹی کے صاف کہا۔

”بس کلثوم! خود پر افسوس ہوتا ہے بڑا غلط کیا میں نے جو اس خدا کی ذات پر یقین نہ رکھا، بھٹک گئی تھی میں یہ اسی کی مہربانی ہے جس نے مجھ ادنیٰ سی انسان کو ہدایت دی اگر وہ نور بی بی کو ذریعہ نہ بناتا تو شاید پتہ نہیں میرا کیا ہوتا۔“ نورال سنجیدگی سے بولی۔

”نور بی بی.....؟ کون.....؟ نورال۔“ کلثوم نور بی بی کے نام پر چونکی۔

”منہر میں تجھے پوری بات بتاؤں، ایسے تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“ نورال نے کلثوم کے نہ سمجھنے والے انداز کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”اصل میں پچھلے دنوں میرے گھر کے حالات بہت زیادہ ہی خراب ہو گئے تھے رشید کو کئی دن مزدوری نہیں ملتی تھی بچوں کو بھوک سے بے حال دیکھ کر میرا کچا سینے والا ہو جاتا، بس پھر میں نے تہیہ کر لیا، رشید کو کوئی کام ملے یا نہ ملے پر میں اپنے بچوں کو بھوکا مرنے نہیں دوں گی، اس لئے میں نے لوگوں کے گھر مغانی کا کام شروع کر دیا، پر کام کرنے کی وجہ سے کلثوم میں اتنی

تھک جاتی کہ نہ جانے غصے میں کیا کیا بولتی، اسی وجہ سے رشید سے میرا آئے دن جھگڑا رہتا، غربت کو کوستے میں تھکنے لگی تھی، نہ جانے خدا سے کتنے شکوے کئے جن کا کوئی

حساب نہیں پھر ایک دن جب میں نے نور بی بی کی درس میں باتیں سنیں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، سچ کلثوم! نور بی بی واقعی اللہ کی بڑی چٹکی بندی ہے، اتنی اچھی باتیں بتاتی ہیں کہ دل کرتا ہے بندہ ستارے لوگ تو ان سے خصوصی دعا کرتے ہیں ان کی باتوں کا اثر

ہے کہ آج مجھے احساس ہوا ہے، ہم واقعی بڑے ناشکرے ہیں جتنا مل جائے کم ہی لگتا ہے۔“ نورال نے

نورال نے

کھوئے ہوئے انداز میں کہا، پر کلثوم کی سوئی نور بی بی پر ہی ایک گئی تھی اس کے ذہن میں صرف اتنی بات سا سکی کہ وہ نورال جو پائی پائی کو ترستی تھی آج کھیر بانٹتی پھر رہی ہے تو یقیناً کوئی تو انہوں نے نورال کو ایسا جادو بتایا ہوگا، جو اس کے حالات اتنے بہتر ہو گئے۔

”پر یہ نور بی بی ہے کون.....؟ تیری ملاقات کیسے ہوئی ان سے.....؟“ کلثوم نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”اصل میں میں جس باجی کے گھر کام کرتی ہوں ناں وہ انہی کی ماں ہیں کافی اللہ لوگ ہیں، جمہرات کے جمہرات ان کے پاس درس ہوتا ہے جس میں وہ غریبوں کو نیاز بھی تقسیم کرتی ہیں بڑے لوگ آتے ہیں ان کے پاس کتنے ہی لوگ اپنے مسائل بھی انہیں بتاتے ہیں اور وہ بڑے طریقے سے ان کے حل بتاتی ہیں انہیں پتا ہے

جب میں نے بڑی ماپوسی سے نور بی بی سے اپنے گھر کے حالات کا رونا دیا تو انہوں نے صرف مجھے اتنا کہا نورال رب کا شکر ادا کرو جو مانگتا ہے، صرف اس سے

ماگو اور صدقہ خیرات ضرور کر، بس پھر اللہ کرم کرے گا، یقین جان کلثوم وہ دن اور آج کا دن اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہمارے گھر میں رزق کی بڑی برکت پیدا ہو گئی ہے۔“ نورال نے سنجیدگی سے کہا۔

”نورال! تو مجھے بھی اس نور بی بی کے پاس لے چل۔“ کلثوم نے چل کر کہا اسے لگا شاید ایک نور بی بی ہی ہے جو اس پر کچھ کرم کر دے۔

”ہاں ہاں! میں نہیں کل جمہرات ہے ناں تو چلی چلنا میرے ساتھ۔“ نورال اس کے خیالات سے انجان بولی۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں کلثوم! مغرب کی اذان ہونے والی ہے نماز کی تیاری بھی کرتی ہے اور پھر اور لوگوں کے ہاں بھی تو کھیر بھجوانی ہے۔“ نورال رسانیات سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، کلثوم اس کے نئے روپ پر بڑی حیران تھی جب تک نورال اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی وہ اسے جاتا تکتی رہی۔

☆.....☆

☆.....☆

اگلے دن کلثوم کا فی پر جوش تھی، امید کی ایک کرن جو نظر آ رہی تھی وہ اور نور اس عصر کے وقت وہاں پہنچنے عورتوں کا جھوم بھرا ہوا تھا وہاں جہاں درمیانے اور بڑے طبقے کی عورتیں موجود تھیں درس کے وقت وہ دونوں بھی ایک کونے میں بیٹھ کر نور بی بی کو سننے لگیں جیسا نور اس نے کہا تھا واقعی نور بی بی کو ویسا ہی پایا ایسا نورانی اور معصوم چہرہ اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا، لپکا گلابی رنگ کا چکن کا سوٹ زیب تن کئے ہوئے جس کے ساتھ سفید بڑی سی چادر انہوں نے اوڑھی ہوئی تھی سادے سے لباس میں بھی وہ یوں لگ رہی تھیں جیسے ہند سب میں قیمتی مونی، عورتوں کے جھرمٹ میں وہ یوں بیٹھی تھیں جیسے کوئی پہیلی اپنی سکھویں سے باتیں کر رہی ہو، واقعی خدا کی کسی کے چہرے پر اتنا نور عطا کرتا ہے یہ احساس اسے نور بی بی کو دیکھ کر ہو رہا تھا، جتنی دیر درس ہوتا رہا وہ بس نور بی بی کا جائزہ ہی لیتی رہی شاید ہی اس نے غور سے ان کی کوئی بات سنی ہو، بس اسے جلدی تھی تو اس بات کی کہ وہ جلدی سے اسے وہ راز بتا دیں جو انہوں نے نور اس کو بتایا تھا۔

ہوں۔“ انہوں نے رسانیت سے کہا تو وہ انہیں ہکا بکا دیکھنے لگی۔

”ایسا کیوں کہہ رہی ہیں بی بی! آپ تو اللہ کی بڑی چٹکی بندی ہیں۔“ نوراً نے فوراً کہا۔

”یہ تو تم سوچتی ہو نوراً! اصل میں تو وہ مالک جانتا ہے اچھا کون ہے برا کون ہے۔“

”بی بی! آپ مجھے غلط سمجھی ہیں اصل میں میرا مطلب تھا اگر آپ میرے لئے دعا کر دیتیں تو۔“ کلثوم نے فوراً اپنی بات کی تصحیح کی۔

”کیوں بیٹی! میرے دعا کرنے سے کیا ہوگا.....؟“ کلثوم کو ان کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی وہ حیرت سے انہیں غمگین باندھ کر دیکھنے لگی نور بی بی اس کی کیفیت سے واقف تھیں اس لئے انہوں نے نرمی سے کلثوم کے سر پر ہاتھ رکھا۔

پلٹوں میں ڈال کر دی، بچے اتنے عرصے بعد بریانی دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سارے تھے، جبکہ خود اس نے بے دلی سے دو چار لقمے لئے اور اٹھ گئی، ٹکلیل کو بڑی حیرت ہوئی کہاں تو وہ بھوک بھوک کرتی رہتی تھی اور آج بریانی سامنے ہونے کے باوجود اس نے پیٹ بھر کے بھی نہ کھائی، ٹکلیل نے محسوس بھی کیا آج وہ بڑی چپ چپ تھی پراس نے اس سے کچھ پوچھا نہیں۔

رات کا آدھا پہر ہوگا، وہ سب لوگ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے صحن میں سو رہے تھے، ٹکلیل کے خرانے پورے صحن میں گونج رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور دماغ بالکل خالی، جیسے اسے کوئی سوچ ہی نہ ہو یا شاید وہ کچھ سوچنے سے ڈرتی تھی نجانے خود سے کیا کیا اعتراف کرنے پر جاتے پوری رات بے چینی سے اس کی کرڈیں لیتے گزر گئیں۔

اس کی گردن جھکتی ہی چلی گئی اور رو کر اپنے عمل کی معافی مانگتی رہی کیسے وہ زندگی کو برا بھلا کہتی رہی کیسے کس زبان سے وہ اس کی ناشکری کرتی رہی یہ سوچ سوچ کر اسے دکھ ہو رہا تھا اور وہ اتنا غمور ورجم تھا اس نے نہ ہی تو اس کی ناشکری پر اس سے زبان چھین لی نہ ہی اس کی غلطیوں پر اس پر ظلم کئے یہ اس کی رحمت و شفقت ہی تھی جو وہ اس کے کسی بھی عذاب سے محفوظ تھی۔

دن رات اس کے انہی سوچوں میں گزرنے لگے کوئی بل ایسا نہ گزرتا جس میں وہ خدا سے معافی نہ مانگتی اس کا دن پہلے سے کہیں زیادہ پرسکون ہو گیا تھا اگر ایک وقت کھانا نہ بھی ملتا تو اسے یقین تھا وہ انہیں بھوکا نہیں مارے گا یہ یقین ایسا یقین تھا جس سے دل و دماغ دونوں پرسکون ہو گئے تھے۔ اس نے نوراں سے بات کی کہ وہ اسے بھی کام کے لئے دو تین گھر دلوادے ٹکیل کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو وہ چپ سا ہو گیا۔

☆.....☆.....☆.....
رمضان کا بارگرت مہینہ شروع ہوا تو ہر طرف رونق کا سا سماں ہو گیا ہر کوئی اس مہینے کی برکتیں سینے کے لئے عبادتوں میں مصروف رہتا کٹھوم کے گھر میں افطار میں بھی دال اور روٹی ہی ہوتی پر اب کی بار اس کے دل میں اعلیٰ قسم کے پکوان کی کوئی چاہ نہ ابھی پر ٹکیل کے چہرے پر دکھ تھا وہ بیوی بچوں کو اچھا کھانا چاہتا تھا۔

پہلا عشرہ گزرا تو باقی دو عشروں کا پڑہ ہی نہ چلا اس رمضان اس نے خوب دل لگا کر عبادت کی اور شوہر بچوں کی سلامتی کی دعا میں مانگیں عید میں تین دن باقی رہ گئے تھے اور بچوں نے اس کی جان کھار کھی گئی عید کے لئے انہیں بھی نئے کپڑے دلوائے جواباً وہ خاموش رہتی تو وہ اور واویلا مچاتے ٹکیل نے بچوں کو جھوٹی تسلیاں دیں تو وہ غصہ ہو گئی۔

”کیوں جھوٹی تسلیاں دیں تو نے بچوں کو.....؟“
”جھوٹی تسلی نہیں دی میں نے،“ کوشش کروں گا عید سے پہلے اتنی دباؤ لگا لوں جس سے بچوں کو عید کی

تاری کروادوں۔ ٹکیل اس سے کہتے ہوئے آنکھ نہ ملا سکا اس لئے کہہ کر فوراً اٹھ گیا جواباً وہ خدا بہتری کی دعا مانگنے لگی۔

☆.....☆.....☆.....
عید کا چاند نظر آ گیا تھا ہر طرف رونق کا سماں باندھ گیا ہر کوئی عید کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا تھا کٹھوم صحن میں دیوار سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھی تھی بچے صحن میں کھیلتے ہوئے عید پر پہننے والے کپڑوں پر دستک کر رہے تھے جو ان کے خیال میں ان کے ابا ساتھ لے کر آئیں گے کٹھوم معصوم چہروں پر پھوٹی مسکراہٹ کو بغور دیکھ رہی تھی ساتھ سوچ رہی تھی کیا ہوگا جب بچے ٹکیل کے خالی ہاتھ دیکھیں گے وہ بھی کچھ نہ کر سکی ان کے لئے نوراں سے اس نے کہا میں تمہاں کے لئے کوئی کام ڈھونڈ دے پر اس نے بھی ابھی تک کچھ نہ بتایا تھا رات کے بارہ بج گئے پر ٹکیل کا کچھ اتنا پتا نہ تھا اتنی دیر تو اس نے کبھی نہیں کی تھی کٹھوم کو لگ رہا تھا بچے نیند سے جھوم رہے تھے پر عید پر پہننے والی چیزوں نے انہیں جگا رکھا تھا کہ کب چیزیں آئیں اور وہ انہیں دیکھ کر اطمینان سے سو جائیں کٹھوم بے چینی سے ٹھہرنے لگی گھڑی گھڑی دروازے پر سے پردہ ہٹا کر نگلی میں جھانکتی رہا وہاں ٹکیل کو نہ دیکھ کر دل اور ہولنا رات کے دو بجے ٹکیل گھر میں داخل ہوا اسے دیکھ کر کٹھوم کی سانس میں سانس آئی۔

”یہ کوئی وقت ہے ٹکیل! تیرے گھر آنے کا جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی میری۔“ اس کے لہجے سے فکر عیاں تھی جسے ٹکیل نے واضح محسوس کیا ٹکیل اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیا وہ کہہ کر جلدی سے اس کے لئے پانی لینے چلی گئی اور جب آئی تو دیکھ کر چونک گئی بچے نجانے کب کمرے سے نکل آئے تھے جبکہ وہ ان کو سلانے کے لئے لٹا کر آئی تھی اور اس سے زیادہ حیرت کا جھٹکا بچوں کے ہاتھ میں عید کے کپڑے جو تے اور مختلف سامان دیکھ کر ہوئی۔

”ٹکیل! یہ سب کہاں سے اتنے پیسے آئے تیرے

پاس.....؟“ اس نے ٹکیل کو پانی کا گلاس دیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔
”چلو بچو! اپنا اپنا سامان سمیٹو اور جا کر سو جاؤ صبح پھر جلدی اٹھنا بھی ہے۔“ ٹکیل نے فی الحال کٹھوم کا جواب نہ دیا۔

”نہیں ابا! ابھی نہیں۔“ سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔
”سنائیں تم لوگوں نے کیا کہہ رہے ہیں تمہارے ابا جا کر سوور نہ لگاتے ہوں دو ہاتھ۔“ کٹھوم نے بچوں کے اڑ جانے پر بخنی سے کہا تو وہ لوگ شرافت سے اٹھ گئے۔ ان کے جاتے ہی کٹھوم ٹکیل کے برابر چار پائی پر آ کر بیٹھ گئی اور ایک نظر چیزوں پر ڈالی جس میں راشن بھی شامل تھا اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی اتنا سب لینے کے لئے اس کے پاس آخر پیسے آئے کہاں سے۔
”اب بتا مجھے آخر تیرے پاس اتنے پیسے آئے کہاں سے.....؟“

”کٹھوم اب سمجھ ہمارا مشکل وقت ٹل گیا۔“ ٹکیل نے کہتے ہوئے پانی کا گلاس حلق میں اندھا اور اس ایک وقفے میں کٹھوم کی بے چینی مزید بڑھنے لگی ٹکیل نے پانی پینے کے بعد ٹکیل کا گلاس چار پائی کے نیچے رکھا اور بات کو آگے بڑھایا۔

”آج صبح جس گھر میں مجھے مزدوری ملی وہاں اس گھر کی بیگم صاحبہ نے مجھ سے پوچھا کیا میں اس کے پارلر کے باہر چوکیداری کروں گا ساتھ چودہ ہزار مہینہ کی تنخواہ کا کہا تو میں نے ایک منٹ نہ لگا مانع کرنے میں انہوں نے مجھے ایک مہینے کا ایڈوانس بھی دے دیا بس پھر سارا دن ادھر ادھر مزدوری کرنے کے بعد مغرب کے بعد میں سیدھا بازار چلا گیا وہاں سے گھر کے لئے راشن لیا اور پھر بچوں اور تمہارے لئے کپڑے لئے اس لئے آنے میں دیر بھی ہو گئی تو یہ دیکھ کر ابا بتاتے یہ سوٹ اور چوڑیاں کیسی لگیں.....؟“ ٹکیل نے تفصیل بتاتے ہوئے شاپر میں سے ایک جھلملاتا ہوا لال جوڑا نکالا ساتھ ہم رنگ چوڑیاں بھی کٹھوم کے یہ دیکھ کر

چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے۔
”بتا کیسا لگا تجھے پسند آیا.....؟“ ٹکیل نے اشتیاق سے پوچھا۔
”بہت خوبصورت ہے۔“ اس نے ریشمی جوڑے پر ہاتھ بھیرتے ہوئے کہا۔
”ہاں پر تجھ سے زیادہ نہیں۔“ ٹکیل نے اسے چھیڑا تو وہ جڑ بڑی ہو گئی۔

”اچھا خیر چھوڑ یہ بتا سارے پیسے خرچ کر دیئے یا کچھ بچا یا بھی.....؟“ کٹھوم نے فوراً بات بدلی۔
”تو کیوں فکر کرتی ہے یہ تیرا مسئلہ نہیں ہے۔“ ٹکیل نے اسے تسلی دی۔
”کیسی باتیں کر رہا ہے فکر تو ہوتی ہے نا اور تیرا کیا پتہ تو نے سارے پیسے خرچ کر دیئے ہوں۔“

”اوہ..... یہ کیا فکر میں کر بیٹھ گئی ہے خوشی کا موقع ہے کچھ اچھی بات کر۔“ ٹکیل نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا کدھر چل دی.....؟“ ٹکیل کو حیرت ہوئی۔
”ہلے تجھے کھانا ڈال دوں باتیں تو ہوتی رہیں گی اور پھر شکرانے کے نقل بھی تو ادا کرنے ہیں میرے مالک نے بڑا کرم کیا ہے ہم پر۔“ اس کی بخیدگی سے کئی ہوئی بات پر ٹکیل اسے حیرت سے تنک رہا تھا۔

”نکتنا بدل گئی ہے تو کٹھوم اور میں شکر ادا کرتا ہوں اس مالک کا جس نے مجھ میں اتنا اچھا بلاؤ پیدا کیا۔“ ٹکیل مسکراتے ہوئے بولا تو وہ بھی مسکرائی ہوئی اندر کی طرف پلٹ گئی یہ سوچتے ہوئے۔

”ٹھیک ہی کہا ٹکیل تو نے اس مالک کا بڑا کرم ہے جو ہماری شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہے اس نے تو لازوال نعمتیں عطا کی ہیں میں ہی ناشکری کرتی آئی لیکن اب اس کے آگے سجدہ کرنا ہے اور اس کا شکر ادا کرنا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے وضو کے لئے نکلا کھول دیا تھا۔ یہ عیدان کے لئے ڈھروں خوشیاں لے کر آئی تھی۔

☆.....☆.....☆.....

سلسلے وار ناول

شان کے سوال پر وہ چند لمحے خاموشی کے بعد دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
”تمہیں کیا لگتا ہے؟“

”اگر آپ اس کے ساتھ وفادار ہیں بھی تو مجھے نہیں لگتا کہ زیادہ عرصے تک مزید رہ پائیں گے۔“ شان کے لہجے میں ہلکا سا طنز نمایاں تھا۔

”وہ ایک سپل لڑکی ہے اور آپ کی دنیا اس تک محدود نہیں رہی ہے مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ اس انتہا کے لبرل اور چمکتے دیکھنے والوں میں کس طرح ایڈجسٹ ہوئے ہیں۔“ شان کے لہجے میں اب ناگواری کا عنصر تھا۔
”پہلی بات تو یہ کہ تم سب نے مل کر مجھے اس فیلڈ میں جانے کے لیے فورس کیا تھا اور دوسری بات یہ کہ صرف ذمہ داری پوری طرح نبھانے کے لیے مجھے اس ماحول کا حصہ بننا پڑتا ہے میں جانتا ہوں وہ بالکل الگ دنیا ہے مگر مصنوعی۔ میری ایڈجسٹمنٹ بس کچھ وقت کے لیے اس دنیا میں ہوئی ہے اور تیسری اور آخری بات یہ کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے دوبارہ اس ”سپل لڑکی“ کا ذکر درمیان میں مت لانا۔“ شیٹ کے سنجیدہ لہجے پر شان نے بغور اسے دیکھا تھا۔



اسٹڈی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنی طرف متوجہ ہوتے عاطف کو دیکھا تھا۔

”تشریف لے آئیں آپ اپنی ضد میں کلاس کا تو بائیکاٹ کر رکھا ہے آپ نے۔“ مسکراتی نظروں سے اس نے سارہ کے بہت سنجیدہ چہرے کو دیکھا تھا جو کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھ رہی تھی۔
”مجھے نہیں سمجھ آتا میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں سارا! تمہاری ناراضی بے وجہ ہے۔“ وہ زچ ہو کر بولا تھا۔



نظروں سے اسے دیکھتی مقابل آؤ کی تھی۔
 ”اب تک کتنی تعداد ہو چکی ہے ان پرستاروں کی جو تمہاری قربت کے لیے بے قرار ہیں؟“ اس کے زہر خند لہجے پر بس ایک ہل کے لیے شیٹ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔
 ”ان پرستاروں میں کیا تم بھی شامل ہونا چاہتی ہو؟“ سرد لہجے میں پوچھا وہ چھپتی نگاہوں سے اس کے آگ کی طرح تپتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔
 ”راستے میں اگر کوئی چمکتی چیز پڑی ہو تو کوئی لوگ اسے دیکھنے کے لیے روک بھی جاتے ہیں اور ان کی تعداد و شمار یاد کرنے کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔“ وہ تلخ لہجے میں مزید بولا تھا۔
 ”اس راستے تک خود پہنچنے ہو تم اپنی نمائش کے لیے۔“ وہ کاٹ دار لہجے میں بولی تھی۔

”اور تب تک وہاں پڑا ہوں گا جب تک تم اپنی زبان سے اس راستے سے واپس آنے کے لیے نہیں کہو گی۔“
 پہنچنے لہجے میں بولا وہ اس کے سامنے سے ہٹ رہا تھا جب سارہ نے سرعت سے اسے روکا تھا جبکہ وہ بھی اسی سرعت سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے الگ ہٹا گیا تھا۔
 ”جس پر تھوکر دیا جائے اس سے اپنے لئے فیصلے نہیں مانگے جاتے شیٹ شاہنواز! تمہیں عیاشیوں سے روک کر میں اپنی ذات پر مزید کسی الزام کی سیاحت نہیں لپ سکتی تھی۔“ وہ انکارے چہرے پر بولی تھی۔
 ”مجھے عیاشیوں کا طعنہ دوبارہ مت دینا۔“ وہ بڑے تیروں کے ساتھ بولا تھا۔
 ”کیوں..... برا لگ رہا ہے تمہیں؟“ وہ تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔
 ”اس وقت کیسا لگ رہا تھا جب وہ عورت تمہیں آفر کر رہی تھی، کس چیز نے روک لئے تھے تمہارے قدم؟“ اس کا لہجہ زہر سے تر تھا۔

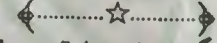
”نہیں رکتے میرے قدم اگر اس عورت کی جگہ تم ہو تیں۔“ وہ سرد لہجے میں اسے بڑکتی آگ کے شعلوں میں دھکیل گیا تھا اسے چاہی نہیں چلا کہ کب اس کا ہاتھ اٹھا ہوش تب آیا جب وہ سرعت سے اس کا ہاتھ اپنے چہرے تک پہنچنے سے پہلے ہی روک چکا تھا۔
 ”کیوں برداشت نہیں ہوا؟“ اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں جکڑے وہ اس کی خونخوار نگاہوں میں دیکھ رہا تھا۔
 ”تمہاری زبان کے نشتر نہیں روک سکتا مگر ہاتھ روکنے کا حق ہے مجھے۔“
 ”ہاتھ چھوڑ دو میرا.....“ غصے کی شدت سے کانپتی وہ غرائی تھی۔

”میرا ہاتھ لگانا تم سے برداشت نہیں ہونا مجھ سے پوچھو کس طرح میں نے برداشت کیا تھا جب تمہارے نام نہاد عاشر بھائی نے میری نظروں کے سامنے تمہیں تمہارے چہرے کو چھوا تھا۔“ سرخ چہرے کے ساتھ بول رہا تھا۔
 ”میرے روپے لیتے ہوئے تمہیں شرم آتی ہے مگر اس کے دیئے ہوئے روپے تم اپنے پاس سنبھال کر رکھتی ہو مجھ سے کوئی فرمائش کرتے ہوئے تمہاری زبان رکھتی تھی مگر وہ بغیر کے تمہاری ہر فرمائش پوری کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے..... کیوں؟“ شدید اشتعال میں شیٹ نے کچھ اس طرح اس کا ہاتھ چھوڑا تھا کہ وہ لٹھے کی مانند سفید چہرے کے ساتھ لڑکھڑاکر کاؤنٹر سے جا گر گئی تھی۔

”تمہارا اعتبار کھو دینے کے بعد مجھے اب موت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔“ دھندلائی آنکھوں کے ساتھ وہ کانپتی آواز میں بولی تھی دوسری جانب اس کے خطرناک ارادوں کو بھانپتے ہی شیٹ برق رفتاری سے اس تک پہنچا تھا اور اس کی مزاحمت کے باوجود چند سیکنڈ میں ہی تیز دھار چھری اپنے قبضے میں لے کر دور پھینک دی تھی۔

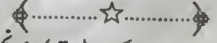
”میں ناراض نہیں ہوں آپ سے“ آپ کی زندگی ہے اس میں کس کو شامل کرنا ہے یہ فیصلہ بھی آپ بہتر کر سکتے ہیں مجھے تو بس اس بات کا افسوس ہمیشہ رہے گا کہ آپ جیسا اچھا انسان ایک ایسے دل سے محروم ہی رہے گئے آپ کی کوئی خامی کوئی برائی بھی نظر نہیں آ سکتی مگر مجھے امید ہے کہ آپ اپنی شریک سفر کے ساتھ اچھی زندگی گزاریں گے..... کسی بھی سنگین غلطی کے باوجود۔“ اس کے مدھم گہرے لہجے پر عاطف کچھ بول نہیں سکا تھا۔
 ”میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ آپ ہمیں کچھ دن کا کپ دے دیں نرنب کی والدہ بیمار ہیں اس دوران ہم پریکٹس کرتے رہیں گے۔“

”کیسی طبیعت ہے اب نرنب کی والدہ کی؟“ عاطف نے پوچھا تھا۔
 ”وہ ہارٹ پیسٹ ہیں ابھی ان کی طبیعت بہتر نہیں ہے انشاء اللہ کچھ دن میں بہتر ہو جائیں گی وہ۔“ بولتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔
 ”ٹھیک ہے پھر نرنب کے آنے پر کلاسز اشاعت کریں گے مگر اس سے کہہ دینا کوئی کوشش کرے کہ پریکٹس نہ رکے۔“ عاطف کی ہدایت پر وہ اثبات میں سر ہلا کر دروازے کی سمت بڑھی تھی مگر پھر یکدم ہی رک کر چلی گئی۔
 ”میں اس گھر میں رہوں یا نہ رہوں گھر میں نے ٹھان لیا ہے کہ نرنب کو اسی گھر میں آپ کے خاندان کے درمیان ہمیشہ کے لیے لاؤں گی۔“ اس کے اچانک تنجید کی سے یہ کہنے پر عاطف خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”اس کے لیے آپ جیسا کوئی دوسرا تو نہیں ہو سکتا مگر اس گھر میں بہت اچھے انسانوں کی کمی نہیں ہے۔“ بولتے ہوئے سارہ نے بنور اسے دیکھا تھا جس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا کچھ بھی کہے بغیر وہ مکمل کپیوٹر کی روشن اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔



کچھ چونک کر رکتے ہوئے اس نے ڈرائنگ روم میں جھانکا تھا جہاں شان جو توں سمیت صوفے پر دراز چھت پر لٹکر روشن فانوس کو تنک رہا تھا۔
 ”کس سوچ میں گم ہو گئے؟“ وہاں اچھا وقت نہیں گزرا۔“ سارہ کی مسکرائی آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔
 ”مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا تم واپس کب آئے ذرا بتاؤ مجھے کہ وہاں کتنی خواتین فریفتہ ہوئی ہیں تم پر؟“ سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا مگر جواب اس کی خاموش تنجیدہ نظروں پر وہ ابھی گئی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“
 ”یہ دیکھ رہا ہوں کہ کیا واقعی تم دنیا کی اہم ترین لڑکی ہو۔“ شان کے عجیب سے لہجے پر وہ تنک ہوئی تھی۔
 ”یہ کیوں کہہ رہے ہو تم؟“
 ”تمہیں یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ بولتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ گیا تھا۔
 ”مجھ سے کھل کر بات کیے بغیر تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔“ اسے روکتے ہوئے وہ قطعی لہجے میں بولی تھی۔



گیٹ لاک کرنے کے بعد اندر آتے ہوئے وہ چونک اٹھا تھا لاؤنج میں موجود سارہ اپنی جگہ سے اٹھتی مکمل اس کی طرف متوجہ تھی جو اسے نظر انداز کر لاؤنج سے گزرتا چلا گیا تھا دوسری جانب وہ جو سنگینی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی ایک فیصلہ کرتی تیز قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے ہی چلن کی طرف گئی تھی۔ عقب میں اس کی موجودگی کا یقین ہونے کے باوجود شیٹ نے بہت اطمینان کے ساتھ پانی کا گلاس ختم کیا تھا اور پھر اس کی سمت چلتا تھا جو شعلہ بار

”میرے لیے سب سے اہم میری اپنی دلیوز ہیں میری زندگی نے مجھ پر کچھ اصول لا کر رکھے ہیں میں ان کا احترام کرتا ہوں“ کچھ حدود ہیں جن کو کراس کرنے کی اجازت میں خود کو کبھی نہیں دے سکتا اس فیلڈ کی طرف آتے ہوئے جس طرح بیخودی زندگی متاثر ہوئی ہے اب مزید اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔“ اس کے گہرے سنجیدہ لہجے پر حسن حیات چند لمحوں تک بخور اسے دیکھتے رہے تھے۔

”کیا تم مجھے بتاؤ گے تمہاری زندگی کیسی ہے؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”بہت حد تک سربمیری“۔ شیث نے برجستہ کہا تھا۔

”اندازہ ہو رہا ہے تمہاری ڈھٹائی سے بخوبی“۔ حسن حیات نے خشکیوں نظروں سے اس کے مسکراتے چہرے کو گھورا تھا۔

”میں واقعی اپنے فیصلے پر قائم رہنا چاہتا ہوں اور اس سے مطمئن بھی ہوں“۔ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا تھا۔

”مجھے تمہارا کوئی فیصلہ نہیں سننا“ مجھے اب شس سے ہی رابطہ کرنا پڑے گا۔“

”اگر آپ کو لگتا ہے کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا تو ان سے ضرور رابطہ کریں“۔ شیث نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

”اب مجھے اجازت ہے؟ آفس سے کچھ ٹائم لے کر میں یہاں آیا تھا۔“

”ہاں ضرور۔“

”شیث!“ ان کی نگار پر وہ روکا تھا۔

”تمہارے انکار کے باوجود کہنی کی آفر اپنی جگہ قائم رہے گی بہت وقت ہے تمہارے پاس اپنی زندگی سے مشورہ کرنے اور اسے راضی کرنے کے لئے دیے بھی زندگی آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے“۔ یقین ہے کہ تمہاری زندگی بھی تمہیں آگے بڑھنے سے نہیں روکے گی بلکہ تمہارے مقصد ہی آگے بڑھے گی“۔ حسن حیات نے مسکراتے ہوئے بڑی گہری بات کی تھی جواباً وہ بھی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں خدا حافظ کہتا آفس سے نکل گیا تھا۔

☆-----☆-----☆

حیران نظروں سے شان کے چہرے کو دیکھتے وہ اندر داخل ہوئے تھے اس کی آنکھ کے قریب کافی حصہ سوج کر نیلا پڑا ہوا تھا۔

”کس کی کارستانی ہے یہ؟ کس سے جھگڑا کیا تم نے؟“ شس نے غصیلی نظروں سے اس کے لٹکے چہرے کو گھورا تھا جبکہ شان نے کینہ تو نظروں سے اسے گھورا تھا جو شس کے پیچھے ہی امداد آیا تھا۔

”میں نے کیا پوچھا ہے تم نے؟“ شس کے سوال دہرانے پر وہ اسی خاموشی سے ہر پتلاؤخ کی طرف چلا گیا تھا۔

”مجھے بھی کچھ نہیں بتا رہا ہے اب اس چہرے کے ساتھ چھپ کر بیٹھے ہیں زبان بند رکھے۔“ پانی کے گلاس شیث اور پھر شس کو دیتے ہوئے سدرہ بولی تھیں۔

”کس نے مارا ہے تمہیں بتاؤ ابھی جا کر اس کے ہاتھ توڑتا ہوں“۔ شیث نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”بہت شکریہ اس ہمدردی کا“۔ شان کھول ہی تو اٹھا تھا جبکہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے شیث نے پانی کا گلاس لہوں سے لگا لیا تھا تب ہی وہاں مومو کی آمد ہوئی تھی۔

☆-----☆-----☆

”اگر دوبارہ تم نے خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ نقصان میں اپنے ہاتھوں سے خود کو پہنچاؤ گے“۔ شمدیہ غصیلے انداز میں وہ اسے وارن کر رہا تھا جو یکدم پلٹ کر بھاگتی ہوئی گزرتے سے نکل گئی تھی۔

شیث کو کچھ وقت لگا تھا اپنے خطا ہو جانے والے اوسان پر قابو پانے میں گہری سانس لے کر چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ رک کر شان کی طرف متوجہ ہوا تھا جو کچھ شرمندگی اور کچھ سبے تاثرات چہرے پر سجائے قریب آ رہا تھا۔

”مجھے آپ سے بس یہ کہنا ہے کہ مجھے بالکل افسوس نہیں ہے کہ میں سارہ سے کچھ نہیں چھپا سکا تھا ویسے بھی اس کی طرح اب میں بھی نہیں چاہتا کہ آپ اس فیلڈ سے کوئی تعلق رکھیں“۔ سخت زدہ نظروں سے شیث کو دیکھتے ہوئے وہ ڈھٹائی سے بولا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر اسے جا کر یہ بھی بتا دینا کہ میں آج اور اسی وقت خود کو ہمیشہ کے لئے اس فیلڈ سے الگ کر چکا ہوں“۔ وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ بولا تھا۔

”زبردست فیصلہ ہے آپ کا میں ابھی جا کر سارہ کو بھی یہ خوشخبری سنا دوں؟“ خوشی سے کھلتے چہرے کے ساتھ شان بے تاب ہوا تھا۔

”ضرور سنا تا اسے یہ خوشخبری اتنی جلدی بھی کس بات کی ہے۔“ بہت نرم لہجے میں شیث نے یہ کہا تھا اور اگلے ہی بل اس کا زوردار مکاشان کے چہرے سے نکراتا اسے زمین بوس کر گیا تھا۔

☆-----☆-----☆

گلاس ڈور کھولتے ہوئے اس نے رک کر دیوالونگ چتر پر براہمان شخص کے متوجہ ہونے کا انتظار کیا تھا۔

”آؤ شیث! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا“۔ حسن حیات استقبال مسکراہٹ کے ساتھ بولے تھے۔

”آپ کا انتظار میرے لیے ایک اعزاز ہے“۔ وسیع خیل کے گرد بیٹھتے ہوئے وہ بولا تھا۔

”مجھے آسان پر مت پہنچاؤ ورنہ میں جانتا ہوں کہ میری کس بات پر تم سوچنے کی زحمت بھی نہیں کر رہے“۔ حسن حیات شکایتی لہجے میں بولے تھے۔

”میں جانتا ہوں آپ مجھ سے کیا امید رکھتے ہیں اس کے لیے میں آپ کا مشکور بھی ہوں مگر آپ کو یاد ہوگا کہ کہنی کی دوسری پروڈکٹ کی پروموشن کے لیے حامی بھرتے ہوئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں مزید اب اس سلسلے کو آگے جاری نہیں رکھ سکوں گا“۔ وہ یاد دلار ہوا تھا۔

”اور میں نے اس وقت بھی تم سے کہا تھا کہ اپنے فیصلے پر اجماعی طرح سوچ بچار کرو“۔ حسن حیات نے کہا تھا۔

”میں نے اس وقت بھی بہت سوچ سمجھ کر اپنا فیصلہ سنایا تھا“۔

”شیث! تم جانتے ہو مجھ سمیت ساری آرگنائزیشن تمہارے فیصلے سے کس قدر ناخوش ہے“ کوئی تمہیں الگ نہیں کرنا چاہتا“ اسے کم عمر سے میں تم نے ناصر کہنی میں بلکہ اس سے منسلک ہر شخص کے دل میں اہم اور مستحکم جگہ بنائی ہے“ اس کہنی کو اور بہت سے نئے چہرے مل جائیں گے یہاں تک کہ Celebrities بھی مگر ہماری براہِ زور کو تم جیسے Brand Ambassador کی ضرورت ہے“ تم ایک Well connected شخص ہو کیا تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک Brand Ambassador کی دلیوی کیا ہوتی ہے؟“ حسن حیات اسے کنوینشن کرنے کی کوشش میں تھے۔

”شان! تمہیں دیکھ کر لگتا ہے چاند زمین پر اتر آیا ہے۔“ مومو کے چھینرنے نے اسے مزید غضبناک کر دیا تھا ہر ایک جھٹکے سے اٹھ کر مومو کے پیچھے دوڑا تھا جو سرعت سے فلا نہیں بھرتی پہلے ہی بھاگ اٹھی تھی۔

”سارہ کہاں ہے؟“ لاؤنج سے نکلنے ہوئے شیٹ نے سنا تھا جس پوچھ رہے تھے۔

”اس کی طبیعت صبح سے خراب ہے مگر وہ ایک ٹیبلٹ تک لینے کے لئے تیار نہیں ہے۔“ اسے سدرہ کی آواز بچی بخوبی سنائی دے گئی تھی۔ ایک تشویش بھری نظر اس نے سارہ کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے پر ڈالی تھی اور پھر تین قدموں کے ساتھ بیڑھیاں چڑھتا چلا گیا تھا۔

سدرہ کی آواز پر اس نے بمشکل اپنی جگہ پر آٹھنیں کھولی تھیں۔ ان کے عقب میں ہی موجود جس نے دنگ نظروں سے اس کے ہلدی کی طرح زرد پڑے چہرے کو دیکھا تھا اور پھر خود ہی آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا جو توقع کے عین مطابق انگاروں کی طرح دھبہ رہی تھی۔

”پتا نہیں کن جھیلوں میں ابھی رہتی ہو تم صبح سے وہ اس حالت میں ہے اور تم نے مجھے ایک فون تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔“ جس بری طرح سدرہ پر برسے تھے۔

”انہیں کچھ تم کہیں میں خود اکر کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔“ نڈ حال انداز میں بولتی وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر میں ڈاکٹر کو کھہہ ہی بولا لیتا ہوں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں چاہتی ہوں اس طرح ہی میرے کچھ گناہ کم ہو جائیں۔“ اس کے کمزور مگر عجیب سے لہجے پر جس اور سدرہ کے درمیان خاموش نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔

”اچھا! ابھی تو اٹھو! ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ! میں نے تمہارا نیوٹ دلہہ بنایا ہے وہ کھا کر ٹیبلٹ لینا ڈاکٹر کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔“ نرم لہجے میں سدرہ اس کا ہاتھ پکڑے واش روم کی طرف بڑھ گئی تھیں جبکہ جس انتہائی پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے جو انہیں کہیں سے بھی نارمل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے شیٹ میں ہمت نہیں کھی کر دوبارہ اسے نظر بھر کر دیکھ لے سائے ہی وہ کھلائے چہرے کے ساتھ موجود تھی اس کے نقوش پر بکھری مردنی سی چھاپ پر شیٹ کے دل و دماغ منتشر ہونے لگے تھے غیر معمولی تازہ محسوس سب ہی کر رہے تھے مگر خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے چور نظروں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے جو سر جھکائے باڈل میں موجود لیے میں بس چھچھو میرے دیرے ہمارے ہی تھی۔

”میں ہاسٹل میں شفٹ ہونا چاہتی ہوں جلد از جلد۔“ یکدم ہی اس کی ابھرتی سرد آواز نے جیسے دھماکا کیا تھا۔

شیٹ کے علاوہ سب کی نظریں اس پر ساکت تھیں مگر وہ بس جس کی دنگ نظروں میں دیکھ رہی تھی۔

”آپ میرے ہاسٹل میں رہنے کا انتظام کروا سکتے ہیں تو ٹھیک ورنہ یہ کام میرے لئے بھی مشکل نہیں ہے۔“

”تمہارا بخار کیا دماغ پر چڑھ گیا ہے جو یہ فضول بات کر رہی ہو۔“ شدید بے یقینی کے ساتھ جس نے اسے جیسے گھر کھا تھا۔

”بخار تو اب اترا ہے مجھے اب کسی صورت اس گھر میں نہیں رکنا ہے۔“ فیصلہ کن لہجے میں بولتی وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ ایک تیز نظر جس نے اس پر ڈالی تھی جو گلاس پر نظر جمائے بالکل ساکت بیٹھا تھا اس پر سے نظر ہٹاتے جس وقت ضائع کیے بغیر سارہ کے پیچھے ہی گئے تھے۔

بیڈ کے کنارے بیٹھی وہ سپاٹ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی جو سدرہ کے ساتھ ہی اس کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”میں ہاسٹل میں شفٹ ہونا چاہتی ہوں جلد از جلد۔“ یکدم ہی اس کی ابھرتی سرد آواز نے جیسے دھماکا کیا تھا۔

شیٹ کے علاوہ سب کی نظریں اس پر ساکت تھیں مگر وہ بس جس کی دنگ نظروں میں دیکھ رہی تھی۔

”آپ میرے ہاسٹل میں رہنے کا انتظام کروا سکتے ہیں تو ٹھیک ورنہ یہ کام میرے لئے بھی مشکل نہیں ہے۔“

”تمہارا بخار کیا دماغ پر چڑھ گیا ہے جو یہ فضول بات کر رہی ہو۔“ شدید بے یقینی کے ساتھ جس نے اسے جیسے گھر کھا تھا۔

”بخار تو اب اترا ہے مجھے اب کسی صورت اس گھر میں نہیں رکنا ہے۔“ فیصلہ کن لہجے میں بولتی وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ ایک تیز نظر جس نے اس پر ڈالی تھی جو گلاس پر نظر جمائے بالکل ساکت بیٹھا تھا اس پر سے نظر ہٹاتے جس وقت ضائع کیے بغیر سارہ کے پیچھے ہی گئے تھے۔

بیڈ کے کنارے بیٹھی وہ سپاٹ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی جو سدرہ کے ساتھ ہی اس کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

راپی: پھوٹے لکڑی نو پھوٹے بھائی عاتر صاحب لواء اسان پر چھوڑا میں کے۔ شاد رخ نے کہا تھا۔
 www.pdfbooksfree.pk

روزنامه است [7] بر 2012

حال دل کیسے بتائیں

تم میری زندگی ہو یہ تمہیں ہم بتائیں گے
کیا ہو تم میرے لیے کبھی ملو تو سمجھائیں گے

”رشاء! کیا کر رہی ہو تم؟“ حتانے رشاء کے
باتھ میں ڈاڑی دیکھتے ہوئے کہا۔



جس کی چاہت ہوتی ہے۔“ مدھم لہجے میں بولتے ہوئے اس نے رک کر زینب کو دیکھا تھا جس کے چہرے پر بھلا
سنانا اطراف میں پھیلے سنائے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ سارہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی جو شاید زمین
آسمان کے درمیان متعلق تھی سارہ کے رکنے کا اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ کسی ٹرانس میں وہ بے جان قدموں کے
ساتھ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی ماحول پر طاری سکوت کو یکدم ہی ایک آواز نے توڑنا شروع کر دیا تھا۔ زینب کی
پشت سے نظر ہٹا کر وہ پلٹی تھی دور سے اسے ایک بانیک بہت تیز رفتاری کے ساتھ قریب آئی دکھائی دے رہی تھی۔
ایک گہرا سانس لے کر سائیڈ میں ہوتے ہوئے اس نے زینب کو پکارا تھا۔

”سڑک سے ہٹ جاؤ زینب! یہ سڑک کسی کی نہیں ہو تم اس کی ہو جاتی ہیں اسے کبھی اپنے حصار سے نکلنے
کی اجازت نہیں دیتیں۔“ خود دکھائی کے سے انداز میں بولتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سنہری چہرہ لہرایا
تھا۔ کچھ چونک کر اس نے قریب سے گزرتی بانیک کو دیکھا تھا جو ابھی کے لیے پلٹی زینب کے قریب یکدم رک کر کئی
اس شخص کے کریمہ چہرے کو پہچاننے میں جہاں سارہ کو دیر نہیں لگی تھی وہیں زینب دہشت میں گہری پتھر کی صورت بن
چکی تھی۔ ساکت کھڑی سارہ نے اس شخص کے ہاتھ میں موجود کی چیز کو دیکھا تھا۔

”زینب.....“ اس کی چیختی آواز پر زینب نے جیسے ہوش میں آ کر اپنی جگہ سے حرکت کی تھی مگر پھر بھی وہ زدمیں آ
گئی تھی اگلے ہی پل اس کی فلک شکاف چیخوں پر دہشت سے سارہ کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

”معجزہ.....“ حلق کے بل چلائی وہ جیل کی طرح اس پر جھپٹی تھی جو سفاکی کی انتہا کرتا بانیک اشارت کر رہا تھا۔
زینب کی بلبلائی آسمان تک جاتی چیخوں پر اگلے ہی پل وہ معجز کے بھاگنے کی کوشش ناکام کر رہی تھی جب معجز کی ایک
ہی ضرب پر سڑک پر وہ منہ کے بل گری تھی مگر بھوک شیرنی کی طرح اس بار وہ اس کے پیرو کو بوجھ گئی تھی جو بانیک
اشارت کر چکا تھا اگلے ہی پل وہ بانیک کے ساتھ ہی سڑک پر پھنسی جا رہی تھی۔ معجز کی بوکھلاہٹ عروج پر تھی اپنے
ارادوں میں وہ پہلے ہی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا تھا اپنا پیڑ سارہ کے شکم سے نکالنے کی کوشش میں وہ بانیک
کا توازن قائم نہیں رکھ پا رہا تھا اگر اس کے پاس تیزاب کی ایک اور بوتل ہوتی تو وہ ضرور اسے سارہ پر انڈیل دیتا۔
اس بار سر پر لگی بھاری ضرب نے اس کے ذہنی دے بے حال وجود کو بے جان کر دیا وہ حلق کے بل چیخ رہی تھی اس لیے
نہیں کہ کمر درمی سڑک نے اسے لہو لہان کر دیا تھا بلکہ اس لیے کہ ایک گدھ اس کی گرفت سے نکل چکا تھا دوسری
جانب اپنی کامیابی پر ہوتی معجز کی خوشی کا فور ہو چکی تھی کیونکہ بہت قریب اسے اپنی موت کھڑی دکھائی دے رہی تھی
جانے کہاں سے نمودار ہوئی وہ کار سڑک کے درمیان اس طرح رکھی تھی کہ بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک زوردار
دھماکا ہوا تھا کار کی چھت سے نکل کر دوسری جانب گرتا اس کا وجود سڑک سے دو ٹوٹا اور اچھلتا نکلنا دور چلا گیا تھا۔
بیشکل سراسخا کر اس نے اپنی خون سے بھٹی آنکھوں سے اس شخص کو پہچاننے کی کوشش کی تھی جو بلند آواز میں اس کا
نام لیتا دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔

”شیث.....“ سر سے ہیر تک وہ پکار بنی اشے کے قابل نہیں تھی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہتا
چلا گیا تھا۔

”شیث کی زندگی بھی تم پر قربان ہے۔“ اس کا نیم جاں وجود سینے میں چھپائے وہ تڑپ اٹھا تھا مگر سارہ کے حواس
بس یہیں تک ساتھ دے سکے تھے۔

(جاری ہے)

”یہ تو سیر بھائی کی ڈائری ہے تمہارے پاس کیا کر رہی ہے؟“ حنا نے رمشاہ کے ہاتھ سے ڈائری لیتے ہوئے کہا۔

”شایان نے دی تھی مجھے۔“ رمشاہ نے کہا۔
 ”ڈائری پڑھ کے سیر بھائی کی محبت پر یقین کر رہی ہو۔“ حنا نے رمشاہ کو گھورتے ہوئے کہا۔
 ”جی نہیں۔“ رمشاہ نے افسردگی سے کہا۔
 ”تو پھر یہ ڈائری پڑھنے کا مقصد؟“ حنا نے پوچھا۔
 ”میں تو ویسے ہی پڑھ رہی تھی۔“ رمشاہ نے اداسی سے کہا۔

”میں جانتی ہوں تم بھی سیر بھائی سے پیار کرتی ہو۔“ حنا نے رمشاہ کو اداس دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”میں نہیں جانتی اس دن کیسے میرے منہ سے وہ سب نکل گیا دیکھو تو محبت میں لوگوں کو سارا جہاں مل جاتا ہے اور مجھے دیکھو کوئی رشتہ بھی راس نہیں آتا۔“ رمشاہ نے بے بسی سے کہا۔
 ”قبول دو تمہیں محبت ہے۔“ حنا بے اختیار بولی۔

”کیا یہ سب کہنا ضروری ہوتا ہے حنا جبکہ سیر جانتا ہے مجھے پھر بھی وہ اس طرح کر رہا ہے کیوں؟“ رمشاہ یہ کہہ کر رونے لگی۔

”میں مانتی ہوں رمشاہ! ضروری نہیں جس سے ہم پیار کریں اس کو بتائیں کہ ہم اسے کتنا چاہتے ہیں اور ضروری تھوڑی ہے ہم اپنا حال دل اسے سنائیں۔ لیکن رمشاہ آج کل یہ سب بہت ضروری ہے کہ جس سے ہم پیار کریں اس تک اپنے احساسات جذبات پہنچائیں جذبہ اظہار مانگتے ہیں۔ رمشاہ کل تک جب سیر بھائی تمہیں اپنی محبت کا احساس دلواتے تھے تو تمہیں لگتا تھا کہ وہ تم سے بھرپور کر رہے ہیں اور تم سیر بھائی سے کتنا چڑی تھیں۔“ حنا رمشاہ کو تارے ہوئے بولی۔

”بٹ اب تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے ناں۔ میں جب بھی سیر سے بات کرنے جاتی ہوں وہ مجھے انگوڑ کر کے چلا جاتا ہے۔“ رمشاہ نے پھرتے ہوئے کہا۔

”تم بتاؤ میں اب کیا کروں؟“ رمشاہ نے حنا سے پوچھا۔

”معافی مانگ لو۔“ حنا نے کہا۔
 ”تو تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی؟“ رمشاہ نے غصے سے حنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”سیر بھائی نے تم کو بغیر کسی غرض کے چاہا ہے وہ ضرور معاف کر دیں گے اس سے پہلے کے دیر ہو جائے تم معافی مانگ لو۔“ حنا نے کہا۔
 ”تم سیر سے بات کرو ناں۔“ رمشاہ نے کہا۔
 ”جی نہیں میں نہیں تم خود ہی ان سے معافی مانگ لو۔“ حنا نے رمشاہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

جہانگیر خان کا تعلق پٹھان قبیلے سے تھا ان کے تین بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے عدیم جن کے چار بچے تھے ماہین سیر، علیر، شایان۔ دوسرے بیٹے عظیم جن کے دو بچے تھے حنا اور زین۔ تیسرے بیٹے اعظم جن کی ایک بیٹی تھی ان کی بیٹی کی پیدائش کے وقت ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنی بیوی کی موت کا ذمہ دار رمشاہ کو سمجھتے تھے اور لندن چلے گئے اور دوبارہ ملٹ کر نہ آئے۔ ماں کا پیار تو رمشاہ کو ملا نہیں باپ نے بھی اپنا سایہ اس کے سر سے اٹھا لیا تھا سب کے پیار نے رمشاہ کو سنبھال تو لیا لیکن جب وہ باقی سب کو اپنے می بابا سے لاڈ اٹھواتے دیکھتی تو ٹکڑ ٹکڑ جاتی تھی اور اس وقت تو کوئی تھی جب وہ اس دنیا میں آئی۔ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اس کی محرومیاں بڑھتی گئیں سب اس سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے مگر وہ سب کے پیار کو بھردری سمجھتی تھی۔

”رمشاہ! تم نہیں چل رہی ہو ہمارے ساتھ؟“ سیر نے رمشاہ کو گھر کیلے میں دیکھ کر پوچھا۔
 ”نہیں۔“ رمشاہ نے جواب دیا۔
 ”لیکن کیوں؟“ سیر نے رمشاہ کے گہڑے

چرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”دل نہیں کر رہا ہے۔“ رمشاہ نے بے زاری سے جواب دیا۔

”کیوں آخر سب کو تکلیف دے رہی ہو تم۔“ سیر نے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا سیر! کہ میں سب کو تکلیف دے رہی ہوں اور میرا کیا؟ ہاں میری اذیت میری تکلیف کوئی مٹتی نہیں رکھتی۔“ وہ ایکدم سے رو دی۔
 ”ہاں..... رو لو تم ایک ہی تو اس دنیا میں مظلوم ہو دیے بھی نہیں رونے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔“ سیر رمشاہ کو ڈانٹ کر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆
 ”کیا ہوا رمشاہ نہیں چل رہی ہمارے ساتھ؟“ سیر کی می می نے پوچھا۔
 ”نہیں وہ محترمہ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں کہتی ہے کہ سب اس کے ساتھ پیار نہیں بھردری کرتے ہیں۔“ سیر غصے سے بولا۔
 ”آرام سے بیٹا! آپ جانتے بھی ہو رمشاہ کو پھر بھی اتنا غصہ کر رہے ہو۔“ سیر کی می نے اسے غصہ کرتے دیکھ کر کہا۔

”نومی! ایسا کب تک چلتا رہے گا؟ وہ کوئی بچی تو نہیں اور اگر رمشاہ ایسے ہی رہی تو اس کا جینا مشکل ہو جائے گا۔“ سیر نے بے چارگی سے کہا۔
 ”اب تم کہاں جا رہے ہو؟“ سیر کی می نے سیر کو اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔
 ”می پلیز! میری طرف سے ماموں سے معذرت کر لیجئے گا۔“ سیر بولا۔

”سیر بات تو سنو۔“ وہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئیں مگر وہ کانٹیں۔

☆.....☆.....☆
 ”رمشاہ! میری بات سنو۔“ بڑی می نے رمشاہ کو روکتے ہوئے کہا۔

”جی بولیں۔“ رمشاہ نے رکتے ہوئے کہا۔
 ”رمشاہ! میں نے کبھی بھی تمہیں علیر اور ماہین سے کم نہیں سمجھا پھر تمہیں کیوں لگتا ہے کہ میری عتاب جھوٹی ہے۔“ بڑی می نے رمشاہ سے پوچھا۔
 ”بڑی می پلیز! ایسا مت بولیں! آپ لوگ ہی تو میرے سب کچھ ہیں مگر یہ ڈیرے دل سے نہیں نکلا کہ جو مجھے پیار کرے نکلیں وہ اما کی طرح مجھے چھوڑ کر نہ چلا جائے اور پاپا بھی پتہ نہیں مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔“ رمشاہ نے روتے ہوئے کہا۔

”نکال دو اس ڈر کو رمشاہ! اور سب بھول جاؤ۔“ زندگی کو سننے سے سیدھی گھوڑی بہت خوبصورت ہے ہم ماہین کے سسرال جا رہے تھے تو آپ ہنسنے لگیں کہ کیا اب ماہین کی شادی کی تیاریوں میں میری مدد کرو یہ علیر تو کسی کام کی نہیں۔“ بڑی می نے علیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اے میرے اللہ! یہ میں نے کیا سن لیا! میری می میرے بارے میں ایسا سوچتی ہیں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“ علیر نے مذاق سے می کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ رمشاہ بے اختیار ہی مسکرائی۔
 ”رمشاہ! تم یو پی مسکرایا کرو۔“ علیر نے رمشاہ کو مسکراتے دیکھ کر کہا۔

☆.....☆.....☆
 ”سوری سیر! میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا۔“ رمشاہ نے سیر سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں رمشاہ! سوری مت بولو میں تو تمہیں یہ احساس کرنا چاہتا تھا کہ ہم سب تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔“ سیر نے رمشاہ کو شرمندہ ہوتے دیکھ کر کہا۔
 ”میں تو تم سے ایک ایک کر کے سارے بدلے لوں گا۔“ وہ آگے بڑھا اور اسے دونوں شانوں سے تھام کر خود سے قریب کیا اور بے خودی کے عالم میں اس کے ہاتھ پر اپنے پیار کی مہر ثبت کی۔
 ”میں تو یو پی رمشاہ! میں تم سے بہت پیار کرتا

”بھائی کون سا سر پر اتڑ ہے؟“ علیزہ نے پوچھا۔

آئے تھے وہ ہر دم مسکراتی رہتی تھی۔
 ”ڈیزر بھابی! غلطی سے آپ نے ایسی کی ہے۔“

مجھے معاف نہیں کرو گے۔“ یہ کہتے ہوئے رمشاء سمیر کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ سمیر نے حیرانگی سے رمشاء کا یہ

خدا ہے بندوں کو بھی بھی مایوس نہیں کرتا۔

☆

سلسلے وار ناول

شرقا کی دنیا

”تایا ابو! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”بیٹا! تو اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟ بلا جھجک بات کریں۔“

”تایا ابو! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔“ حسین کی بات پر سب ہی اُسے بڑی حیرانگی سے دیکھنے لگے تھے کیونکہ کسی کو بھی یہ اعزاز نہیں تھا کہ وہ یہ سب کہے گی۔

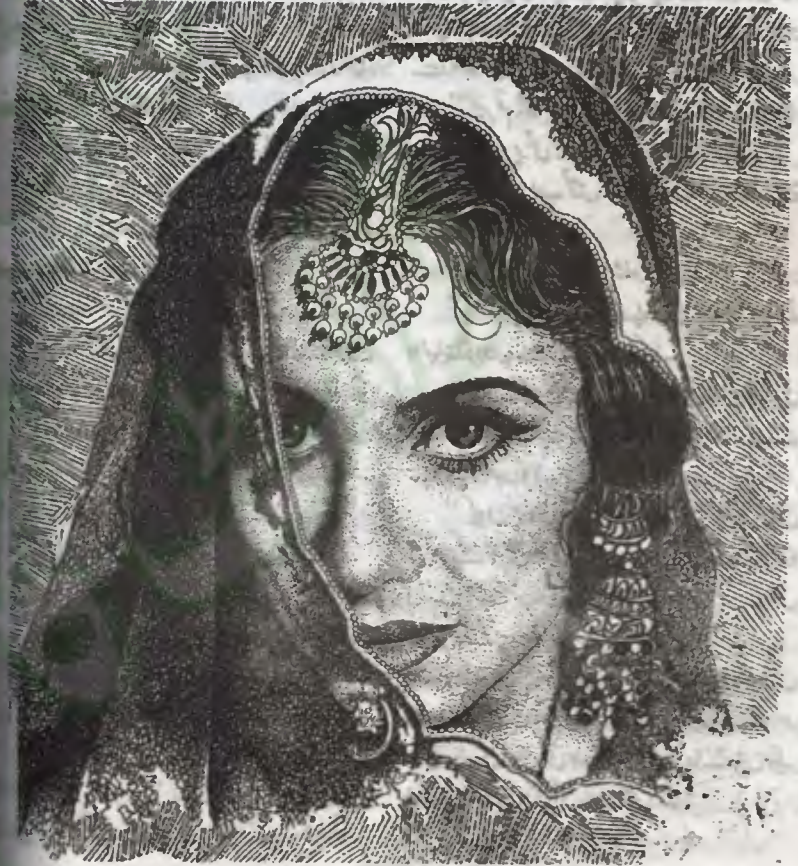
”حسین بیٹا! آپ جانتی بھی ہیں کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”تایا ابو! میں جاب کرنا چاہتی ہوں اور یہ بات آپ سے میں نے بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔“ حسین کی سنجیدگی پر ذرا برابر فرق نہیں پڑا تھا، جبکہ وہ عموماً کافی غیر سنجیدہ ہی رہتی تھی اور اس کی سنجیدگی کی وجہ سے ہی نوید عالم کچھ شکر ہوئے تھے۔

”آپ کو جاب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پہلے آپ اپنی ایجوکیشن تو مکمل کر لیں۔“

”تایا ابو! میں ایک بزنس دوسن بننا چاہتی ہوں۔“

”بیٹا! پہلے دوسن تو بن جائے، بزنس دوسن بننے کی بات تو بعد میں آتی ہے، ابھی آپ کا انٹرک کاپلٹ نہیں ہوا اور آپ ہیں کہ بزنس دوسن بننا چاہتی ہیں۔“ نوید عالم کے لبوں پر بڑی شریر مسکراہٹ نے بڑی تیزی سے جگہ بنائی



تھی۔

”حنین! فضول باتیں بہت ہو گئیں، اب اٹھو اور جا کر سوؤ۔“

”مہی! میں فضول باتیں نہیں کر رہی، آئی ایم سیریس۔“ اسے ماں کا اس طرح بولنا پسند نہیں آیا تھا، اوپر سے تاپا اور مسکراہٹ بھی اُس کا دل جلا رہی تھی۔

”ساجدہ! آپ پلیر کچھ مت کہیں، میں حنین سے بات کر رہا ہوں۔“

”بھائی صاحب! اس کا تو دماغ خراب ہے، نئے نئے خیالات اس کے دماغ میں آتے رہتے ہیں، ڈھنگ سے گھر کا تو یہ کوئی کام کر نہیں سکتی، چلی ہے جاب کرنے۔“ نوید عالم کے اشارے پر وہ پچ کر گئیں تھیں۔

”مہی! مجھے گھر کے کاموں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے، میں بزنس دوسرا بننا چاہتی ہوں اور پلیر تاپا ابو! آپ مجھے آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دیں۔“ حنین نے ماں اور تاپا سے باری باری کہا تھا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کہ آپ آفس جوائن کریں، لیکن ابھی یہ سب قبل از وقت ہوگا، آپ پہلے اپنی ایجوکیشن مکمل کریں اس کے بعد میں آپ کو آفس جوائن کرنے سے نہیں روکوں گا۔“

”تاپا ابو! بعد میں تو میں کروں گی، لیکن آج کل میں فارغ ہوں تو میں آفس جوائن کرنا چاہتی ہوں، تاکہ مجھے کچھ ایکسپیرینس ہو جائے۔“

”حنین! جب بھائی صاحب نے کہا ہے کہ وہ تمہیں اجازت دے دیں گے تو پھر تم کیوں بحث کر رہی ہو؟“ انہوں نے بیٹی کو گھورا تھا۔

”مہی! میں بحث نہیں کر رہی۔“

”تو پھر بحث کرنا کس کو کہتے ہیں؟“ اب کے انہوں نے اس کو ڈنٹا تھا۔

”ساجدہ! ڈانٹ کیوں کر رہی ہو حنین کو؟ اگر بچی اپنے دل کی بات گھر والوں سے نہیں کرے گی تو پھر کس سے کرے گی؟“ راشدہ نے مداخلت کی تھی۔

”آپا بیگم! ہر وقت کی ضد اور بحث اچھی نہیں ہوتی، جب حنین سے کہا کہ جب وقت آئے گا تو اس کو جاب کرنے کی اجازت مل جائے گی تو یہ کیوں خاموش نہیں ہو جاتی؟“

”جب حنین مجھ سے بات کر رہی ہیں تو آپ لوگوں کو بچ میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اسے روتے دیکھ کر وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔

”آئی ایم سوری بھائی صاحب!“ ساجدہ نے قدرے شرمندگی سے اپنے جیبھ کو دیکھا تھا اور معذرت طلب کی تھی۔

”حنین! رونے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا!“

”تاپا ابو! مجھے معاف کر دیں، میں آپ سے بحث نہیں کر رہی، میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ آپ مجھے آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دیں۔“

”بیٹا! ابھی آپ کو بزنس کی نوہاؤں نہیں ہے تو میں کیسے آپ کو آفس جوائن کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔“

”تاپا ابو! جب میں آفس جوائن کروں گی تب ہی تو مجھے بزنس کی نوہاؤں ہوں گی۔“

”حنین بیٹا! آپ میری بات سمجھ نہیں رہی ہو، آفس جوائن کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔“ وہ اسے سمجھا نہیں پارے تھے۔

”اگر مشکل ہے تو بھی میں بیچ کر لوں گی تاپا ابو!“

”حنین! میں آپ کو ابھی اجازت نہیں دے سکتا۔“ انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔

”لیکن کیوں تاپا ابو؟ آپ مجھ پر بھروسہ کر کے تو دیکھیں۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ آپ پر بھروسہ نہ ہونے کی وجہ سے اجازت نہیں دے رہا ہوں میں، میں تو فی الحال اس لئے منع کر رہا ہوں کہ جاب کرنا، آفس سنبھالنا ایک ٹائم ڈیوٹی ہے اور جس کو آپ بیچ نہیں کر سکتیں، اس لئے پہلے تعلیم مکمل کریں تاکہ آپ کو پتہ ہو کہ آفس کیسے سنبھالتے ہیں؟“

”وہی تو میں سیکھنا چاہتی ہوں۔“

”کچھ بھی ایسے نہیں سیکھا جاتا حنین! ہر چیز وقت پر ہی اچھی لگتی ہے اور اگر میں آپ کو آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دوں تو آپ کیا کریں گی؟ آفس کے کام کے بارے میں آپ جانتی ہی کیا ہیں؟“

”تاپا ابو! میں کسی بہت بڑی پوسٹ پر کام کرنے کے لئے نہیں کہہ رہی، میری ایجوکیشن کے مطابق جو آپ کو ٹھیک لگے۔“

”تمہاری ایجوکیشن ہی کتنی ہے؟ محض انٹر، اس کا بھی ابھی رزلٹ نہیں آیا۔“

”تو کیا انٹر کر کے کوئی جاب نہیں کرتا، کتنی ہی لڑکیاں اور لڑکے انٹر کے بعد بھی جاب کرتے ہیں، جب ان کو جاب مل جاتی ہے تو کیا مجھے اپنے گھر کے بزنس میں بھی ایڈجسٹ نہیں کیا جاسکتا؟“

”حنین! بس پچ کر جاؤ، سارے لحاظ بھولتی جا رہی ہو تم، تاپا سے دوبارہ بحث کرتے تمہیں ذرا سی شرم نہیں آ رہی۔“

”مہی!“

”شٹ اپ حنین! اٹھو اپنے کمرے میں جاؤ، اب کچھ کہا تو بہت پتو کی مجھ سے۔“ اسے منہ کھولتے دیکھ وہ درشتگی سے بولی تھیں اور وہ صوفے سے اٹھی تھی اور کسی کو بھی دیکھنے بغیر لاؤنچ سے نکل گئی تھی۔

”بھائی صاحب! حنین کی طرف سے میں آپ سے معافی۔“

”ساجدہ! حنین میرے لئے کوئی غیر نہیں ہے، میری اپنی بیٹی ہے۔“

”یہ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے بھائی صاحب! کیا میں نہیں جانتی کہ حنین آپ کو کتنی عزیز ہے، جادید کی موت کے بعد آپ نے ہی تو سارے لاؤنچ اٹھائے ہیں، اپنے بچوں سے بڑھ کر حنین کا خیال رکھا، اس کی ہر خواہش پوری کی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب جو سوچ لیتی ہے اسے پورا کروا کے ہی چھوڑتی ہے، اتنی ضد اور مرن نالی اچھی نہیں ہوتی، کل کو اگلے گھر جانے کی تو کوں برداشت کرے گا یہ سب؟ مجھے تو سوچ سوچ کر ہی ہول اٹھتے ہیں۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ساجدہ! حنین میری ذمہ داری ہے، جسے میں آخری سانس تک خوش دلی سے اٹھاؤں گا اور بچے والدین سے بھی ضد یا فرمائش نہیں کریں گے تو پھر کس سے کریں گے؟ آپ ہر وقت حنین کے پیچھے نہ پڑ جایا کریں، اگر ضد کر بھی رہی ہے تو اسے پیار سے سمجھایا جاسکتا ہے، بڑی ہوتی ہوئی اولاد پر ہر وقت تنقید کی جائے یا روک ٹوک، اس کا برا اثر پڑتا ہے، اس لئے پیار و محبت سے پیش آیا کریں، آپ کی روک ٹوک حنین پر بھی برا اثر ڈالے گی اور جب بات پیار و محبت سے سمجھائی جاسکتی ہے تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ سختی سے پیش آئیں؟“

”نوید ٹھیک کہہ رہے ہیں ساجدہ! تم ہر وقت ہی حنین کے پیچھے پڑی رہتی ہو کہ اتنی دیر کیوں سوئیں، رات دیر تک کیوں جاگتی رہیں، کھانا بنانا، سلائی، سیکھو۔ وہ وقت کے ساتھ سب سیکھ لے گی، تم کیوں اتنی فکر مند ہوتی ہو؟“

راشدہ نے شوہر کی حمایت میں بات آگے بڑھائی تھی۔

”آپا بیگم! میں بھی کیا کروں، اور بچیاں بھی تو ہیں، زمین نے پورا کچن سنبھالا ہوا ہے اور شاز میں سلائی کڑھائی میں ماہر ہے اور حنین ہے کہ نہ چائے بنانا آتی ہے نہ ہی سوئی میں دھا کڑا ل سکتی ہے، دونوں بچیوں کی طرح گھر داری میں انٹر سٹ لے تب اسے کچھ آگے، اُسے تو بزنس و دمن بننے کا خیال ہو چلا ہے۔“ وہ بیٹی کی حرکتوں سے سخت نالاں تھیں۔

”وقت کے ساتھ کچھ لے گی، تم پریشان نہ ہوا کرو۔“ راشدہ نے اپنا ہاتھ تسلی بھرے انداز میں ساجدہ کے ہاتھ پر رکھا تھا، راشدہ اور ساجدہ دو بہنیں جو شادی کے بعد جھڑائی دیورانی بن گئیں، نوید اور جاوید دو بھائی اور ایک بہن فریدہ۔ نوید سب سے بڑے تھے اور ان کی دو بیٹیاں زرین اور شاز زمین اور اکلوتا بیٹا اسجد جو بہنوں سے بڑا تھا۔ اسجد نے بی بی اسے کرنے کے بعد باپ کا بزنس سنبھال لیا تھا، زرین نے گریجویشن کے بعد اپنی مرضی سے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا، شاز زمین بی ایس سی کے آخری سال میں تھی۔ جاوید عالم کا انتقال بہت ہی کم عمری میں ہو گیا تھا ان کو کینسر تھا اور علاج کروانے کے باوجود مالک حقیقی کی مرضی کے تحت روبہ صحت نہ ہو سکے اور دنیا سے مزید موڑ گئے، اُس وقت جاوید کی اکلوتی بیٹی حنین محض 4 برس کی تھی، نوید عالم اور راشدہ نے بہت کوشش کی کہ ساجدہ دوسری شادی کر لیں مگر وہ کسی طور راضی نہ ہوئیں، جس طرح جاوید کی زندگی میں وہ رہتے تھے دیے ہی رہ رہی تھیں، دونوں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے تھے جن سے انٹر سائنس کے انگریز ازم دیے تھے، حنین کو باپ کی کمی محسوس نہ ہو اس لئے نوید عالم نے اسے اپنے تینوں بچوں سے زیادہ محبت و چاہت اور توجہ دی تھی اور گھر والوں کی توجہ نے ہی اسے کافی خنڈی اور موڑی بنادیا تھا، فریدہ کے دو بیٹے ارجم ارجم اور راحم ارجم تھے۔ ارجم نے سی ایس ایس کیا تھا اور حال ہی میں پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ زرین کی ہم عمر ماندہ نے بھی گریجویشن کیا تھا اور ماندہ کی اسجد سے اور شاز زمین کی راحم سے 3 ماہ قبل ہی بڑی دھوم دھام سے منگنی ہوئی تھی، فریدہ کے شوہر یوسف ایئر فورس سے وابستہ تھے، حال ہی میں انہوں نے ریٹائرمنٹ لی تھی، جبکہ راحم کو اس شیعے سے دلچسپی نہ تھی اس لئے اس نے انجینئرنگ کی ڈگری لی اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے وابستہ تھا۔ تینوں گھرانوں میں بے حد محبت اور انسیت تھی، ان لوگوں میں رشتوں کی اصل محاسن شدت سے محسوس کی جاسکتی تھی جبکہ آج کل کا دور کہ جس میں جوائنٹ فیملی سسٹم تقریباً ختم ہو رہا ہے اور قریبی رشتے دار بھی ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی آپسی محبت اور یگانگت قابل ذکر ہی تھی کیونکہ اپنوں کو سمجھنا اور ان کی قدر کرنا آج کل کے دور میں بہت کم نظر آتا ہے۔

☆.....☆.....☆

”پچھو! اس دفعہ آپ نے کافی دنوں بعد چکر لگایا ہے، سچ میں آپ کو بہت سا کر رہی تھی۔“ شاز زمین لاڈ سے بولی تھی۔

”پچھو کو بس کر رہی تھیں یا پچھو کے بیٹے کو بس کیا جا رہا تھا؟“ چلفوزوں کی پلیٹ سے انصاف کرتی حنین کے شرارت سے کہنے پر شاز زمین بدمعاشی طرح جھپٹ گئی تھی اور جھپٹ مٹانے کو اُس کے بازو میں لگی کائی تھی۔

”ہر وقت فضول بولا کرو۔“

”لو بھئی نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔“ وہ بازو کو سہلاتے ہوئے بولی تھی اور فریدہ ہنسنے لگی تھیں اور ہنسنے ہوئے اُسے چھیڑنے کو بولی تھیں۔

”شاز میں بیٹا! کیا حنین سچ کہہ رہی ہے؟ یاد مجھے نہیں بلکہ۔۔۔!“ جان کر انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر شرارت

برہنہ نکال دی۔ اُسے دیکھا تھا۔

”آپ بھی ناچھو! اس کو تو بکواس کرنے کی عادت ہے، میں آپ کے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔“ اس کا

خوبصورت چہرہ اناری ہو چلا تھا اور اُس نے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔

”زرین! آپ کی کہہ دینا چائے بنانے کے لئے، جو شامہ پینے کا بالکل بھی موڈ نہیں ہے۔“ حنین نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

”تم نے تو اچھی چائے بناتی ہوئی، جنہیں تو یہ بھی شاید پینہ ہو کہ چائے بناتے وقت ڈالتے کیا کچھ ہیں؟“ اس

نے مڑ کر کہتے ہوئے حساب بے باک کیا تھا اور سب ہی جانتے تھے کہ شاز زمین نے بالکل سچ کہا ہے اس لئے فریدہ اور

راشدہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی جبکہ ساجدہ کو فکروں نے آگھیرا تھا۔

”ساجدہ بھابی! آپ کیوں خاموش بیٹھی ہیں؟“

”ہاں..... نہیں..... میں بچیوں کی ٹوک جھونک سن رہی تھی، تم آتے ہوئے ماندہ کو بھی آتے تھیں۔“

”نہیں بھابی! اچھا نہیں لگتا، یہ ماندہ کی ہونے والی سسرال ہے سسرال میں شادی سے پہلے آنا کچھ معیوب سی ہی

بات ہے۔“

”تم بھی کن زمانوں کی بات کرتی ہو فریدہ! زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے اور ماندہ کا یہ سسرال بعد میں، ماموں کا گھر

پہلے ہے، اس لئے اُس کے آنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔“ راشدہ نے کھلے دل وچائی سے کہا تھا۔

”بھابی بیگم! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، مگر احتیاط کرنا اچھی بات ہے۔“

”فریدہ کی بات اپنی جگہ درست ہے مگر مگنی نہ جانے ابھی کتنے ماہ یا سال رہے، تو بچے کیا ماموں اور پچھو کے گھر

ہی نہیں جائیں گے؟“

”مئی! تو بچیوں کی جلدی شادی کر دیں، ویسے ہی انتظار اب نہیں ہوتا۔“ چائے کی ٹرائی لاتی شاز زمین کو دیکھ کر وہ

شرارت سے بولی تھی۔

”ساجدہ بھابی! حنین نے مشورہ تو کافی درست دیا ہے، اس بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔“ فریدہ کی بات پر حنین

نے فخر سے فرضی کالر کھڑے کیے تھے اور وہ محض بیٹی کو گھور کر رہ گئی تھیں۔

”فریدہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ شاز زمین چھوٹی ہے، میں پہلے زرین کی شادی کروں گی، میں تو مگنی کے بھی خلاف

تھی، مگر تمہاری خند کے آگے چپ ہو گئی، مگر زرین کی شادی سے پہلے میں شاز زمین کی شادی نہیں کروں گی۔“ راشدہ

قطعیّت سے بولی تھیں کیونکہ وہ شاز زمین کا رشتہ کرنا ہی نہیں چاہ رہی تھیں مگر فریدہ بھی کیا کرتیں، بڑا بیٹا شادی کے نام

سے چوتھا تھا اور دوسرے بیٹے نے خود شاز زمین کا نام لیا تھا ورنہ تو ان کا ارادہ ارجم کے لئے زرین کو مانگنے کا تھا مگر اس

نے صاف انکار کر دیا تھا تو انہوں نے چھوٹے بیٹے کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے شاز زمین کو مانگ لیا تھا۔

”بھابی بیگم! میں تو خود بھی چاہتی ہوں کہ پہلے کہیں ہماری زرین کا رشتہ ہو جائے اور آج میں اس سلسلے میں حاضر

ہوئی تھی۔“

”میں سمجھی نہیں فریدہ!“

”بھائی صاحب! آج میں پھر بات کروں گی، ابھی بچیاں بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔“

”پچھو! ایسی کیا بات ہے جو ہم سے چھپانا چاہتی ہیں؟“ حنین کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”پچھو کی دادی! آپ ہر معاملے میں ناگ مت اڑایا کریں، ہم جب ضروری سمجھیں گے تمہیں بتا دیں گے،

آج کل فارغ ہوا تانہیں ہوا کچھ پھو کے گھر آ جاؤ، مگر نہیں جتا، پھپھو سے تو منہ دیکھے کی محبت نبھائی جاتی ہے۔ انہوں نے مذاق سے کہتے ہوئے اُس کا کان بکڑا تھا، جسے چھڑاتے ہوئے اس نے فریدہ کے کاندھے پر اپنا دایاں ہاتھ پھیلاتے ہوئے لاڈ سے کہنا شروع کیا تھا۔

”جی پھپھو! میں آپ سے منہ دیکھے کی محبت نہیں کرتی، یہ کام تو شازمین بھوکا ہے، آپ آتی ہیں تو ان کو یاد آتا ہے کہ یہ آپ کو یاد کر رہی ہیں، ورنہ تو آپ کا نام بھی نہیں لیتیں۔“ وہ ہنستے ہوئے شازمین کو نارگٹ بٹاری تھی۔

”میں تمہاری طرح بدتمیز نہیں ہوں کہ بڑوں کے نام لوں۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”یعنی آپ شادی کے بعد راحم بھائی کا نام نہیں لیں گی، وہ بھی تو آپ سے بڑے ہیں، ویسے بھو! آپ ان کا نام نہیں لیں گی تو پھر انہیں کیا کہیں گی؟ جانو، ڈارلنگ یا سوئیٹ ہارٹ!“

”شٹ اپ!“ چہرہ سرخی مائل ہو گیا تھا اور وہ شرم و حیا سے لال پڑتی وہاں سے تقریباً بھاگتے ہوئے نکل گئی۔

”بتا کر تو جائے کس خراہم بھائی کو آپ کیا کہیں گی؟“ اسے روکنا چاہتا تھا۔

”تم سے مطلب، تم اپنے کام سے کام رکھو تمہیں؟“ وہ پلٹ کر کبھی بھاگ گئی تھی۔

”برای بات حسین! میں کو تنگ نہیں کرتے۔“

”سچ پھپھو! تنگ کرنے میں مجوزہ ہے وہ کسی بھی چیز میں نہیں اور شازمین بھوکو تو ستانے میں بڑا ہی مزہ آتا ہے، راحم بھائی کے نام پر جو شرماتے ہوئے بھاگتی ہیں، ان کا یہ انداز سچ میں لطف دے جاتا ہے۔“ وہ چائے کے سپ لیتے ہوئے بولی تھی۔

”جب تمہاری باری آئے گی تو پوچھوں گی کتنا لطف آتا ہے؟“ زرمین نے کباب کھاتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا مگر اس کو کیا پتہ تھا کہ اب نشاندہ خود ہی بن جائے گی۔

”میرا اہم تو بہت بعد میں آئے گا، پہلے تو آپ اپنی خیر متائیں، پھپھو آج اسی مقصد سے آئی ہیں۔“

”اس لڑکی کے سامنے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کر سکتا۔“

”مئی! آپ کو تو میرے خلاف بولنے کی عادت ہو گئی ہے، میں نے کچھ اپنی طرف سے کب کہا؟ یہ سب تو پھپھو ہی بول رہی تھیں۔“ اُس نے تیزا کباب اٹھاتے ہوئے کھائی تھی اور اسی وقت اجداد نوید عالم آفس سے لوٹنے سیدھے لاؤنج میں ہی آئے تھے اور وہ نوید عالم کو دیکھ کر آدھا کھلایا ہوا کباب واپس پلٹ میں رکھتے ہوئے جانے کے لئے کھڑی ہو گئی تھی کیونکہ وہ آج کل ان سے ناراض تھی اور یہ تادامی ظاہر کرنے کا اس کا اپنا انداز تھا۔ محسوس تو فریدہ کے علاوہ سب ہی نے کیا تھا مگر کہا کسی نے کچھ نہیں تھا اور وہ لاؤنج سے نکل کر اپنے روم میں چلی گئی تھی۔

یوسف ساتھ نہیں آئے؟ انہیں بھی لے آتیں۔“

”بھائی صاحب! ان کی طبیعت کچھ خراب تھی اس لئے نہیں آئے اور جبکہ میرا آج بھی ضروری تھا، مہوش نے فون کر کے میرا داغ خراب کیا ہوا تھا، میں نے سوچا فون پر آپ لوگوں سے کیا بات کروں گی، اسی بہانے ملے آگئی۔“

فریدہ نے اپنی اکھوتی بچپن کی سبیلی کا نام لیا تھا اور اس نام سے سب ہی واقف تھے۔

”کیوں بھئی... مہوش نے آپ کا کیوں داغ خراب کیا ہوا تھا؟“

”زرمین! جا کر اپنے ابو کے لئے چائے لے آؤ۔“ فریدہ کی باتوں سے اندازہ لگا تے ہوئے ساجدہ نے زرمین کو وہاں سے ہٹانا چاہا تھا اور وہ چائے کے خالی کپڑائی میں رکھتی اور برتن سمیٹ کر ٹرائی کھیت کر وہاں سے نکل گئی تھی۔

”بھائی صاحب! میری دوست مہوش اپنے بیٹے کے لئے زرمین کا ہاتھ مانگنے کے لئے یہاں آنا چاہتی ہے۔“

زرمین کے جانے کے بعد وہ بولی تھیں۔

”اب آپ جو بھی کہیں گے، ہاں، ناں وہ میں اُسے بتا دوں گی۔“

”مہوش کو تو ہم کافی عرصے سے جانتے ہیں، وہ بہت چھوٹی عمر سے ہمارے گھر آتی رہی ہیں، ان کی ایسی کوئی خواہش ہے تو آپ اُن کو بلا لیں، آگے ہماری زرمین بیٹی کا نصیب۔“ انہوں نے لمحہ میں مثبت جواب دے دیا تھا کیونکہ مہوش کی فیملی سے اُن کے فیملی رشتے، شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی، وہ ان کی گھریلو تقریبات کا ہمیشہ سے حصہ رہی تھیں۔ مہوش فیاض کے 2 بیٹے فیصل اور فیصل جبکہ ایک بیٹی محرش تھی۔ فیصل کی اپنے ماموں کی بیٹی سے بات ملے تھی جبکہ فیصل کے لئے ہی مہوش، زرمین کا ہاتھ مانگنا چاہتی تھیں، فیصل آرکیٹک تھا اور محرش نے حال ہی میں انٹرنیشنل کے پیپر ڈیپے تھے۔ فیصل فیاض تینوں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور ملٹی پٹیشنل کمپنی میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔

☆.....☆.....☆

”حسین کہاں ہے، وہ کھانا نہیں کھاری؟“ نوید عالم نے جیسرے سنبھالے ہوئے پوچھا تھا۔

”مئی! میں اُسے بلانے گئی تھی مگر اُس نے آنے سے منع کر دیا کہ اُسے بھوک نہیں ہے۔“

”اُس نے دوپہر میں بھی یہی کہا تھا، زرمین! جاؤ رانگا کر لاؤ اُسے۔“ راشدہ نے کہا تھا۔

”رہے دیں بھائی! جب کھانا ہوگا کھالے گی، زرمین! آ جاؤ بیٹا! تم کھانا کھاؤ۔“

”کوئی بات ہوئی ہے؟“ نوید عالم نے بیوی سے پوچھا تھا تب ساجدہ بولی تھیں۔

”بات کیا ہوئی ہے بھائی صاحب! دماغ خراب ہو گیا ہے اس لڑکی کا۔“

”آ خر یہ بھی تو چلے کہ حسین کہہ رہی ہے؟“

”بھائی صاحب! اُس کی ایک ہی رت ہے کہ آفس جوائن کرنا ہے، نرمی سے سمجھایا تو مانی نہیں، سختی سے کہا تو دوپہر سے کمرہ بند کیے بیٹھی ہے، نہ کسی سے بات کر رہی ہے اور نہ ہی کچھ کھاری ہے، مجھے تو تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔“

ساجدہ کی آنکھوں سے آنسو پھسل پھسل کر گالوں پر گرنے لگے تھے۔

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا ساجدہ کہ حسین کے ساتھ سختی نہ کرو۔“

”میں بھی کیا کروں! آپا بیگم! حسین کو میں نے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کم از کم گریجیشن تو کر لے، اس کے بعد آفس جوائن کرے مگر اس کی ایک ہی خند ہے کہ وہ ابھی جوائن کرے گی، ناک پر مٹی تو بیٹھنے دیتی نہیں ہے جب کہیے کرے گی؟“ وہ بیٹی کی حرکتوں سے نالاں نظر آ رہی تھیں۔

”شازمین بیٹا! آپ جا کر بہن کو بلا کر لاؤ۔“ شازمین خاموشی سے اٹھ گئی تھی۔

”کہاناں میں نے، مجھے کھانا نہیں کھانا ہے تو کیوں مجھے پریشان کر رہی ہیں؟“ شازمین کے دروازہ بجانے پر اندر سے چنکی تھی، دروازہ ہنوز بند تھا۔

”تمہیں ابو بلا رہے ہیں، کم از کم اُن کی بات تو سن لو۔“

”مجھے کسی کی بھی بات نہیں سنی، جب کسی کو میری پروا نہیں ہے تو میں کیوں سب کی پروا کرتی پھر دوں، آپ چڑ جائیں بھو! مجھے نہیں آتا ہے۔“

”شازمین! کیا ہوا ہے، یہ حسین دروازہ کیوں نہیں کھول رہی؟“ اجداد اپنے کمرے سے نکلا تھا اور شازمین کے سامنے آ کر کھتا۔

”بھائی! حسین ناراض ہے اور غصہ میں اس نے کھانا چٹا چھوڑ دیا ہے۔“

”تم بھو، بھو، دیکھتا ہوں۔“ شازمین کے سائیڈ میں ہوتے ہی اُس نے دروازہ پر زوردار دستک دی تھی۔

”شازمین بھو! مجھے تنگ مت کریں۔“

”حسین! دروازہ کھولو۔“ شازمین کے بجائے امجد برہمی سے بولا تھا۔

”آپ چلے جائیں امجد بھائی! بار بار مجھے آپ لوگ تنگ کریں گے تو میں اپنے ساتھ کچھ غلغلہ کر بیٹھوں گی۔“ اس کی روتی ہوئی آواز ان کے کانوں تک آئی تھی اور امجد کی برداشت ختم ہو گئی تھی، وہ کچھ دنوں سے اس کی حرکتیں دیکھ اور محسوس کر رہا تھا مگر کچھ کہا نہیں تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا سنجیدہ مزاج کا حامل شخص تھا جب تک اس کی لائق ممکن ہوئی وہ لائق رہتا تھا مگر جب ایئر فیئر کرنے کی ضرورت ہوتی تو ضرور کرتا تھا۔

”حسین! ایک منٹ میں تم نے دروازہ نہیں کھولا تو میں دروازہ توڑ دوں گا۔“ وہ امجد کے غصے سے ڈرتی تھی، اس وقت بھی اُس کے غصے کو محسوس کرتے اُس نے دروازہ کھول دیا تھا۔

”یہ کیا ڈرامہ ہے حسین! وہاں نیچے سب تمہارا ڈانٹنگ ہال میں انتظار کر رہے ہیں اور تمہارے غرے ہی ختم نہیں ہو رہے ہیں۔“

”آپ کچھ نہیں جانتے اس لئے سچ میں مت بولیں۔“ وہ اُس کے تیر لہجے سے خائف سی ہو کر بولی تھی۔

”کیا نہیں جانتا؟ کچھ کہتا نہیں ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم جو چاہو کرتی رہو، جب ابوابورچی نے جسے جاب کرنے سے منع کر دیا ہے تو کیوں خد پر اڑی ہوئی ہو؟“ تھکے چوتھوں سے اُس کے سگتے ہوئے چہرے کو دیکھا تھا۔

”خد پر میں نہیں تایا ابواڑے ہوئے ہیں، دنیا کی کتنی ہی لڑکیاں جاب کرتی ہیں، ایک میں بھی کر لوں گی تو کون سی قیامت آجائے گی؟“

”شٹ اپ حسین! مجھ سے زیادہ بد بانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، شازمین! اسے لے کر نیچے آؤ۔“ وہ انگلی اٹھا کر کہتا شازمین کو اُنے کا اشارہ کر کے کمرے سے نکلنے کا تھا۔

”میں نہیں آؤں گی، آپ اپنا فیصلہ مجھ پر نہیں توپ سکتے۔“

”تم دو منٹ میں نیچے نہیں آؤ، میں تو بتاؤں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتا وہاں سے نکل گیا تھا۔

”حسین! خد نہیں کرتے، ابھی نیچے چل کر کھانا کھا لو، تم جو چاہتی ہو وہ قبل از وقت ہے، جب وقت آئے گا۔!“

”مجھے کچھ نہیں سنا ہے، جس کو دیکھو مجھے وعظ سنانے بیٹھ جاتا ہے، لیکن میں بھی وہی کروں گی جو میں چاہتی ہوں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں، کہہ دیجئے گا امجد بھائی سے کہ وہ آپ پر اور زمین آپی پر دھونس جمایا کریں، میں اُن کی آواز سننے والی نہیں ہوں، اور زیادہ ہی شوق ہوا ماندہ اپنا پر دھونس جمائیں، مجھ پر ہرگز نہیں۔“ وہ روتے ہوئے بے سے کتنی دواش روم میں چلی گئی تھی اور شازمین حیران سی ڈانٹنگ ہال میں آگئی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی آگئی تھی کسی کو بھی دیکھے بغیر اپنی مخصوص چیز گھسیٹ کر اُس پر بیٹھ گئی تھی، کسی نے بھی اُس سے کچھ نہیں کہا تھا اور سب خاموشی مانتا کھانے لگے تھے۔

”نا! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ اُسے اُٹھتے دیکھ کر نوید عالم بولے تھے۔

”میں میں آپ سے کوئی بات۔!“

”حسین!“ امجد نے اُس کی بدتمیزی پر بند باندھنا چاہا تھا۔

”کیسے! میں سن رہی ہوں۔“

”آپ میرے کمرے میں آؤ، میں وہیں آپ سے بات کروں گا۔“ وہ کرسی کھسکا کر اُٹھ گئے تھے۔

”میرے اللہ! یہ لڑکی آخر چاہتی کیا ہے؟“ ان دونوں کے وہاں سے بچنے ہی وہ سر قدام کر رہ گئی تھیں۔

”وہی! آپ بالکل پریشان نہ ہوں، ابواس سے بات کر رہے ہیں نا۔“

”یہی تو مجھے ڈر لگ رہا ہے، دوپہر میں اس نے مجھ سے کتنی بدتمیزی کی اور میں نہیں چاہتی کہ وہی سب وہ بھائی صاحب کے ساتھ بھی کرے۔“

”آپ ایسے سوچیں بچی! حسین! کبھی بھی ابواس سے بدتمیزی نہیں کرے گی۔“ زمین اُن کو پانی پلاتے ہوئے بولی تھی۔

”حسین! میں نے کبھی آپ کی کوئی بات نہیں سنی، جو چاہا، جو مانگا وہ سب آپ کو دیا اور آفس جوائن کرنے سے بھی میں آپ کو منع نہیں کر رہا، مگر ہر چیز اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے اور آپ کے پاس وقت ہی کتنا ہے، صرف 3 ماہ؟

اس کے بعد آپ کا رزلٹ آجائے گا اور بی کام میں ایڈمیشن، ایڈمیشن کے بعد آپ آفس نہیں چاہاؤ گی، اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ گریجویٹیشن کے بعد آپ آفس جوائن کرؤ۔“

”پھر تو میں گریجویٹیشن کے بعد بھی آفس جوائن نہیں کر سکتی، پھر مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہوگا اور آپ کہیں کے کمراسٹر کے بعد میں آفس آسکتی ہوں، آپ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ میں آفس جوائن کروں اور یہی بات آپ مجھے صاف کہیں، مجھے آسرے میں کیوں رکھ رہے ہیں؟ جموٹی تسلیاں، جموٹے آسرے نہیں چاہئیں مجھے۔“ وہ بہت

تختی سے کہہ رہی تھی اور وہ ششدر سے بیٹھے اُسے سن رہے تھے، اس نے لاڈ پیار سے اُن سے کتنی ہی فرمائشیں اور بے جا ضدیں پوری کر دینی تھیں مگر آج تو اس کا انداز ہی نیا تھا۔

”میں جموٹے آسرے نہیں دے رہا، مجھے منع کرنا ہوتا تو صاف کرتا، یہ میری ذمیل ہی ہے حسین! جو آپ اس طرح بحث کر رہی ہیں۔“

”بحث کے لئے بھی آپ نے ہی مجھے مجبور کیا ہے، آپ میرے تایا ہیں ناں اس لئے مجھے سمجھنا ہی نہیں چاہتے، آپ کی جگہ میرے ابو ہوتے تو وہ ضرور سمجھتے کہ میں کیا چاہتی ہوں، مگر آپ لوگ چاہتے ہی نہیں ہیں۔“ امجد بھائی نے

میری کتنی انسٹ کی، اتنے بُرے لہجے میں مجھ سے بات کی، مجھے بُری طرح ڈانٹا اور میں کسی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی، یتیم ہوں ناں، قبیحوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے، جیسا میرے ساتھ کیا جا رہا ہے۔“ اس کی باتیں اور اس کا بچکیوں

سے رونانہ نوید عالم ششدر سے بیٹھ رہ گئے تھے۔

”حسین! ایسا کیوں سوچتی ہیں آپ بیٹا! کیا میں آپ کا ابو نہیں ہوں؟“ وہ اس کا ہاتھ قدام کر دل گرتگی سے بولے تھے، جو بھائی انہیں بہت عزیز تھا یہ اسی کا خون تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے اس لئے انہوں نے اسے اپنے

بچوں سے زیادہ چاہت و توجہ دی مگر اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ ان کی شفقت و محبت ہی سے بچی سی تھی۔

”نہیں، آپ صرف میرے تایا ابو ہیں، میرے ابو مر گئے ہیں، مٹی کتنی ہیں میں آپ سے فرمائشیں نہیں کیا کروں، مجھے آپ سے لاڈ بھی نہیں کرنے چاہئیں، اس لئے میں جاب کرنا چاہتی ہوں، میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔“

”ہم نے کب کہا کہ آپ ہم پر بوجھ ہیں؟“ وہ حیران ہی تو رہ گئے تھے۔

”مٹی کتنی ہیں، یہی آپ کا احسان ہے کہ آپ نے ہمیں گھر میں جگہ دی، مجھے پڑھایا لکھایا اور میں اب آپ کے

احسان اُتارنا چاہتی ہوں، میں اپنے بیروں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ مجھے آفس ورک آجائے تاکہ مجھے کہیں بہت اچھی جگہ جاب مل جائے، آپ مجھے اپنے آفس میں جاب نہیں دے سکتے تو مجھے کہیں اور جاب کرنے کی اجازت دے دیں، میں جاب کرنا چاہتی ہوں، مگر آپ کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتی اسی لئے آپ کے آفس میں کام کرنے کا سوچا ورنہ میں جانتی ہوں کہ میری ایجوکیشن ان کپلیٹ ہے اور مجھے جاب نہیں مل سکتی، آپ نے ابوی کی موت کے بعد مجھ پر اتنے احسان کیے، ایک احسان اور کر دیں، مجھے جاب کرنے کی اجازت دے دیں۔“ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، انہوں نے کبھی بھی تو اسے غیر نہیں سمجھا تھا، اس سے محبت کی تھی، احسان سمجھ کر اس کی پرورش نہیں کی تھی بلکہ اپنا فرض سمجھ کر کی تھی جسے وہ اتنی آسانی سے احسان کا نام دے گئی تھی۔

”آپ جیسا سوچتی ہو یا ساجدہ جیسا سوچتی ہیں ایسا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا، اس لئے فضول باتوں کو ذہن سے نکال دیں جن میں مجھے آپ زرمین اور شازمین کی ہی طرح عزیز ہو، اور آپ جاب کرنا چاہتی ہو تو مجھے اعتراض نہیں ہے، آپ کل سے آفس جوائن کرلو۔“ انہوں نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا تھا اور وہ ان کے سینے سے لگ کر بلک اٹھی تھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اب ان میں حوصلہ نہیں تھا اس کا دل دکھانے والی باتیں سننے کا، اس لئے وہ شازمین کو آواز میں دینے لگے تھے اور کچھ ہی دیر میں وہ ہاں چلی آئی تھی۔

”شازمین! بہن کو کمرے میں لے کر جائیں اور کھانا بھی یاد سے کھلا دیں، ڈائننگ ٹیبل پر چینیں لکھانا نہیں کھایا تھا۔“ لہجہ میں تنبیہ کی سی تھی۔

”تایا ابو!“

”اوہوں، کچھ مت کہیں بیٹا! آپ جو کہنا چاہتی تھیں وہ سمجھ گیا ہوں، یو ڈونٹ وری۔ کل سے یا جب چاہیں آفس آ سکتی ہیں۔“

”آپ ناراض تو نہیں ہیں؟“ خیال آنے پر پوچھا تھا۔

”نہیں، میں اپنی بیٹی سے ناراض نہیں ہوں، اور یہی چاہتا ہوں کہ مہری بیٹی ہمیشہ خوش رہے۔“ وہ بدلتی تمام مسکرائے تھے، شازمین کو کچھ غیر معمولی سا لگا تھا مگر باپ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی اس لئے دل میں الجھن لئے وہ جنین کا ہاتھ تھا ہے ان کے روم سے نکل گئی تھی۔ اس نے جنین کو اس کے کمرے میں چھوڑا تھا اور پچن میں آگئی تھی، کھانا گرم کر کے جنین کو کھلایا تھا اور برتن دھو کر وہ پچن سے نکل رہی تھی کہ اجد کو دیکھ کر ٹھک کر رک گئی تھی۔

”اجد بھائی! کچھ چاہیے تھا آپ کو؟“

”مجھے کچھ پوچھنا ہے شازمین!“ اس نے بہن کو بیٹھنے کے لئے اشارہ کرتے ہوئے کہا، اور وہ سوالیہ نگاہوں سے اجد کو دیکھنے لگی تھی۔

”میں ابو سے کوئی فائل ڈسکس کرنے گیا تھا، کل پر پزیشن ہے اور ذرا سی کوتاہی سے لاکھوں کا کنٹریکٹ ہمارے ہاتھوں سے نکل سکتا ہے، اس کے باوجود ابو نے مجھے اچھا رسپانس نہیں دیا، وہ مجھے بہت پریشان اور دکھی لگ رہے تھے کیا تم جانتی ہو ابو اور جنین کے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟ ہونہ ہو جنین ہی ابوی کی پریشانی کی وجہ ہے۔“

”مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے بھائی! کہ جنین سے ان کی کیا بات ہوئی؟ جب ابو نے مجھے بلایا تھا جنین ان کے کندھے سے لگی بری طرح رو رہی تھی، ابو نے کہا میں جنین کو کمرے میں لے جاؤں، جنین کچھ کہنا چاہتی تھی جس کا ابو نے اسے موقع نہیں دیا اور اس سے کہا کہ وہ جب چاہے آفس جوائن کر سکتی ہے۔“

”واٹ! ابو نے جنین کو آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دی، مگر کیوں؟“

”میں خود نہیں جانتی، ایک دفعہ میں نے بھی ابو سے اس سلسلے میں بات کی تھی مگر ابو نے سختی سے منع کر دیا تو میں نے یہ چند ہی کلمے کر دیا، مگر اب جنین کو ابو نے اجازت دی ہے تو میں وہ نہیں سمجھ پا رہی، اور ابو مجھے بھی کافی اپ سیٹ لگ رہے تھے، بھائی! کہیں چچی کا خدشہ صحیح تو نہیں تھا؟“ وہ کچھ خیال آنے پر اسے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”بھائی! چچی کہہ رہی تھیں ناں کہ جنین نے ان سے بد تیزی کی تھی، تو کہیں اس نے ابو سے بھی... اسی لئے ابو نے اسے اجازت دے دی، ورنہ تو میں نے خود ہی اور ابوی کی باتیں سنی تھیں، ابو کہہ رہے تھے کہ وہ جنین کو کبھی اجازت نہیں دیں گے، جیسے مجھے نہیں دی تھی، کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹیاں ورکنگ وومن بنیں، امی نے کہا تھا کہ پھر آپ نے صاف منع کیوں نہیں کیا؟ تو ابو بولے کہ گریجویٹیشن کے بعد وہ جنین کی شادی کر دیں گے، اور اس کی طبیعت میں خد ہے اس لئے انہوں نے وقتی طور پر حامی بھر لی ہے، تاکہ وہ یہ کوئی سے اپنی تعلیم مکمل کر لے۔“ شازمین نے اچانک سن لینے والی باتوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی۔

”جنین کافی منہ پھٹ اور بد تیز ہے، یقیناً اس نے ابو سے بد تیزی کی ہے اور اگر واقعی ایسا ہوا تو جنین کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ اس کا غصہ عود کر آ رہا تھا۔

”بھائی! آپ غصہ نہیں کریں، جنین اس طرح آپ سے خائف...!“

”مجھے کسی کی بھی ناراضی کی فکر نہیں ہے، وہ اس گھر کی بیٹی ہے اور اسے باقی بیٹیوں کی طرح ہی زندگی گزارنا ہوگی، میں مائیں کی اجازت نہیں دے سکتے، کسی بھی وجہ سے ابو نے اسے آفس جوائن کرنے کی اجازت دے دی ہو مگر میں خود ابو سے بات کر دوں گا، وہ آفس نہیں جائے گی۔ تم اٹھو جا کر سوؤ، ہر وقت گھن چکر بنی رہتی ہو، کچھ ذمہ داریاں اُسے بھی دو، مگر سنبھالنا نہیں ہے مجھ پر۔ آفس سنبھالنے چلی ہیں۔“ وہ غصے سے تن فن کرتا وہاں سے نکلا چلا گیا تھا اور شازمین پریشانی سے وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”آج کل کہاں غائب ہو، دکھائی نہیں دیتے؟“

”معروفیت ہی ایسی رہی، پاپا کو انجانا سا ایک ہوا تھا۔“

”کیا... کب؟ اور کسی نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔“ ارحم اُسے تیز نگاہوں سے گھورا ہوا تھا۔

”میں نے تمہیں جان کر ڈسٹر ب نہیں کیا ارحم! تم نے حال ہی میں اپنی پوسٹ سنبھالی ہے، میں نے سوچا تم معروف ہو گے، کچھ دنوں سے تم نے کوئی کال یا پیج بھی تو نہیں کیا تھا اسی لئے میں نے تمہیں پریشان نہیں کیا، مگر تم فکر مند نہ ہو، پاپا بالکل ٹھیک ہیں، یاد کر رہے تھے تمہیں، فرصت ہو تو آ جا۔“

”تھک ہے تجھ پر فنیل! اب مجھ سے اتنا فائل ہو کر بات کرے گا، تیرا دماغ تو ٹھکانے پر ہے؟“ ارحم نے غصے سے کہتے ہوئے آدھا بھرا ہوا گلاس اُس کے سر پر ڈال دیا تھا۔

”ٹھنڈ لگنے سے کھلا کچھ دماغ، کہ میں تیرا بچپن کا دوست ارحم الحسن ہوں۔“ وہ بہت ٹھنڈے لہجہ میں بولا تھا اور فنیل اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا تھا۔

”میرا نہیں، دماغ تیرا خراب لگ رہا ہے، جناب آپکٹر ہوتے ہیں اور حرکتیں بالکل بچوں والی۔“

”اوسے گھما کر! یہ تشدد کا سب سے آسان طریقہ ہے، پانی ڈالنے سے سمجھ نہیں آیا تو بال بٹخ کر بتاؤں؟“ اب کے دھمک کر بولا تھا۔

”ہے ایک پیاری سی، نازک سی، جو تیرے یار کے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتی ہے۔“ اس کے لبوں پر بڑی سی خوبصورت مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔

”وہی پوچھ رہا ہوں، وہ کون ہے؟“

”زرمین عالم۔“ نام سننے ہی ارحم کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا اور وہ بڑی سی حیرانگی اور ناگواری سے فیصل کو دیکھنے لگا تھا۔

”تیری آنکھوں میں لکھی ناگواری کی تحریر سے بچنے کے لئے ہی میں نے کبھی تجھے نام نہیں بتایا، جب کہ میں نے محبت کی ہر شدت تجھ سے شیرنکی ہے، میں جانتا ہوں ارحم! کہ زرمین تیری کزن ہے اور عزت و غیرت دار بھائیوں کے لئے کسی غیر مرد کے منہ سے اپنی بہن کا نام سننا ممکن ہی نہیں ہوتا اور باخدا میں آج بھی تجھ سے کچھ نہ کہتا مگر اب میرا زرمین سے شرعی رشتہ بنونے والا ہے اس لئے مجھے کچھ بتانا معیوب نہیں لگا۔“

”کھو کیا کہہ رہا ہے، یا کہتا چاہتا ہے؟ میں بالکل نہیں سمجھا۔“

”کیا مطلب.... کیا تجھے نہیں پتہ کہ زرمین کی مجھ سے شادی ہونے والی ہے؟“ اُس کے نفی میں سر ہلا دینے پر اُس کی حیرانگی بڑھ گئی تھی۔

”مجھے واقعی ایسی کسی بات کا علم نہیں ہے۔“ وہ زور سے کر بولا تھا۔

”کل ہی تو تمہارے ماموں جان نے ہمیں مثبت جواب دیا ہے اور انہوں نے کہا کہ مگنی وغیرہ سے بہتر 3 ماہ بعد شادی۔“

”ادھوری نہیں.... پوری بات تفصیل سے بتاؤ۔“ ارحم نے اُسے ٹوکا تھا اور وہ اُسے تفصیل بتانے لگا تھا۔

”تم تو جانتے ہو ارحم! کہ فیصل کی بات ماموں کی بنی میرا سے طے ہے اور مامانی کی ڈیٹھ کو کافی عرصہ ہو گیا ہے اور آج کل ماموں جان کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی بس اسی لئے وہ شادی پر زور ڈال رہے تھے کہ ان کی انکونی بیٹی کی شادی ان کی زندگی میں ہی ہو جائے بس اسی لئے ماما میرے سر پر سوار ہو گئیں کہ میں شادی کے لئے حامی بھریوں کیونکہ وہ ہم دونوں بھائیوں کی شادی ساتھ کرنا چاہتی ہیں، ویسے بھی فیصل مجھ سے چھوٹا ہے اور مجھ سے پہلے اس کی شادی وہ کرنا نہیں چاہتیں، اسی لئے ماما نے کہا مجھے کوئی پسند ہے تو میں بتا دوں وہ نہ خود میرے لئے لڑکی پسند کر لیں گی، اور میں نے زرمین کا نام لے دیا اور مادہ تو فوراً ہی راضی ہو گئیں، اُسی وقت تمہاری ماما کو فون کیا کہ وہ تمہارے ماموں سے میرے رشتے کی بات کریں، 3 دن بعد ہی آئی کا فون آ گیا کہ ماما باقاعدہ میرا رشتہ لے کر تمہارے ماموں کے گھر چلی جائیں اور آج سے 2 دن پہلے ہی ماما زرمین کا رشتہ لے کر گئیں جو اُسی وقت منظور ہو گیا، تمہارے ماموں جان کی مرضی تھی کہ ابھی مگنی ہو جائے سال بھر بعد شادی، مگر ماموں کی طبیعت کے پیش نظر تمہارے ماموں راضی ہو گئے، بلکہ ہی تو تمہاری ماما نے فون کر کے کہا تھا کہ 3 ماہ بعد کی ڈیٹھ گڈ کر لیتے ہیں، کیونکہ میرا خیال ہے ارحم اور مادہ کی شادی بھی ساتھ ہی ہوگی۔“ فیصل نے ساری تفصیل بتا کر آخر میں اپنا خیال بھی ظاہر کر دیا تھا۔

”اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں۔“

”تیری مصروفیت....!“

”کہیں کا ذرا برا عقلم نہیں لگ گیا ہوں جو مجھے ذرا سی بھی فرصت نہیں ہے، مجھے ہر بات سے ایسے بے خبر دکھا گیا جیسے میرا کسی سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔“ ارحم کو حقیقتاً دکھ پہنچا تھا۔

”تو فضول میں بدگمان ہو رہا ہے ارحم! اور نہ جو کچھ ہوا وہ محض 3 دنوں میں ہی ہوا، اور میں تو تجھ سے کبھی کچھ

”اپنے تشدد کے طریقے اپنے پاس رکھ، اور شرافت سے کچھ آؤر کر، سخت بھوک لگ رہی ہے، تیرا جب فون آ میں گھر کے لئے ہی نکل رہا تھا اس لئے یہاں آ گیا اور ٹو ہے کہ مجھ پر ہی اپنی انکیزی کے جوہر دکھانے لگا۔“

”بتاؤ کیا آؤر کرتا ہے، بچپن سے ٹونڈیدہ واقع ہوا ہے، کھانے کا شوق ہے مگر بیل بھر کے نا موصوف کو ذرا سا بھی خیال نہیں آتا۔“ ویز کو اشارہ کیا تھا جبکہ فیصل ڈھٹائی سے ہنس دیا تھا کیونکہ ارحم نے کہا بالکل ٹھیک تھا کہ بیل ہمیشہ ارحم ہی ہے کہ ہاتھ تودہ تو مت غی و شتر آؤر کرتا رہتا تھا کیونکہ وہ کھانے پینے کا بے حد شوقین تھا۔

”پچھلے دنوں میں ایک کس کے سلسلے میں دیر تک مصروف رہا، رات گئے گھر آیا تھا اور نہ ماما، ضرور انکل کی طبیعت کا بتا تیں۔“

”آئی راحم کے ساتھ آئی تھیں پایا کو دیکھئے، تب انہوں نے تمہاری مصروفیت کا بتایا تھا اسی لئے میں نے تم سے کوئی ذکر نہیں کیا۔“ وہ بھرگ سے انصاف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”فیصل! میری سمجھ میں نہیں آتا، ٹوکھا اور بول ایک ساتھ کیسے لیتا ہے؟ مجھ سے کبھی نہیں ہوتا۔“ وہ اس کی اسپینڈ سے پریشان ہوا تھا۔

”پولیس لائن میں آ گیا ہے نا تو اب ہو جایا کرے گا۔“ اُس نے چھیڑا تھا۔

”تو کون سے جنم میں حوالدار تھا جو ایسے کہہ رہا ہے؟“ وہ تپ گیا تھا۔

”یار! میرے تو پورے خاندان میں کوئی حوالدار نہیں گزرا، ہاں ماما بتاتی ہیں ان کی بیٹ فرینڈ کا بیٹا ضرور حال میں ہی حوالدار مقرر ہوا ہے۔“ وہ جو بڑے غور سے اُس کی بات سن رہا تھا آخر میں اُس کی بات کا مطلب سمجھ کر اُسے گھورنے لگا تھا اور اُس نے زبردست قہقہہ لگایا تھا، جس کی وجہ سے کتنے ہی لوگ ان کی ٹیبل کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

”گدھوں کی طرح ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تیرا بیڈر دم نہیں پلک پلک ہے۔“

”ہاں یار! تو نے ٹھیک کہا، مگر آج کل مجھے میرا بیڈر دم بھی کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔“ ارحم نے اُسے احساس دلایا: چاہا تھا تب اس نے مصیبت طاری کی تھی جبکہ اس کے تو خاک بھی پلے نہیں پڑا تھا۔

”میں تیری اس کبواس کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”یار! صاف بات ہے، اس کمرے میں اکیلے رہتے ہوئے تو زندگی گزر گئی، اب تو بس یہی خواہش ہے کہ میرے کمرے کے ساتھ میرے وجود کو آباد کرنے والی جلدی سے آجائے۔“ اس نے ایک اداسے کہتے ہوئے کولڈرنک کے سپ لین شروع کر دیئے تھے۔

”مجھے تو اُس بے چاری کے حال پر ابھی سے ترس آنے لگا ہے جو تیری بیوی بنے گی، روز ہی رویا کرے گی بے چاری۔“

”اللہ نہ کرے، روئیں اُس کے دشمن، بار بار یہ دعا تو مت دے۔“

”سوری فیصل! میں تو بس مذاق کر رہا تھا، میں بددعا نہیں دے رہا تھا، کیا میں تجھے بددعا دے سکتا ہوں؟“

”ادھر میرے یار! ایک دم انٹرلیس مت ہو جایا کر، میں بھی مذاق کر رہا تھا اور ذرا ویز کو بلا کر پوچھو آؤر ڈر کر دے۔“ اُس کی فرمائش پر اس نے ویز کو ایک بار پھر اشارہ کیا تھا۔

”فیصل! تو نے کبھی بتایا نہیں وہ لڑکی آخر ہے کون جس سے تُو محبت کرتا ہے؟“ نیپکن سے ہاتھ صاف کرنے ہوئے اُس نے استفسار کیا تھا۔

نہیں چھپایا تو اپنی زندگی کی اتنی بڑی خوشی تجھ سے کیوں چھپاتا؟ مگر تو ہرٹ ہوا ہے تو آئی ایم سوری ارحم! مجھے تیری ناراضی کی فکر نہ ہوتی تو میں تجھے ضرور بتاتا کہ زمین کے لئے میں کس طرح سے سوچتا ہوں، ریلنگی دیری سوری! فضیل نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور وہ ہلکے سے مسکرا دیتا تھا۔

”اس اوکے لیکن تجھے کیا لگتا ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ تو زمین کو پسند کرتا ہے، اتنا بے وقوف نہیں ہوں، سب خبر تھی مجھ کو کہ تیرے کیا ارادے ہیں۔“ وہ فضیل کو تنگی نگاہوں سے دیکھ کر بولا تھا۔

”ٹوٹے کسی ظاہر نہیں کیا۔“ وہ متحیر ہوا تھا۔

”جب ٹوٹے مجھے نہیں بتایا تھا تو میں کیوں ظاہر کرتا کہ میں تیرے بتائے بغیر بھی تیرے دل کی بات جان گیا ہوں اور احسان مان میرا کہ میں نے تیرے عشق کی نیا کوڈو بننے سے بچالیا۔“ فضیل اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

”مما، زمین کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔“

”واٹ...؟“ اس کے انکشاف پر وہ بڑی طرح چٹا ہوا تھا۔

”زیادہ مت چٹا، ایسا نہ ہو میرے تجھے اٹھا کر رینٹونٹ سے باہر پھینک دیں۔“ اس کی کیفیت سے وہ حفا اٹھا رہا تھا۔

”اس سے پہلے کہ میں تیرا گلا دیاؤں، صاف صاف بول آخر بات کیا ہے؟“

”بات کچھ نہیں ہے، ماما چاہتی تھیں کہ میری شادی زمین سے ہو جائے مگر میں نے زمین کے بارے میں ایسے کبھی نہیں سوچا۔“

”سوچنا بھی مت، ورنہ جان لے لوں گا۔“

”ہاں، مار لے جتنے ڈائیا لگ مارنا ہے مار لے، ابھی تو بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے ورنہ مت کہو بے بیٹھا تھا، وہ تو میری چھٹی جس نے مجھے سمجھا دیا تھا ورنہ، مجھے تو کوئی لڑکی پسند نہیں تھی میں نے تمہاری پسند کی لڑکی پر سرجھکا دینا تھا اور تو نے ناکام عاشق بن جانا تھا، منہ سے پھر بھی کچھ نہ کہتا تھا مجھے رقیب سمجھ کر رات دن کو ستا رہتا، پھر کہاں کا دوست اور کہاں کی یاری؟“ اس نے زبردست طریقے سے فضیل کو تھپتھپاتا تھا۔

”دوست ہو تو تیرے جیسا، جیو میرے یار! دیسے یہ بتا کہ میری پسند ہے نالا جواب؟“ وہ کہاں زیادہ دیر تنجید کر سکتا تھا۔

”ہاں، تمہاری پسند واقعی لاجواب ہے، زمین لاکھوں میں ایک لڑکی ہے اور کان کھول کر سن لے تو نے میرا بہن پر ظلم کرنے کی کوشش کی تو حوالات میں بند کر دوں گا۔“ اس نے اپنی دردی کا رعب جھاڑا تھا۔

”آپ کا ہر حکم سر آگھوں پر سارے صاحب! میری یہ مجال کہ میں ایک انپکڑی بہن پر ظلم و ستم کروں، معافی دے سرکار!“ اس نے ہتے ہوئے مسخرے پن سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے اور اس نے بھی جوابا ہتے ہوئے ہاتھ جکا سا بنا کر اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں پر مارا تھا۔

”یار! میں بہت خوش ہوں، مگر یہ نہیں جانتا کہ زمین میرے بارے میں کیا سوچتی ہے وہ اس رشتے سے خوش بھی یا نہیں؟“ نگرانی لائق ہوئی تھی۔

”تو زیادہ کیوں سوچتا ہے، جب اتنے برس انتظار کیا ہے تو 3 ماہ اور سہی، بتا دینا اسے اپنی محبت کی داستان، اور اس کی شدت، اور ویسے بھی لڑکیاں تو ہوتی ہی بہت معصوم ہیں، جہاں ان کے پیڑ میں شادی کر دیتے ہیں کر لیتی ہیں جس سے شادی ہوتی ہو وہ ناپسند بھی ہو تب بھی خود کو اس کی پسند کے سانچے میں ڈھال کر تن و من سے صرف اس کی

ہو جاتی ہیں۔“

”تجھے بڑا ایکسپیرٹنس ہے، کسی کو کہیں ٹول تو نہیں دے بیٹھا، بتا کوں ہے؟“

”میری زندگی میں ابھی تک کوئی لڑکی نہیں ہے، جب کبھی دل سے کسی کا گزر ہوا تو سب سے پہلے تجھے ہی بتاؤں گا۔“ چائی سے کہا تھا۔

”میرا خیال ہے تجھے بھی اب سیریس ہو جانا چاہیے اور میرا نہیں خیال کہ اتنی تیری شادی سے پہلے راحم کی کریں گی۔“

”یار! میں شادی سے انکار نہیں کرتا، مگر ابھی بالکل نہیں کر سکتا، ابھی تو میرا کیریئر شروع ہوا ہے، مجھے ابھی اپنی پہچان بنانی ہے، کم از کم 4 سال تک تو میں شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اس سلسلے میں میری ماما سے بات ہو چکی ہے، اس لئے وہ راحم کی شادی کر دیں گی اور جہاں تک میری بات ہے اگر کوئی پسند آگئی تو ماما کو بتا دوں گا اور نہیں آئی تو ماما کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لوں گا۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی تھی اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے جانے کے لئے اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے ایک بھر پور شام ایک ساتھ گزاری تھی اور یہ بہت دنوں بعد ہوا تھا وگرنہ روز ہی اس طرح گھنٹوں کے لئے ملا کرتے تھے۔

☆.....☆.....☆

”اتنی صبح کہاں جانے کی تیاری ہے؟“ اجند نے تک سب سے تیار حنین کو دیکھ کر استفسار کیا تھا۔ وہ اپنی معمول کی تیاری سے بہت ڈیفرنٹ تیار ہوئی تھی کیونکہ وہ عموماً ڈارک کلرز پہنتی تھی جبکہ اس وقت اس نے لائٹ آسانی کلر کا کاشن کا سوٹ پہنا ہوا تھا جس پر فیروز کی کلر سے ہاتھ کی لڑھائی تھی اور لائٹ نیچرل میک اپ میں اس کے خوبصورت نین نقش ابھر کر اس کو مزید خوبصورت بنا رہے تھے۔

”اجند بھائی! آج آفس میں میرا فرسٹ ڈے ہے، میں آج سے آفس جوائن کر رہی ہوں۔“ اس نے سلاکس کھرتے ہوئے بتایا تھا۔

”تم آفس نہیں آؤ گی۔“ وہ قطعیت سے بولا تھا۔

”آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے میں تایا ابو سے اجازت لے چکی ہوں۔“

”میں ابو سے بات کر لوں گا مگر تم سن لو کہ تم گھر میں رہو گی، آفس جوائن نہیں کرو گی۔“ وہ ناشتہ کیے بغیر کرسی کھسکا کر اسے گھورتا ہوا اٹھ گیا تھا اور اسی وقت ساجدہ بچن سے نکل کر آئی تھیں۔

”اجند بیٹا! تم ناشتہ کر لو، اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔“

”قطعاً نہیں چچی! ابو نے اس کو اجازت دے کیسے دی؟“

”آپ جا کر خود اُن سے پوچھ لیں اور میں آفس ضرور آؤں گی، آپ مجھے روک نہیں سکتے۔“ وہ آرام سے ناشتہ ختم کر رہی تھی۔

”میں بھی دیکھتا ہوں، تم کیسے آفس آتی ہو۔“ وہ غصے سے کھولتا پلٹا تھا کہ باپ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

”اجند! ناشتہ کر لیا؟“ راشدہ نے پوچھا تھا مگر اس نے جواب دینے کی بجائے باپ سے پوچھا تھا۔

”ابو! آپ نے اسے آفس جوائن کرنے کی اجازت کیوں دی؟“

”تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ وہ بیٹے کے غصے کو کسی خاطر میں نہیں لائے تھے۔

”ابو! مجھے اعتراض ہے، شین آفس نہیں آئے گی۔“

”آپ میری کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے؟“ اجدا کا آج دماغ گھوما ہوا تھا وہ درگزر کے ساتھ اونچی آواز اور سختی کا جھل ہی نہیں تھا مگر آج جو کچھ مانگنے کی ٹیمبل پر ہوا اس کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا، وہ اپنے اسٹنٹ اور پرسنل سیکریٹری کو بھی ڈانٹ چکا تھا، وہ پہلے ہی غصے میں تھا اور مستقل آتی کال اس کے غصے میں اضافے کا باعث بن رہی تھی، اس نے ٹیش کے عالم میں موبائل دیوار پر مارنا چاہا تھا کہ بیچ ٹون بجی تھی اور نجانے کیا سوچ کر اس نے بیچ اوپن کیا تھا۔

”آپ نے اب میری کال ریسیو نہیں کی تو میں آپ سے اتنی دور چلی جاؤں گی کہ آپ میری آواز سننے اور شکل دیکھنے کو بھی ترس جائیں گے۔“ بیچ پڑھنے کے بعد خود بہ خود اس کی انگلیاں کال ملانے لگی تھیں۔

”ہیلو!“ بڑی بے قراری سے کہا گیا تھا۔

”فارغ نہیں بیٹھا تھا کہ تمہاری کال فوراً ریسیو کر لیتا، ہزاروں کام ہوتے ہیں۔“

”آپ مجھ سے اس طرح بات کیوں کر رہے ہیں؟“

”دماغ خراب ہو گیا ہے میرا، اور بس....! تم گویا ایسی کیا ایمر جنسی تھی کہ اسی وقت بات کرنا تھی، اور بیچ میں کیا بکواس لگتی تھی؟“

”وہ بکواس نہیں تھی، خالہ جان میری شادی کر رہی ہیں، اور میں صرف آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں اجدا! آپ اپنے پیرنس کو میرا رشتہ لے کر مجھیں۔“

”جہاں تمہارے گھر والے تمہاری شادی کر رہے ہیں وہیں خاموشی سے شادی کرلو۔“ یہ بات اس نے جس طرح کہی تھی وہی یاد آتا تھا اور فون کی دوسری جانب موجود میری کاپ ہی تو گئی تھی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”سنائی نہیں دیا تھا تو ایک بار پھر کہہ دیتا ہوں، میرا خیال دل سے نکال کر جس سے خالہ تمہاری شادی کریں کرلو، میرے پیرنس تمہارے گھر نہیں آئیں گے۔“

”لیکن کیوں اجدا؟ آپ نے تو کہا تھا آپ اپنے پیرنس....!“

”وہ سب جھوٹ، بکواس تھا۔“

”آپ مجھ سے فلرٹ کر رہے تھے؟“ اس کی آواز طلق میں چھنے لگی تھی۔

”بہکی کچھ لو اور آئندہ اس نمبر پر کال....“

”آپ بھلے مجھ سے فلرٹ کر رہے ہوں، مگر میں نے آپ سے کبھی محبت کی ہے۔“

”قفسے کہانوں کی ردوداد مجھے مت سننا۔“

”آپ کو میری محبت جھوٹی داستان لگتی ہے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ ایسا کریں گے۔“

”اب پتہ چل گیا ہے ناں، تو میرا بیچا چھوڑ دو۔“

”مجھ سے بیچا چھڑانے کی بہت جلدی ہے ناں آپ کو، تو میری بھی سن لیں، میں نے صرف آپ سے محبت کی ہے، اور میں جان تو دے سکتی ہوں مگر کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی، بہت جلد آپ کو میری شادی کی نہیں موت کی خبر سننے کو ملے گی۔“

”میرٹی!“ اس کی چھت اُسے اپنے سر پر گرتی محسوس ہوئی تھی۔

”میں حنین کو اجازت دے چکا ہوں۔“

”آپ نے شاز مین کو تو اجازت نہیں دی تھی، پھر حنین کو کیوں دی؟“

”جہیں صرف اس لئے امتزاج ہے کہ میں نے شاز مین کو اجازت نہیں دی تھی؟“

”یہ بات نہیں ہے ابو! کیونکہ میرے لئے جیسے شاز مین ہے ویسی ہی حنین بھی ہے، اور مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ میری بہن نوکری کرے۔“

”میں کہیں اور جاب نہیں کر رہی، اپنے خاندانی بزنس....!“

”جاب، جاب، جاب ہوتی ہے حنین! اور یہ میں نہیں چاہتا کہ تم آفس آؤ۔“

”مگر میں آؤں گی، کیونکہ اگر بزنس پر آپ کا حق ہے تو میں بھی اس بزنس پر پورا حق رکھتی ہوں، ابو کی تمام برابری کی میں اکیلی وارث ہوں۔“ وہ بے سوچے سمجھے جتنی سب کو حیرانگی کے ساتھ سمندر میں اتار گئی تھی۔

”حنین! تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی ایسی گری ہوئی بات کرنے کی؟“ ساجدہ نے غصے سے اُسے تھپڑ کھینچ مارا تھا سب جو اس کی بات کے اثر سے ہی نہیں سنبھلے تھے کہ ساجدہ کا اقدام انہیں مزید حیران کر گیا تھا۔

”خبردار، جو ایسا کچھ منہ سے نکالا، بھائی صاحب کے ہم پر احسان کم نہیں ہیں اور تم احسان فراموش....!“ انہوں نے دوبارہ ہاتھ اٹھایا تھا کہ راشدہ بیچ میں آگئی تھیں۔

”ساجدہ! پاگل ہو گئی ہو؟“

”اس لڑکی نے مجھے پاگل ہی تو کر دیا ہے، اتنی جھجھکوں کے صلے میں یہ آپ لوگوں کو کیا دے رہی ہے؟“ وہ افسوس اور تاسف بھری نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔

”اور میرا فیصلہ بھی نہیں بدلے گا، تم آفس میں قدم بھی نہیں رکھو گی۔“ وہ اُسے حیرت نظروں سے دیکھتا ہوا ریف کس اٹھائے باہر نکل گیا تھا۔

”دیکھ لیا تم نے، زندگی میں پہلی دفعہ اجدا صرف تمہاری وجہ سے بھوکے پیٹ غصے میں نکلا ہے، میں جہیں....“

”ساجدہ! بات کو بڑھانے سے فائدہ نہیں ہے۔“ انہوں نے ساجدہ کو قابو کیا تھا جو بیٹی کو مارنے کے لئے چلی تھیں۔

”تایا ابو! جب آپ نے خود مجھے اجازت دی ہے تو اجدا بھائی مجھے کیسے منع کر سکتے ہیں؟“

”حنین! آپ اس وقت اپنے کمرے میں جاؤ، میں اجدا کو بھانڈاں گا۔“

”لیکن تایا ابو! آج مجھے آفس جوائن کرنا تھا، آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔“

”حنین! تم نے نوید نے کچھ کہا ہے، جہیں سنائی نہیں دیتا؟“ راشدہ کے ڈپٹے پر وہ بات روک گئی تھی۔

”آج نہیں تو کل، لیکن مجھے ہر حال میں آفس جوائن کرنا ہے، اجدا بھائی نہیں چاہے کہ میں آفس جاؤں تو میں کہیں اور جاب ڈھونڈ لوں گی، مگر یہ تو طے ہے کہ مجھے جاب کرنی ہے۔“ وہ بات مکمل کر کے وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی

جبکہ اس کی اتنی بدتمیزی پر سب ہی حیران رہ گئے تھے۔

”آپ سب لوگوں سے میں بے حد شرمندہ ہوں، مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ابھی اتنی بدتمیزی جو کر کے گئی وہ میری ہی بیٹی ہے، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ میری بیٹی بڑی ہو کر اس قدر بد لحاظ و بد تمیز ہو جائے گی۔“ وہ کسی کو بھی دیکھے بغیر

کہہ کر روٹی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھیں، آج صبح معنوں میں انہیں شوہر کی محسوس ہوئی تھی، مگرے میں بھی آکر کتنی ہی دیر روٹی رہی تھیں۔

”فلٹ آپ کر رہے تھے، میں نہیں، اور میں محبت پر جان قربان کر دوں گی۔“ وہ رونا نہیں چاہتی تھی، مگر آنسو اس کے چہرے کو تر کر رہے تھے۔

”پاگل ہو گئی ہو یرنی!“

”ہاں، ہاں! میں پاگل ہو گئی ہوں، آپ کی محبت دچاہت میں۔“

”آپ کو میری محبت فضول لگتی ہے اور میں ثابت کروں گی کہ میری محبت آپ کی محبت کی طرح جھوٹ، فریب نہیں ہے۔“ اس نے موبائل آف کر کے بیڈ کی سائیڈ پر ڈال دیا تھا اور ٹیکے میں منہ چھپائے اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی، اجد تو اس کی اتنی شدت پر حیران رہ گیا تھا اور بڑی بے قراری سے اس کا نمبر ڈائل کر رہا تھا، تیل تو جاری تھی مگر وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔

”ڈیم اسٹ! کال تو ریسیو کرو پاگل لڑکی!“ آٹھویں کال پر اس نے لیس کیا تھا۔

”میرنی!“

”مگر کی یرنی، آپ نے مار دیا اُسے، اب یہاں کال کیوں کر رہے ہیں؟ فلٹ کر رہے تھے ناں مجھ سے؟ تو اب کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ میں جیوں یا مردوں آپ کو اس سے مطلب؟“

”مطلب ہے۔“ اس کی بھرائی ہوئی آواز اسے پریشان کر رہی تھی۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”مگر میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی، بہت بنا لیا آپ نے مجھے بے وقوف، مگر اب میں آپ کے ہاتھوں بے وقوف ہرگز نہیں بنوں گی۔“

”میری بات تو سنو یرنی!“

”جہیں سنی مجھے آپ کی کوئی بات، آپ بہت امیر ہیں نا؟ آپ کو تو کوئی بھی مالدار لڑکی مل سکتی ہے، میری جیسی غریب لڑکیوں سے تو آپ جیسے امیر زادے شخص فلٹ کرتے ہیں، ہمارے جذبات سے کھیلتے ہیں، ہماری بے بسی کا مذاق اڑاتے ہیں۔“

”بکواس نہیں کرو۔“

”اب میری ہر بات بکواس ہی لگے گی نا، مگر میں بکواس نہیں کر رہی اجد! آپ نے میرے جذبات کو بری طرح ٹھیس پہنچائی ہے، مجھے زندگی کسی اچھی نہیں لگی، سسکتی ہوئی زندگی، آپ سے ملنے کے بعد جانا زندگی کتنی حسین ہے، جینے کی تمنا کرنے لگی تھی میں، اور آج آپ نے ساری تمناؤں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا، میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی، میری موت کے بعد تو آپ بھی سکون سے نہیں جی سکیں گے۔“

”شٹ اپ، اب ایک لفظ اور کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا، اسٹاپ پراؤ، میں تمہیں پک کر لوں گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے غصے سے کہہ رہا تھا۔

”مگر میں۔۔۔!“

”کہاناں۔۔۔ کچھ مت بولو۔“ گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے اُسے ڈپٹا تھا۔

”میں نہیں آؤں گی۔“ وہ چیختی تھی۔

”میں پہنچ کر تمہیں میج کر دوں گا، اور تم 5 منٹ میں نہیں آئیں تو میں تمہارے گھر آ جاؤں گا۔“ پارکنگ کی طرف

جاتے ہوئے دھیسے لہجے میں کہا تھا۔

”آپ اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ وہ دھیمی پڑ گئی تھی۔

”آؤ تو بتاؤں گا۔“ یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا، اس کے آفس سے یرنی کے گھر تک کا راستہ تقریباً 45 منٹ کا تھا مگر وہ محض 25 منٹ میں ریش ڈرائیونگ کرتا ہاں پہنچا تھا، میج کرنے کے 10 منٹ بعد وہ ایک تنگ، پتلی سی گلی سے آتی دکھائی دی تھی، اور اس نے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

”آپ کو جو بات کرنی ہے یہیں۔۔۔“

”خاموشی سے بیٹھتی ہو یا چاہتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ زبردستی کروں؟“ اجد نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا تھا، تلکے کاٹن کے پرنڈ سوٹ میں بڑی سی سیاہ چادر میں وہ خود کو لپیٹے اور اُسی کا حصار چہرے پر کیے بیگ آنگھوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی اور اُس نے فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی وہاں سے بڑی تیزی سے نکالی تھی۔

☆.....☆.....☆

”بھابی بیگم! آپ بات کر لیں بھائی صاحب سے، پھر وہ جیسا کہیں گے میں مہوش سے کہہ دوں گی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے فریدہ! مگر مجھے نہیں لگتا کہ نوید راضی ہوں گے، 15، 20 دن میں شادی کرنا آسان نہیں ہے۔“ وہ گوگولی کیفیت میں بولی تھیں۔

”بھابی بیگم! تیار یا تو 20 دن میں بھی ہو سکتی ہیں، اور ففیل دیکھا بھالا لڑکا ہے، فیملی کو ہم اچھے سے جانتے ہیں اور مہوش کو جہیز وغیرہ نہیں چاہیے۔“

”لیکن فریدہ! ہم بنی کو خالی ہاتھ رخصت تو نہیں کر سکتے۔“

”لیکن جہیز لینے سے مہوش اور فیاض بھائی دونوں نے ہی سختی سے منع کر دیا ہے، وہ کہہ رہے تھے شادی 20 دن میں ہو یا 20 ماہ بعد، وہ جہیز نہیں لیں گے، خدا کا دیا ان کے پاس سب کچھ ہے وہ صرف زمین کو رخصت کر کے لے جانا چاہتے ہیں۔“

”یہ باتیں فون پر کرنے کی نہیں ہیں، مگر آؤ گی تو بات کریں گے، ہم اپنی لڑکی کو خالی ہاتھ تو کبھی رخصت نہیں کریں گے، یہ بات مہوش کے کان میں ڈال دینا۔“

”مہوش سے میری تفصیل سے بات ہو چکی ہے، وہ جہیز لینے سے منع کر رہی ہے مگر اُس نے کہا ہے کہ آپ زمین کو جو دینا چاہیں دے سکتی ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“

”اُسے بھابی بیگم! صاف بات تو ہے، گھر کے ساز و سامان یعنی فرن، ٹی وی، فرنیچر وغیرہ جیسی چیزوں سے ہٹ کر آپ زمین کو زیور، کپڑے جو چاہیں دیں، وہ لوگ زمین کو کچھ دینے سے منع نہیں کر رہے اور جب ان کے گھر میں یہ ساز و سامان پہلے سے موجود ہے تو وہ نہیں لینا چاہ رہے اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے، آپ یہ سب بھابی صاحب کو بتا کر کوئی فیصلہ کر لیں، میں رات کو یا پھر کل فون کروں گی۔“ ارحم کو تو آتے دیکھ انہوں نے کہا تھا اور فون رکھ کر اس تک بھی آئی تھیں۔

”السلام علیکم! ممما!“

☆.....☆.....☆

(جاری ہے)

انعم نذیر

مکمل ناول

میر کی عید تھی ہو

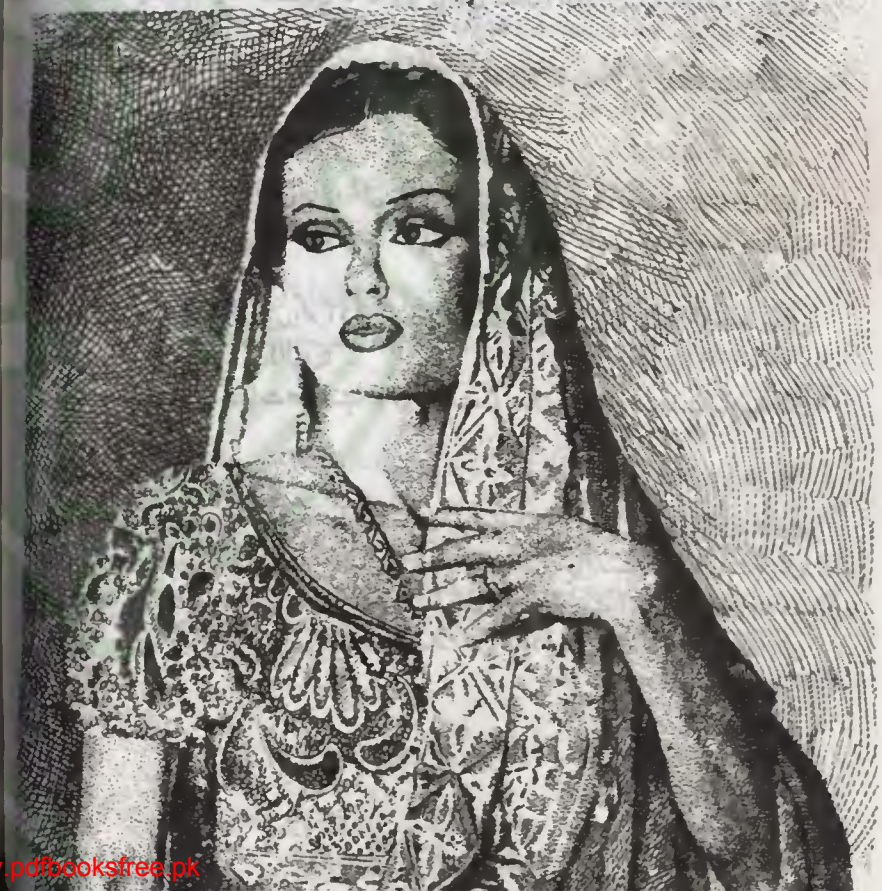
آخری حصہ

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اچھی طرح چیک کرنا تھا آپ اچھی طرح دوبارہ دیکھیے“ میں زید بھائی کو فون کرتی ہوں۔“

”کیا ہوا زاریہ! صائم کہاں ہے؟“ بھائی نے بے قراری سے پوچھا۔
”بھائی! صائم اسکول میں نہیں ہے نہ ہی اسکول کے باہر ہے۔“ زاریہ نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا، بھائی
”جواں دھار روئے لگیں۔“

”پلیز بھائی! حوصلہ کریں میں زید بھائی کو فون کرتی ہوں۔“
”زید بھائی! وہ صائم اسکول سے عائب ہے۔“ زید کے پیلو کہتے ہی اس نے بے قراری سے کہا۔
”کیا کہہ رہی ہو؟ زاریہ!“ وہ گھبرا گیا۔
”اوکے میں آتا ہوں۔“ زید نے جگت میں کہا اور فون بند کر دیا۔
”بھائی! پلیز.... رویئے نہیں دعا کریں زید بھائی آ رہے ہیں۔“ پھپھو بھی بازار سے آئیں تو ان دونوں کو روکنا
دیکھ کر گھبرا گئیں۔

”نمرہ زاری! کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو تم دونوں؟“

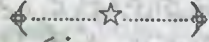


ساتھ بس یہیں تک تھا۔

”زاریہ! میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ ذوالنون شاہ نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے اس کا شانہ ہلایا، وہ بے ساختہ اس کے کندھے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کیسے وہ اس پیارے انسان کا دل توڑ دے؟ آنسو روانی سے بہہ رہے تھے پھر وہ اٹھی اور بھاگتی ہوئی نیچے آگئی، صائم کو خود میں پھینچے ہوئے پھر سے رونے لگی، بے ساختہ اس کی پیشانی بار بار چوم رہی تھی، پھپھو نے آگے بڑھ کر ان دونوں کو الگ کیا۔

”زاریہ! میری جان! چپ ہو جاؤ۔“ پھپھو نے اسے اپنے ساتھ لگایا، لیکن وہ اشد شدت سے روتی رہی، وہ انہیں کیسے بتاتی کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گئی، جو شخص اسے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھا، اس کی محبت تھا وہی اس سے چھینا جا رہا تھا۔

”زاریہ! چپ کرو، صائم ماشاء اللہ سے بالکل ٹھیک ہے۔“ ذوالنون شاہ نے کہا، وہ تو اس کے آنسو دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا، بھی اس نے اسے آنسو صاف کیے اور زبردستی سکرا نے کی کوشش کی، جس میں وہ بڑی طرح ناکام ہو گئی، سر جھکا کر آنسو پینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔



اس حادثے کو پانچ دن بیت گئے تھے، وہ سب حیران تھے، انہوں نے انہوں نے بغیر کسی ڈیمانڈ کے صائم کو چھوڑ دیا، اگر ایسا کرنا تھا تو انہوں کیوں کیا؟ سوائے زاریہ کے اور کسی کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔

”ذوقہ کرو اب اس معاملے کو ہمیں ہمارا بیٹا مل گیا۔“ پھپھو نے محبت سے صائم کی پیشانی چوم کر کہا۔

”زاریہ بی بی! آپ کا فون کب سے بج رہا ہے۔“ ملازمہ نے کہا تو وہ اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔

”السلام و علیکم! امام! کیسی ہیں آپ؟“

”علیکم السلام! ماما! میں بالکل ٹھیک ہوں، میری بیٹی کیسی ہے؟“ علینا شاہ نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔“ زاریہ نے آنکھیں سے کہا۔

”زاریہ! یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا؟“ علینا شاہ نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں ماما! بس گلا خراب ہے اس لئے آواز کچھ بھاری سی ہے۔“ اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”کسی ڈاکٹر کو دکھانا تھا، میڈیسن کی؟“ علینا شاہ نے فکر مندی سے کہا۔

”جی ماما! ہے۔“ زندگی میں پہلی دفعہ اپنی ماں سے جھوٹ بولا تھا۔

”مام! عتمان اور ڈیڈ کیسے ہیں، اور نام کیسا ہے؟“

”عثمان اور نیل بھی ٹھیک ہیں، اور تمہیں بہت مس کرتے ہیں۔“ علینا شاہ نے اداسی سے کہا۔

”مام! میں بھی آپ سب کو بہت مس کرتی ہوں۔“ وہ رونے لگی، علینا شاہ بوکھلا گئی۔

”زاریہ! میری جان! تم رو کیوں رہی ہو؟“ علینا شاہ بے چین ہو گئیں۔

”مام! آئی مس یو! میں لندن آنا چاہتی ہوں۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”زاری! نیکسٹ تمہاری منگنی ہے، ہم سب آرہے ہیں پاکستان، اس طرح اچا کہ تمہارا لندن آنا مناسب نہیں ہے۔“ علینا شاہ نے رسان سے کہا۔

”منگنی...؟ کیسی منگنی ماما! سب کچھ تو ختم ہو گیا۔“ اس نے دل میں کہا، وہ ہنسک اٹھی تھی۔

”زاریہ! کسی نے کچھ کہا ہے تم سے؟“ علینا شاہ نے پریشانی سے پوچھا۔

”وہ پھپھو! صائم اسکول سے غائب ہو گیا ہے۔“ زاریہ نے روتے ہوئے کہا، پھپھو ان دونوں کو حوصلہ دے رہی تھیں، اور خود بھی رورہی تھیں، شام کو زید بھائی اور ذوالنون لوٹے، خالی ہاتھ۔

”زید! میرا بچہ کہاں ہے؟“ بھائی تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں، پھپھو کی حالت بھی کچھ کم نہ تھی، زید بھائی خود بہ حد نڈھال لگ رہے تھے، اس نے فوراً ذوالنون شاہ کو فون کیا۔

”زاریہ! میں تم سے گھر آ کر بات کرتا ہوں، میں ابھی ایئر پورٹ سے باہر نکلنے لگا ہوں، آفس میں کچھ کام ہے اس لئے یہاں سے سیدھا آفس جا رہا ہوں، رات کو بات ہوگی۔“

”ذوالنون! میں نے ضروری بات کرنی ہے، صائم کو کسی نے کڈنیپ کر لیا ہے، اس نے بڑی طرح روتے ہوئے کہا۔

”پلیز... ذوالنون! گھر آ جاؤ، ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔“ اس نے التجائی ہو کر کہا۔

”او... ذرا! میں آ رہا ہوں، تم پریشان مت ہو۔“ پندرہ منٹ بعد وہ ان کے گھر تھا۔

”پلیز پھپھو، بھائی! اور زاریہ! آپ لوگ دعا کریں، روٹا کسی بھی مسئلے کا حل نہیں، آپ لوگ دعا کریں، صائم جہاں کہیں بھی خیریت سے ہو، ہم لوگ جا رہے ہیں پولیس اسٹیشن رپورٹ درج کرواتے ہیں، انشاء اللہ صائم مل جا۔“

ذوالنون شاہ نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔ رپورٹ درج کروادی گئی، لیکن ان لوگوں کو ایک پل بھی سکون نہ آیا۔ صائب نہ ہوا، ساری رات صائم کو یاد کرتے اور روتے ہوئے گزار دی، ذوالنون شاہ مسلسل ان لوگوں کے ساتھ تھا، صبح اس نے بھلا پھسلا کر سب کو ناشتہ کروایا، جو برائے نام تھا، نمبر بھائی کی حالت دیکھ کر اس کا دل بہت دکھی ہو رہا تھا، ایک ماں اپنے بچے کے لئے تڑپ رہی تھی، ذوالنون شاہ خود بھی بے حد پریشان تھا، ابھی تک تو کڈنیپ کا فون آ جانا چاہئے تھا، زاریہ کسی کام سے اپنے کمرے میں گئی، اس کا فون مسلسل بج رہا تھا، کل انجان نمبر سے آ رہی تھی، اس نے کچھ سوچ کر کال پک کر لی۔

”ہیلو...!“ اس نے بمشکل کہا۔

”کون... زاریہ؟“ فون کرنے والے نے تصدیق کی۔

”جی! میں زاریہ! آپ کون؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”انوار شاہ... کیسا گامبر اسرار؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا، ایک لمحے میں وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی، فیصلہ منٹوں میں ہو گیا تھا، وہ دنگ رہ گئی تھی۔

”آپ صائم کو چھوڑ دیں، آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“ اس نے بڑی طرح روتے ہوئے کہا، اس کے سامنے بھائی کا روٹا ہوا چہرہ گھوم گیا، پھپھو کی سسکیاں زید بھائی کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ، کل سے اب تک سب ہی لوگ اس اذیت سے گزر رہے تھے۔

”آپ ابھی صائم کو گھر پہنچا دیں، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی، صائم کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔“

”ٹھیک ہے، پندرہ منٹ میں صائم گھر پہنچ جائے گا۔“ انوار شاہ نے کہا، فون بند ہو چکا تھا۔ وہ وہیں کارپنٹ گر گئی، اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی، کس گناہ کی سزا اسے مل رہی تھی، کیسا امتحان تھا جو اس سے لیا جا رہا تھا؟ ذوالنون شاہ کو چھوڑنا اس کے بس میں نہ تھا، کیسے رہ پائے گی وہ اس کے بغیر؟ جانے وہ کتنی دیر اس طرح روتی رہی، جہی ذوالنون شاہ بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

”زار... زاریہ! صائم گھر آ گیا ہے۔“ اس نے ہرجوش لہجے میں کہا۔ ہر سرت سے اس شخص کو دیکھنے لگی، جس نے

”نہیں مام! آپ سب سے ملے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں، کبھی اتنا لبا عرصہ آپ سے دور نہیں رہی اس دل بھر آیا تھا۔“ اس نے بہانہ بنایا۔

”ہم سب بھی تم سے ملنے کے لئے بے چین ہیں، ان شاء اللہ اگلے ماہ ہم آ رہے ہیں اور اپنی بیٹی کی منگنی ہر شاندار طریقے سے کریں گے۔“ علیناہ شاہ نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

”اوکے مام! میں پھر آپ سے بات کروں گی بھابی مجھے ۱ رہی ہیں۔“ اسے اب خود پر کنٹرول کرنا مشکل رہا تھا، جسمی خون بند کر دیا۔ وہ دندویں آکھڑی ہوئی، ”سائے“ ”وائٹ گل“ پوری شان و شوکت کے ساتھ کھڑا تھا، یادیں اس محل کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں، ذوالنون شاہ کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ اسے یاد آئے لگا۔

”انوار شاہ! مجھے بلیک میل کریں، میں کسی بھی قیمت پر ذوالنون شاہ کو نہیں چھوڑ دوں گی۔“ اس نے اٹل لہجے میں سوچا۔

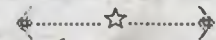
”تم نہیں جانتیں زاریہ! یہاں لوگ معمولی معمولی بات پر ایک دوسرے کی جان لے لیتے ہیں، دشمنی کی آگ میں سالوں جلتے رہتے ہیں، ایک دوسرے کو قبروں میں اتار کر بھی انہیں ٹھنڈک نہیں ملتی۔“ دور سے کہیں ذوالنون شاہ کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ کھبرا گئی، ”صائم والا واقعہ تو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔“ اور اگر انوار شاہ نے زید بھائی یا مانو کو کچھ کر دیا، نہیں نہیں، میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ وہ اپنی سوچوں میں گھری تھی اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل ایک بار پھر بجنے لگا۔ انوار شاہ کا نمبر دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا، اسے ضبط کرنا تھا اپنے لئے نہیں اپنے پیاروں کے لئے۔

”ہیلو...!“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”زاریہ! شاہ! میں نے اپنا کباج کر دکھایا، صائم کو چھوڑ دیا، اب تمہاری باری ہے، جلد از جلد اس ایٹھو ختم کرو، منگنی میں تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔“ وہ ساکت کھڑی انوار شاہ کو سن رہی تھی۔

”ذوالنون شاہ کو خود سے بدگمان کرنا ہے، اتنا کہ وہ تم سے نفرت کرنے لگے، کیسے کرنا ہے، کس طرح کرنا ہے، تم جانتی ہو۔“ انوار شاہ نے فتح سے پورے لہجے میں کہا۔ ”لائٹ کٹ چکی تھی وہ خالی خالی نظروں سے موبائل کی اسکرین پر دیکھ رہی تھی اس نے گہری سانس لی اور دندو سے دور آسمان کی طرف دیکھا، آنسو بھری آنکھوں نے جیسے آسمان سے آگے تک کا سفر کیا، اس کے ہونٹوں نے سسکاری بھری۔

”اے رب العزت! اے مالک کائنات! تھو رحیم ہے، کریم ہے، تُو سب جانتا ہے، کون غلط ہے اور کون صحیح؟ اگر آپ میرا استحقاق لینا چاہتے ہیں، میری آزمائش لینا چاہتے ہیں تو میں ثابت قدمی سے اس آزمائش پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی، اے اللہ! میرے اندر اتنا حوصلہ پیدا کر دے میں ثابت قدم رہوں، تیری ہر آزمائش پر پورا اتر دوں، اللہ پاک! انصاف کرنے کی طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے، میں اپنا فیصلہ آپ کو سونپ رہی ہوں، آپ میرے ساتھ ضرور انصاف کریں گے۔“ آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر اس کے رخساروں پر گر رہے تھے اور آنکھیں آسمان پر تھیں، دل اللہ سے ہمکا رہا تھا۔



دو دن اسی کشاکش میں گزر گئے کہ وہ ذوالنون شاہ کو کیا کہے اور کیسے کہے، کئی بار وہ اس کا نمبر ڈائل کر چکی تھی، بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آج تیسرا دن اور کل آخری دن۔ وقت بہت کم تھا اس کے پاس دو دن میں بیٹھی

”زارہ! کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ذوالنون نے فکر مندی سے پوچھا، کیونکہ وہ بہت چپ پٹ پی ہو گئی تھی اور حرکت بھی زرد ہو رہی تھی۔

”کچھ نہیں ٹھیک ہوں۔“ اس نے آنسو لہجے سے کہا۔

”اچھا میں تمہیں ایک گڈ نیوز بتاتا ہوں، کل صبح بابا جان اور لتاں جان یہاں آ رہے ہیں، ساری اریخ منٹ ہیں۔“ زاریہ نے اس کی کیفیت بہت عجیب سی ہو رہی تھی، قحط چہرے کے ساتھ وہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ذوالنون شاہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”زاریہ! مانا کہ صائم والا حادثہ ہم سب کو اذیت سے دوچار کر گیا تھا، مگر اب تو سب ٹھیک ہے، تمہاری مسکراہٹ بھی اس حادثے کے ساتھ معدوم ہو کر رہ گئی ہے، اس کیفیت سے باہر نکل آؤ، کچھ بھی اُلتا مت سوچو، اس طرح سوچ سوچ کر تم بیمار پڑ جاؤ گی۔“ ذوالنون شاہ نے بہت اپنائیت سے کہا، وہ کچھ نہ بولی، اس کا دل کر رہا تھا، کیسے وہ اس پیارے انسان کا دل توڑے؟

”زاریہ! کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟“ وہ بے چین ہو گیا۔

”میں صائم والے حادثے سے پریشان نہیں ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر...؟“ ذوالنون نے الجھ کر دیکھا۔

”نام نے مجھے پر پوز کیا ہے۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”واٹ...؟“ پہلے وہ شاک کے عالم میں اسے دیکھتا رہا، پھر جو ہنسا شروع ہوا، اتنا ہنسا یہاں تک کہ اس کی خوبصورت آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

”تم تو نمی بنتے مسکراتے رہو ذوالنون!“ اس کے دل سے دعا نکلی۔

”تو یہ ہے زاری! تمہیں تو مذاق کرنا بھی نہیں آتا، اور تم پر اتنے بڑے دن آگئے ہیں کہ ایک بلا تمہیں پر پوز کرنے لگا۔“ ذوالنون شاہ نے بڑی طرح ہنستے ہوئے اسے چڑایا۔

”یہ مذاق نہیں ذوالنون شاہ!“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم جو خرمی کہہ لو زاریہ! اب میں تمہاری بات پر یقین نہیں کروں گا، پہلے ہی تم مجھے آٹو بنا چکی ہو۔“ ذوالنون شاہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تو وہ نظریں پڑا گئی۔

”اس وقت میں جا رہا ہوں، کچھ کام ہے، کل تم نے گھر ضرور آنا ہے، کتنے دن ہو گئے ہیں تم نے چکر نہیں لگایا، کل لتاں سے ملنے ضرور آنا۔“ پھر اس نے کچھ سوچ کر ایک فیصلہ کیا، بغیر گھر میں کسی کو بتائے اس نے ریٹرن ٹکٹ منگوائے، رات کو اس نے ساری پیکنگ کر لی، آنکھیں اور دل دونوں رورہے تھے وہ جس نئی اندر سے آنے والی دہائیوں کو نظر انداز کرتی رہی، اگلے دن آمنہ شاہ نے اسے بلوایا، جب وہ گئی تو لاؤنج میں سب موجود تھے، حمزہ شاہ آمنہ شاہ، ذوالنون شاہ کے ساتھ کچھ ڈسکس کر رہے تھے، انوار شاہ منگل منو نے پر خاموش بیٹھے تھے، انہیں دیکھ کر اس کے قدم لاکھڑا گئے۔

”السلام علیکم!“

”بلکم السلام!“ آمنہ شاہ نے محبت سے اس کو ساتھ لگایا تو اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”زاریہ! میں نے بازار جانا ہے، تم بھی میرے ساتھ چلو، جو اپنی پسند کا خرید لینا۔“ آمنہ شاہ نے مسکراتے

نہ ہوا۔ تم باہل تو نہیں ہو گئیں؟“ ذوالنون شاہ نے غصے سے کہا جبکہ اس کے ماں باپ خاموش کھڑے تھے۔
 ”میں باہل نہیں ہوں! ایک ایک لفظ اپنے ہوش و حواس میں کہا ہے۔“ اس نے بے مروتی سے کہا۔
 ”زار یہ! میں اپنے پیرس کا اکلوتا بیٹا ہوں! میں انہیں اکیلا چھوڑ کر تمہارے ساتھ لندن کیسے جاسکتا ہوں؟“
 ذوالنون شاہ نے بے بسی سے کہا۔

”میرا پر اہل نہیں! تم یہ بتاؤ کہ تمہیں میری شرط منظور ہے یا نہیں؟“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔
 ”لیکن کیوں زار یہ! پہلے تو کبھی تمہاری کوئی ایسی خواہش نہ تھی۔“ ذوالنون نے بے چینی سے کہا ”ایک طرف اس کی محبت اور دوسری طرف اس کی فطرت! وہ کسی صورت دونوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔“
 ”پہلی بات اور تھی! صائم والے حادثے نے مجھے بہت کچھ باور کرایا ہے! آئے دن یہاں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے! میں کسی بھی صورت اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر سکتی اور نہ ہی یہاں رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھو.... زار یہ! لازمی تو نہیں کہ جو حادثہ دوسروں کے ساتھ پیش آیا ہو وہ ہمارے ساتھ بھی پیش آئے؟“
 ذوالنون نے اسے سمجھایا۔

”مجھے کچھ نہیں پتہ! مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم میرے ساتھ لندن جاؤ گے یا نہیں؟“ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔
 ”نہیں۔“ ذوالنون شاہ نے قطعی لہجے میں کہا۔
 ”تو ٹھیک ہے! مجھے یہ مگنی نہیں کرنی! اور میں کل لندن واپس جا رہی ہوں۔“
 ”زار یہ! کیا بکواس ہے یہ۔“ ذوالنون شاہ نے ناگواری سے کہا۔
 ”یہ بکواس نہیں ہے۔“ اس نے جلا کر کہا۔ ”حزہ شاہ اور آمنہ شاہ خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے جبکہ انوار شاہ کی بے تابی عروج پر تھی۔“

”زار یہ! پلیز! تم کیوں ایسا کر رہی ہو؟“ ذوالنون شاہ کے لہجے کی ٹرپ زار یہ شاہ کا دل چیر گئی تھی! لیکن وہ کیا کرتی، مجبور تھی! اس کے جتنی سے اپنے فیصلے پر ڈٹ رہی۔
 ”بس اتنی سی محبت کرتے تھے مجھ سے؟ میری معمولی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے؟“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

”زار یہ! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں! یہ معمولی سی بات نہیں ہے! میں کیسے اپنے ماں باپ اور دادا کو اکیلا چھوڑ دوں؟“ ذوالنون شاہ نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتی! مجھے ہاں یا ناں میں جواب چاہیے۔“ اس نے اٹل لہجے میں کہا۔
 ”ایک نام ہے جو میری بے رخی کے باوجود اپنا سب کچھ میرے لئے چھوڑنے کے لئے تیار ہے! اور ایک نام ہو جو مجبوراً تیار ہے ہو۔“ زار یہ نے اس کا صاف منہ سر اڑایا۔ ذوالنون شاہ کی برداشت کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں! آگے بڑھ کر اس نے زوردار چپڑ زار یہ کے منہ پر دے مارا! آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔
 ”اگر اب تم نے کوئی بکواس کی تو تمہاری جان لے لوں گا۔“ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

زار یہ! اپنے رخسار پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے ذوالنون شاہ کو دیکھ رہی تھی کہ ذوالنون شاہ نے اسے تھپڑ مارا۔
 ”تم نے بھی اسے لفظوں کی مار سے اندر تک جھپٹلی کر دیا ہے۔“ اس کے اندر سے آواز آئی وہ برسی آنکھوں سے

ہوئے کہا! بے اختیار ہی زار یہ کی نظریں انوار شاہ سے ٹکرائیں! وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے وہ ایسے دیکھ رہے تھے جو اسے نظروں سے سالم نگل جائیں گے! وہ بے اختیار ہی دو قدم پیچھے ہٹی۔
 ”مجھے کچھ بات کرنی ہے۔“ زار یہ نے اٹکتے ہوئے کہا۔
 ”کرو بیٹا! کیا بات کرنی ہے؟“ آمنہ شاہ نے مسکرا کر کہا۔
 ”وہ ذوالنون سے کرنی ہے۔“ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔ اس کا دل بہت زوروں سے دھڑک رہا تھا! آخری بار وہ اس شخص سے ہمکام ہونے والی تھی۔

”ہاں کرو!“ ذوالنون نے کہا۔
 ”اگر بیٹا! اکیلے میں کرنی ہے تو بے شک لان میں چلے جاؤ۔“ آمنہ شاہ نے کہا۔
 ”نہیں سب کے سامنے کرنی ہے۔“

”تو کرو.... زار یہ! اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟“ ذوالنون شاہ نے کہا۔
 ”مگنی سے پہلے میری دوشتریں ہیں! اگر آپ کو منظور ہوں تو میں مگنی کروں گی اور اگر نہیں منظور تو نہیں کروں گی۔“ اس نے ساٹ لہجے میں کہا! ذوالنون شاہ کے ساتھ ساتھ حمزہ شاہ اور آمنہ شاہ بھی ٹھٹھک گئیں۔
 ”زار یہ! مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“ ذوالنون شاہ نے جلدی سے کہا۔
 ”یہ سُنے بغیر ہی کہ میں نے کیا شرط رکھی ہے؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا! چند پل ذوالنون شاہ کچھ بول ہی نہ سکا۔

”بتاؤ بیٹا! کیا شرطیں ہیں؟“ حمزہ شاہ نے لب کشائی کی۔ زار یہ نے ایک نظر ٹھٹھکی وی لاؤنچ میں موجود چاروں نفوس کو دیکھا اور پھر بولی۔

”میری پہلی شرط یہ ہے کہ یہ وائٹ محل یعنی ”ذوالنون شاہ ہیلز“ میرے نام کر دیا جائے۔“
 ”یہ کیا کہہ رہی ہو زار یہ! یہ ہیلز میرے نام ہے! شادی کے بعد ہم دونوں کا ہے! اگر پھر بھی تم چاہتی ہو کہ تمہارے نام کر دیا جائے تو ٹھیک ہے! مگنی سے پہلے یہ تمہارے نام ہو جائے گا۔“ ذوالنون شاہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا! وہ تو حیران تھا زار یہ یک سے اتنی مادہ پرست ہو گئی۔
 ”زار یہ! اتنی سلی سوچ رکھتی ہے۔“ آمنہ شاہ نے بھی ناگواری سے سوچا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! ہمیں تمہاری یہ شرط منظور ہے۔“ حمزہ شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ انوار شاہ نے بے چینی سے پہلے بدلا جانے وہ دوسری کیا شرط بتانے والی تھی! اور کیا پتہ وہ بھی پہلی شرط کی طرح منظور کر لی جائے۔

”بابا جان! کیا آپ کو زار یہ کی یہ شرط منظور ہے؟“ حمزہ شاہ نے انوار شاہ سے پوچھا۔
 ”ہوں!....“ انہوں نے ہنکارا بھرا آواز دیا تو وہ مطمئن ہو گئے! جبکہ ذوالنون شاہ نے شکوہ کرتی نظروں سے اسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

”کیا مجھ پر یقین نہیں تھا؟“
 ”دوسری شرط بتاؤ!“ حمزہ شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”میری دوسری شرط یہ ہے!....!“ اس نے نظریں ذوالنون شاہ کے چہرے پر نکا دیں۔

”شادی کے بعد ذوالنون شاہ کو میرے ساتھ لندن میں رہنا ہوگا۔“ سب نفوس کے ساتھ ساتھ انوار شاہ کے سانپ سونگھ گیا! وہ حیرت سے زار یہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ذوالنون شاہ حیرت و بے یقینی کے ساتھ زار یہ کو دیکھ

ذوالنون شاہ کو دکھ رہی تھی، پہلی دفعہ کسی نے اسے تھمر مارا تھا۔

”صاف کہو زاریہ شاہ! تمہارا ذوالنون شاہ سے دل بھر گیا ہے اس لئے کوئی نام تلاش کر لیا، اب غرار کے لئے ڈھونڈنے کے لئے فضول قسم کی شرطیں رکھ رہی ہو۔“ ذوالنون شاہ کے لہجے کی کاٹ نے اسے اندر تک بلا دیا تھا۔

”ترب کر ذوالنون شاہ کی طرف دیکھا۔“
”مجھے نہیں پتہ تھا زاریہ شاہ! تم بھی عام لڑکیوں کی طرح عام سی نکلو گی، تم نے میرے اعتبار کا خون کیا۔ میرے جذباتوں کا مذاق اڑایا ہے، میری محبت کا جنازہ نکالا ہے، میں تمہیں کیا بھتا رہا زاریہ شاہ! اور تم کیا نظریں ذوالنون شاہ نے ٹوٹے لہجے میں کہا اور آنکھیں بے اعتباری مانیوں سے بھر گئیں۔“

”زاریہ! تمہیں مجھ سے نہیں اس محل سے پیار تھا، تمہیں غلٹ کرنے کے لئے صرف ذوالنون شاہ ہی ملا تو کیوں کی تم نے میرے ساتھ بے وفائی؟ زاریہ شاہ! تم بے وفا ہو۔“ ذوالنون شاہ کی آنکھیں چٹک چڑیں تیزی سے آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔

”تم نے مار دیا ہے ذوالنون کو۔“
”میں بے وفائیں ہوں۔“ اس نے ترب کر کہا جابا، لیکن الفاظ لبوں پر ہی دم توڑ گئے وہ ہارے ہوئے جوار کی طرح صوفے پر ڈھس گیا، آٹمن شاہ ترب کر آ گئے برہیں۔

”زاریہ! تم اس وقت جاؤ پھر سکون سے محل سے بات کریں گے جذبات میں آکر فیصلہ کرنا سراسر بیوقوفی ہے تم جاؤ ابھی۔“ آٹمن شاہ نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ اس نے بے دردی سے اپنے آنسو گڑے ایک نظر بھرا ذوالنون شاہ کو دیکھا جو چند لمحوں میں شکست ہو گیا تھا، پھر وہ بھاگتی ہوئی وائٹ محل سے ہیٹھ کے لئے نکل آئی۔

”زاریہ! کیا ہو زاری! زکو تو۔“ بھائی نے حیرت سے کہا وہ بنا کسی کی طرف دیکھے ٹری طرح روتے ہوئے لاؤنج سے گزرتے ہوئے سیرھیاں چڑھتی چلی گئی۔ پچھو اس کی حالت دیکھ کر بدحواس ہو گئیں، نمرہ بھائی اور پچھو اس کے پیچھے لگیں، لیکن تب تک وہ دروازہ بند کر چکی تھی۔

”زاریہ! ہو کیا ہے؟ پلیز دروازہ کھولو،“ نمرہ بھائی نے پریشانی سے کہا نمرہ بھائی اور پچھو آوازیں دے کر کھٹک گئیں۔ آدھے گھنٹے بعد زید گھر آ گیا، اس عجیب سی جوتیشن کو سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔

”گڑیا! دروازہ کھولو، کیا اپنے بھائی کی بات بھی نہیں مانو گی؟“ انہوں نے مان بھرے لہجے میں کہا، چند خاموشی سے سرک گئے اور پھر دروازہ کھل گیا، پچھو بے تاب سے آگے بڑھیں اس کے پیچھے زید اور نمرہ بھی تھے۔

”زاریہ! مجھے بتاؤ کیا ہوا؟ جہاں تک مجھے پتہ چلا ہے تم ذوالنون شاہ بیس گئی تھیں۔“ زید کے استفسار پر انہوں نے ہنسی کی جگہ زاریہ بھائی کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے نظریں پڑ گئی۔

”میں کل صبح 9 بجے کی فلائٹ سے لندن واپس جا رہی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا وہ سارے حیرت زدہ تھے۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو زاریہ؟“ پچھو نے بے یقینی سے پوچھا۔
”پلیز پچھو! کوئی سوال مت پوچھیے گا، میرے پاس آپ لوگوں کے ایک بھی سوال کا جواب نہیں ہے۔“
”نہ سنجیدگی سے کہا۔“
”لیکن زاریہ! اگلے ماہ تمہاری مہنگی ہونے والی ہے، اس طرح تم اجاگت کیسے لندن جا سکتی ہو۔“ نمرہ بھائی۔

جراثی سے کہا۔
”اب کوئی مہنگی نہیں ہو رہی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لندن واپس جا رہی ہوں۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا،
”سب اسے دیکھتے رہ گئے۔“

”زاریہ! یہ سب کیا ہے؟ ذوالنون شاہ نے کچھ کہا ہے؟“ زید بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔
”نہیں۔“ اس نے مختصر کہا۔
”تو پھر یہ سب کیا ہے؟ اچانک اتنا برا فیصلہ تم نے اکیلے میں کر لیا؟“ زید بھائی نے تاسف سے کہا۔

”یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے، اب کسی بھی صورت میں اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”صائم والے واقع نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، یہاں کے حالات بہت خراب ہوتے جا رہے ہیں، میں نے ذوالنون شاہ کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ شادی کے بعد پاکستان نہیں لندن رہوں گی، اور اسے بھی میرے ساتھ لندن میں رہنا ہوگا اس نے میری شرط ماننے سے انکار کر دیا، اس لئے میں لندن جا رہی ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا، وہ سب دنگ نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

☆.....☆.....☆
اچانک ہی آسمان کا لے سیاہ دلوں سے بھر گیا، دیکھتے ہی دیکھتے زور و شور سے بارش شروع ہو چکی تھی، وہ ابھی تک بے یقینی کے عالم میں تھا، زاریہ ایسا بھی کر سکتی ہے؟ اس وقت تو آٹمن شاہ نے اسے دلا سے دیئے۔

”میں اُسے سمجھاؤں گی،“ بچی ہے، شاید کسی نے اس کے دماغ میں یہ سب باتیں بھری ہیں، تم فکر نہ کرو، میں اس سے بات کروں گی۔“ لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو عجیب سے دوسروں کا شکار ہو گیا تھا، وہ اندر سے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا، اب صرف ایک امید تھی، شاید جو اُس نے کہا وہ سب غلط ہو، سوچ سوچ کر اس کا دماغ چٹا جا رہا تھا۔

”زاریہ! تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو؟“ اس نے بے بسی سے سوچا۔
☆.....☆.....☆

باہر بارش بہت تیز رفتاری سے ہو رہی تھی، وہ ڈنڈ میں کھڑی ذوالنون شاہ کے بارے میں سوچ رہی تھی، بیل صراٹے سے گزرتے تھے، دونوں آسمان بھی ان کے غم میں رو رہا تھا، کچھ سوچ کر اس نے قلم اٹھا یا اور ایک پیپر پر کچھ لکھنے لگی، لکھ کر اس نے ایک نظر بڑھا، آٹمن ٹوٹ کر اس پیپر کو بگاڑ رہے تھے، باقی کی ساری رات اس نے جاگتے ہوئے گزردی رات بارش اس قدر ٹوٹ کے برسی تھی ہر چیز کھڑکی تھی، لیکن اس کا دل ویران ہو گیا تھا۔ اس نے فجر کی نماز ادا کی اور لان میں آگئی، لپکا لپکا اندر اہر سو پھیلا ہوا تھا، لان میں بارش کا پانی تھا، وہ ننگے پاؤں لان میں چلنے لگی، اس کے پاؤں بارش کے پانی میں ڈوب چکے تھے، بارش کا ٹھنڈا پانی اس کے پاؤں کو راحت بخش رہا تھا، وہ بے مقصد سی ادھر سے ادھر چکر کاٹی رہی، پھر اس نے آٹمن کرگٹ کی طرف بڑھ گئی، وہاں بڑا سا تالا دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی، آج میں بھی سورا بھا، پہلے تو اس کا دل چاہا، آج میں کوڑھا کر اس سے گیت کھلوائے، لیکن اس کی نیند و سرب ہونے کے خیال سے واپس کمرے میں آگئی، ابھی سب سو رہے تھے، چند گھنٹے بعد اسے ہیٹھ کے لئے یہاں سے

فلانی کر جاتا تھا، وہ میسر پر آ کھڑی ہوئی، خالی خالی نظروں سے ذوالنون شاہ بیس کو دیکھنے لگی، بچپن کی یادیں بھر سے تازہ ہونے لگیں، عجیب سی بے قراری اس کے وجود میں بھر گئی، سورج کی شفاف کرنیں اس کے سوگوار چہرے سے

روزانہ انجسٹ [125] ستمبر 2012ء

لکرائیں تو وہ چونک گئی، بجانے کتنی دیر ہو گئی تھی وہ وائٹ محل کو اپنی نظروں کے حصار میں لے ہوئے تھی۔
 ”ذوالنون شاہ!“ اس کے دل سے بے ساختہ آواز نکلی وہ بے قرار ہو گئی اور گہرا کر جلدی سے اندر پلٹ آئی۔
 ”زار یہ! رُک جاؤ!“ اس کے اندر سے آواز آئی اس نے سب باتوں کو نظر انداز کر دیا اور جانے کی تیاری کرنے لگی۔

”زار یہ بی بی! آپ کو بڑی بیشک صلیبہ بلوار ہی ہیں۔ ملازمہ نے کہا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی خود کو دیکھنے لگی سرخ آنکھیں ریت کی گواہ تھیں۔ اس نے اپنی تم آنکھوں کو صاف کیا اور نیچے آ گئی۔
 ”بھابی! جلدی سے ناشتہ لگوا دیں میری فلاٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔ اس نے ہشاش لہجہ میں کہا وہ کسی پریشانی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے اپنے فیصلے پر ملال ہے۔

”زار یہ! تم....“
 ”پلیز بھابی!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ چپ ہو گئیں۔ پھپھو اس کی کھوکھلی مسکراہٹ دیکھتے رہ گئیں۔
 ”بھابی! چپ چاپ ناشتے سے انصاف کرتے رہے۔ اس نے برائے نام ہی ناشتہ کیا، بھوک تو اس کی ویسے ہی سرگرم تھی۔

”زید بھائی! ناراض ہیں مجھ سے؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”کس حق سے؟“ انہوں نے اٹلا اس سے پوچھ ڈالا۔

”آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔ اس نے تڑپ کر کہا۔

”کاش زار یہ! تم نے بڑے بھائیوں والا مان دیا ہوتا۔“ انہوں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”زار یہ! مجھے تم سے کوئی خفیگی یا ناراضی نہیں ہے، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بتانا تو دور کی بات اتنا بڑا فیصلہ اکیلے میں کر ڈالنا ذوالنون شاہ جیسے مخلص شخص کے ساتھ تم نے اچھا نہیں کیا زار یہ! اگر نمرہ مجھے کہے کہ میں اپنی ماں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ اس کے گھر رہوں، کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ کبھی نہیں زار یہ! کبھی نہیں، کوئی بھی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا، پھر ذوالنون شاہ وہ کیسے اپنے والدین کو چھوڑ کر سات سمندر پار جا کر رہ سکتا ہے؟“ انہوں نے سہاٹ لہجہ میں کہا وہ کچھ نہ بولی سر جھکائے کھڑی رہی۔

”زار یہ! ابھی بھی وقت ہے اپنا فیصلہ بدل لو۔“ زید بھائی نے ایک اُمید سے کہا۔

”نہیں زید بھائی! اب میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی، کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو نہ چاہجے ہوئے بھی انسان کو کرنے پڑتے ہیں۔“ اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر کہا۔

”پھپھو! مجھے معاف کر دیں۔“

”زار یہ! خوش رہو بی بی!“ انہوں نے اپنے آنسو صاف کیے اور اسے دعا دی، پھر وہ نمرہ بھابی کے گلگ لگ گئی۔

”بھابی! میں آپ کو بہت مِس کر دوں گی۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”ہم سب بھی تمہیں بہت مِس کریں گے۔“ نمرہ بھابی نے نم لہجہ میں کہا اس نے صائم کو خوب پیار کیا اور سب پورچ میں آ گئے ڈرائیور گاڑی اشارت کیے ہوئے تھا۔

”چلو بیٹا! ہم تمہیں ایئر پورٹ تک چھوڑ آئیں۔“

”پھپھو! آگے بھی اکیلے ہی جانا ہے پھر یہاں سے کیوں نہیں؟“ آپ پریشان نہ ہوں، میں چلی جاؤں گی۔

اس نے نرمی سے کہا سب نے تم آنکھوں سے اسے الوداع کیا، گاڑی فرارے بھرتی گیٹ سے باہر نکل آئی۔

”ڈرائیور! نکل! ایک منٹ گاڑی روکیے۔“ اس نے کچھ یاد آنے پر کہا، ڈرائیور نے گاڑی روک دی، وہ گاڑی سے باہر نکل آئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وائٹ محل کے گیٹ کے پاس آ کر، واج مین نے اسے دیکھتے ہوئے فوراً گیٹ وا کر دیا وہ کھلے گیٹ کو انور کرنی واج مین کے پاس آ کر، واج مین نے حیرت سے اسے دیکھا۔
 ”زار یہ بی بی! اندر چل جاؤ۔“

”نہیں واج مین! میں واپس جا رہی ہوں آپ میرا ایک کام کر دیں گے؟“ اس نے بڑی آس سے پوچھا۔

”کہو بی بی! کیا کام ہے؟“

”انکل! آپ یہ ذوالنون شاہ کو دے دیں گے؟“ اس نے ایک کاغذ واج مین کو پکڑ لیا۔

”ٹھیک ہے بی بی! دے دوں گا۔“ اس نے ممنون نظروں سے واج مین کو دیکھا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی، ٹیس پر کھڑے انوار شاہ نے چونک کر زار یہ کی گاڑی کو دیکھا جو نظروں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ انہوں نے فوراً ڈرائیور سے

گاڑی نکالنے کو کہا اور واج مین سے پوچھا، ”زار یہ کہاں گئی ہے؟“

”جی وہ شاید ایئر پورٹ کی طرف گئی ہے، کہہ رہی تھی واپس جا رہی ہوں۔“ واج مین نے مؤدب لہجہ میں کہا۔

انوار شاہ نے فوراً ڈرائیور کو ایئر پورٹ چلنے کو کہا، وہ گاڑی سے اترتی تو سامنے ایئر پورٹ کی عمارت تھی، ڈرائیور نے سامان نکالا وہ ایئر پورٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

”زار یہ!...“ اس کے عقب سے آواز ابھری تو اس کے قدم تھم گئے، اس شخص نے تو اس کی زندگی مشکل بنا دی تھی اس آواز کو وہ کیسے بھول سکتی تھی انوار شاہ اس کے قریب آ چکے تھے۔

”سنا تھا تم بہت ذہین ہو اب خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو یقین آ گیا ہے ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ

بھعدا رہی ہو۔“ انوار شاہ نے حقیقت میں اسے سراہا۔

”میں نے پلان کیا تھا، اگر تم صائم والے واقعہ کو کچھ کر پیچھے نہ بیٹھیں تو میں نے زید کا چھوٹا سا ایکسڈنٹ کر دینا تھا، لیکن تم تو کافی بھعدا نکلیں۔“ انوار شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا، وہ لب بچنے چھٹی نظروں سے انوار شاہ کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ بات تمہارا انعام۔“ انوار شاہ نے ایک چپک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے فتح کے نشے میں پور لہجے میں کہا۔

”ایک بات میری یاد رکھیے گا، ذوالنون شاہ کی خوشیاں زار یہ شاہ کے ساتھ مشروط ہیں، آپ کی جتنی دولت جائیداد ہے، بینک میں جتنے نوٹ ہیں، فیکٹریوں کی جتنی قیمت ہے، ہر وہ چیز جو آپ کے پاس ہے، اُن سب کی قیمت کو

کاؤنٹ کر کے اس کو اس چپک پر بھر دیجیے گا اس کے بدلے میں اگر تھوڑی سی خوشیاں اپنے لاڈلے پوتے کو خرید کر دے سکتے ہیں تو ضرور بتائیے گا، زار یہ شاہ آپ کو مبارک باد دے کر ضرور آئے گی۔“ اس نے زہر بھرے لہجے میں کہا

اور اندر کی طرف بڑھ گئی، انوار شاہ ساکت نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ بخار کی شدت سے تپ رہا تھا، اور سردی سے پھٹا جا رہا تھا، اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اٹھ کر پاس پڑے ٹیبل سے پانی اٹھا کر پی لے، اسے میں دروازے پر دھکیلی۔

”س!“ اس نے نقاہت بھرے لہجہ میں کہا تو گلزار اندر آ گیا، کمر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، سائید ٹیبل پر رکھے لیپ کی بلکی پیل روٹی تھی۔

”چھوٹے صاحب! میں ہوں گھڑا۔“

”چھوٹے صاحب! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی، میں بڑے صاحب کو بلواتا ہوں اور ڈاکٹر کو فون ہوں۔“ گھڑا نے غر مند سے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے یہ بتاؤ تم کیوں آئے تھے؟“ اس نے بمشکل اٹھ کر کہا۔

”وہ چھوٹے صاحب! یہ آپ کو دینا تھا زاریہ بی بی نے کہا تھا یہ آپ کو دے دوں۔“ گھڑا نے ایک کاغذ پکڑا لیا۔

”کیا ہے یہ؟“ ذوالنون نے استفسار کیا۔

”جی نہیں۔“ گھڑا نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ اس نے گھڑا سے کہا تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا وہ کاغذ ہاتھ میں پکڑے آنکھیں میچا گیا پھر جانے کس احساس کے تحت اس نے آنکھیں کھول کر اس کاغذ کو کھولا اور اس کاغذ پر لکھی تحریر کو پڑھنے لگا جیسے جیسے وہ اس تحریر کو پڑھتا تھا اس کے چہرے کا رنگ فق ہوتا جا رہا تھا۔

”السلام وعلیکم! ذوالنون شاہ! میں واپس لندن جا رہی ہوں آج صبح نو بجے کی فلائٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے اب میں شاید کسی پاکستان نہ آؤں کل میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف ہوئی اس سے کہیں زیادہ تکلیف مجھے ہونا میں معافی کے قابل تو نہیں ہوں شاید لیکن ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا بد قسمت زاریہ!“ اس مختصر تحریر پر جبکہ آنسوؤں کے نشان تھے۔

”وہ چلی گئی؟ ذوالنون! وہ چلی گئی۔“ اس کا دل گر لایا جو ہلکی سی امید تھی وہ بھی ٹوٹ گئی سب خواہش آرزوئیں اعتبار سب کچھ پل بھر میں ٹوٹ گیا بکھر گیا وہ بے یقینی سے اس کاغذ کو دیکھ رہا تھا پہلے ہی وہ بخار شدت سے غصہ حال تھا یک دم ہی اس کے دماغ میں درد کی شدید نہیں انھیں وہ درد کی شدت سے گر لایا اور بچہ لکھوں میں خود سے غافل ہو گیا۔



انوار شاہ! ایئر پورٹ سے سیدھے ذوالنون شاہ کے روم میں آ گئے ذوالنون شاہ کو ایک طرف لٹکھڑاتے ہوئے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب آئے۔

”ذوالنون! انوار شاہ نے اس کا شانہ ملایا۔“

”ذوالنون! آنکھیں کھولو۔“ وہ ہوش میں ہوتا تو آنکھیں کھولتا انوار شاہ نے گھبرا کر حذرہ شاہ کو آواز دی وہ اسے جلدی سے ہسپتال لے گئے جب ڈاکٹر نے بتایا کہ ذوالنون شاہ کا روم بریک ڈاؤن ہوا ہے تو آتے کے ہیروں سے زمین نکل گئی جب وہ ہوش میں آیا تو بالکل بدلا ہوا ذوالنون شاہ تھا کم کو تو وہ پہلے ہی تھا بالکل کم گم ہو کر رہ گیا جب وہ دھچکا جھجکا ہوا اس نے ذوالنون شاہ جیل جانے سے انکار کر دیا اور سب کے سر اچھی آ گیا۔ انوار شاہ نے بالاعی بالا نہ صرف اس کا ہانیہ کے ساتھ رشتہ پکا کر دیا بلکہ شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر کے انوار شاہ نے ستاؤ تہذیب انھیں۔

”بابا جان! ابھی وہ مکمل طور پر نہیں سنبھل پایا! اچانک شادی...؟“ وہ متذبذب ہوئیں۔

”ہانیہ! ابھی کی ہے وہ اسے سنبھال لے لی میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے تم پریشان نہ ہو ذوالنون

کیسے متالوں گا۔“ انوار شاہ نے آمنہ شاہ کو تسلی دی یوں وہ شادی کی تیاریاں کرنے لگیں۔ ذوالنون شاہ نے جب ستاؤ تہذیب بکھر ہی اٹھا۔

”میں شادی نہیں کروں گا۔“ اس نے سختی سے آمنہ شاہ کو منع کیا انوار شاہ نے جب اس کا انکار سنا تو انہوں نے خود اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

”ذوالنون! تم نے انکار کیوں کیا؟“ انوار شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”دادا جان! میں شادی نہیں کرنا چاہتا پلیز۔۔۔ اس سارے معاملے کو ختم کر دیں۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”کوئی معقول وجہ انکار کی؟“ انوار شاہ نے پوچھا۔

”دادا! آپ سب جانتے ہیں پھر بھی؟“ اس نے شکوہ کیا۔

”یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے وہ لڑکی تمہیں چھوڑ کر جا چکی ہے اور اس لڑکی کی خاطر ہم تمہیں عمر بھر کا روگ لگا نہیں دیں گے۔“ انوار شاہ نے بے رحمی سے کہا تو وہ تڑپ اٹھا۔

”دادا جان! میں زاریہ سے محبت کرتا ہوں کوئی بھی لڑکی زاریہ شاہ کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ میں لینے دوں گا۔“ اس نے مضبوط لہجہ میں کہا۔

”تو ٹھیک ہے ذوالنون شاہ! جیسے تمہاری مرضی ایک دفعہ پہلے بھی میں اپنے دوست کے سامنے شرمندہ ہوا تھا اب بھی تمہاری خاطر سب کی نظروں میں اپنی ذلیل برداشت کروں گا صرف تمہاری خاطر لیکن ذوالنون! اس لڑکی کے بارے میں سوچو جب کسی لڑکی کی شادی کی ڈیٹ فکس کر دی جاتی ہے تو کسی کا اچانک انکار اس کی زندگی تباہ کر دیتا ہے تمہاری کوئی بہن نہیں ہے ناں ذوالنون! اس لئے تمہیں اس چیز کا اندازہ نہیں۔“

پھر ایک شام ہانیہ ذوالنون شاہ کی دہن میں کر ”شاہ ولا“ میں آ گئی۔ ذوالنون شاہ کی ہانیہ میں دلچسپی نہ ہونے کے برعکس آہستہ آہستہ ہانیہ پر سارے راز کھلتے چلے گئے ہانیہ کو زاریہ نامی لڑکی سے چوسی ہوئی روزانہ دونوں کا جھگڑا ہوتا اب تو گھر والے بھی پریشان ہو گئے تھے آمنہ شاہ نے ذوالنون شاہ کو بہت سمجھایا لیکن وہ کیا کرتا کسی بھی طرح زاریہ کو بھول نہ پایا پھر روز کے جھگڑے سے تنگ آ کر ذوالنون شاہ نے ہانیہ سے بات کرنے کا سوچا۔

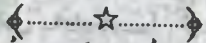
”ہانیہ! مجھے کچھ وقت دو دادا جان نے شادی اتنی اچانک کروادی کہ میں جتنی طور پر قطعی تیار نہیں تھا روز روز کے لڑائی جھگڑے سے گھر کا ماحول ڈسٹر ب ہو کر رہ گیا ہے۔“ ذوالنون شاہ نے التجائیہ انداز میں کہا کچھ روز سکون سے گزر جاتے پھر وہی ہنگامہ شروع ہو جاتا ہانیہ جب بھی اسے کھویا ہوا دیکھتی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اس کے علاوہ کوئی بھی لڑکی ہوئی تو وہ اپنے شوہر کو بنا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی گھر کا سکون مکمل طور پر تباہ ہو گیا ہانیہ ناراض ہو کر بیٹھ چلی گئی انوار شاہ بھی اس سے کچھ فضا خفا سے تھے آمنہ شاہ اور حذرہ شاہ بھی خاموش رہتے اس نے خود کو مصروف کر لیا سارا سامرا دن کام میں مصروف رہتا اور جب گھر ہوتا تو زاریہ کی یادیں اور اس کا دیا غم پھر سے تازہ ہونے لگتا۔ کبھی کبھی تو اسے ہانیہ پر بہت ترس آتا لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو ہر وقت زاریہ کو پکارتا رہتا تھا۔

”قت دھیرے دھیرے گزرنے لگا ہانیہ! امید ہے کبھی آمنہ شاہ اسے مٹا کر لے آئی تھیں ہانیہ کے رویے میں بھی تبدیلی آگئی تھی لیکن ذوالنون شاہ وہی پتھر کی صورت تھا۔“

پھر ایک شام ہانیہ وہ جڑواں بچوں کو پیدا کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے ذوالنون شاہ کی زندگی سے دور چلی گئی ذوالنون شاہ کو ہانیہ کی موت کا بے حد افسوس ہوا فطرتی طور پر وہ بے حد حساس تھا۔ شاہ ولا میں ہانیہ کی موت بہت بڑا جھجکا ہٹ ہوئی تھی آمنہ شاہ نے دونوں ننھے فرشتوں کو اپنی آنکھوں میں۔۔۔ اہ! وقت اپنی ڈگر سے چل رہا تھا بچے

خود زاریہ سے بات کرنے کی ٹھان لی، سودہ اس کے آفس چلا آیا۔ زاریہ کو اسے اپنے آفس میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔
 ”سوری! میں بغیر اجازت آپ کے آفس میں چلا آیا“۔ وہ اس کی حیرت بھانپ چکا تھا۔
 ”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے“۔ عقیف نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”اگر آپ نے وہی بات کرنی ہے جو عمان نے کی تھی تو سوری! مجھے اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرنی“۔ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا، وہ عقیف کے آنے کا پس منظر جان چکی تھی۔
 ”لیکن زاریہ! کوئی ریزن بھی ہو“۔ عقیف نے بے چینی سے کہا۔

”میری اپنی زندگی ہے جو مرضی فیصلہ کروں اور میں کسی کوریژن دینے کی پابند نہیں ہوں“۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا، تو عقیف فوراً اس کے آفس سے نکل آیا۔
 اس کے بعد مار اوڈیڈ بھی عقیف کی وکالت کرنے لگ گئے اور عمان... (وہ تو اس کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا، وہ کیسے ذوالنون شاہ کی جگہ کسی اور کو دے دیتی؟



وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو کر نیچے ڈائنگ ٹیبل پر آ گیا، لازمہ ٹیبل پر ناشتہ لگانے لگی۔
 ”السلام وعلیکم!“ اس نے بلند آواز میں کہا۔
 ”وعلیکم السلام!“ حمزہ شاہ نے شفقت سے کہا۔

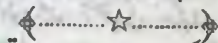
”بیٹا! آپ لوگ ابھی تک تیار نہیں ہوئے اسکول نہیں جانا ہے کیا؟“ ذوالنون شاہ نے زری سے پوچھا۔
 ”یابا! آج ہم اسکول نہیں جائیں گے“۔ شام نے منہ بنا کر کہا تو وہ ہولے سے مسکرا دیا۔
 ”کیوں... اسکول کیوں نہیں جانا؟“ ذوالنون نے چونک کر پوچھا تو شام کچھ نہیں بولا۔
 ”کائنات! آپ ہٹاؤ اسکول کیوں نہیں جانا؟“ ذوالنون نے زری سے پوچھا، کائنات بھی چپ چاپ بیٹھی رہی، ذوالنون شاہ نے ٹھٹھک کر دونوں کو دیکھا جو سر جھکائے سنجیدگی سے بیٹھے تھے اس نے اُلجھ کر حمزہ شاہ کی طرف دیکھا تو وہ نظریں پٹرائے۔

”ذوالنون بیٹا! آپ ناشتہ کرو پچوں نے دیے ہی اسکول سے چھٹی کی ہے“۔ آمنہ شاہ نے جلدی سے کہا۔ شام اور کائنات اُٹھے اور بغیر ناشتہ کیے لاؤنج میں آ گئے تو ذوالنون شاہ فوراً ان کے پیچھے لپکا۔
 ”ناراض ہو پاؤ؟“ ذوالنون نے دونوں کو اپنی گود میں بٹھا کر پوچھا۔

”یابا! ہم آپ سے نہیں بولتے“۔ کائنات نے کہا۔
 ”کیوں یابا! اسے ایسی کیا غلطی ہو گئی؟“ ذوالنون جانتا تھا کہ وہ کیوں ناراض ہیں۔
 ”یابا! آپ نے پراس کیا تھا کہ آپ مالامال نہیں گئے“۔ تو وہ گہری سانس لے کر رو گیا۔
 ”دیکھو بیٹا! جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جاتے ہیں، پھر وہ کبھی واپس نہیں آتے“۔ اس نے رساں سے کہا، بچے رونے بھول کر ٹنگر ٹنگر کی شکل دیکھنے لگے۔

”اور اس دفعہ چھٹیوں میں یابا! آپ کو آپ کی فوری جگہ پر گھمانے لے کر جائیں گے“۔ اس نے مسکرا کر کہا۔
 ”رنگی یابا!“ شام نے اشتیاق سے پوچھا۔
 ”ییس یابا! کیا جان! لیکن ایک شرط پڑے آپ اسکول سے چھٹی نہیں کرو گے، نالتاں جان کو تنگ کرو گے، اور نہ ہی روڈ گے ٹھیک ہے؟“ ذوالنون شاہ نے کہا۔

بڑے ہو رہے تھے ذوالنون شاہ نے دن اور رات کا شمار کرنا چھوڑ دیا تھا، اس نے اپنی ساری محنت اور توجہ بزنس پر رکھ دی، اسے اپنی بیٹی اور بیٹے سے بے حد پیار تھا، ان پانچ سالوں میں وہ زاریہ شاہ کو ایک بار بھی بھولا نہ تھا، اور بچوں کی نئی فرمائش پر وہ بے قرار ہو گیا تھا، اور آمنہ شاہ بھی اسے دے دے، دے لفظوں میں کہہ چکی تھیں، لیکن اب وہ کسی بھی صورت شادی کرنا نہیں چاہتا تھا، پہلے ہی وہ خود کو ہائیکو گتہ بگاڑ رہا تھا۔



اس نے انوار شاہ کو غصے سے کہہ تو دیا تھا، لیکن سارے راستے وہ روتی ہوئی ذوالنون شاہ کی خوشیوں کی دعا کرتی آئی تھی، ایئر پورٹ سے وہ ٹیکسی لے کر گھر آئی تو سب اسے دیکھ کر شاکہ زارہ گئے، علیہا شاہ کے گلے لگ کر وہ خوب روتی۔ علیہا شاہ کے ساتھ ساتھ نیل شاہ بھی اس کی اچانک واپسی پر پریشان ہو گئے، انہوں نے زاریہ سے بہت پوچھا، لیکن اس نے کچھ نہ بتایا۔ علیہا شاہ نے پاکستان فون کر کے اپنی خندا مبرین سے پوچھا تو انہوں نے مختصر آسارا واقعہ بتا دیا، علیہا شاہ کا دل جا پا لپسرا پیٹ لے انہوں نے زاریہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنی فضول ضد چھوڑ دے۔ وہ بہت چپ چاپ اور کم صبر رہنے لگی، اس کی دن بدن بگڑتی حالت نے علیہا شاہ کے ساتھ ساتھ نیل شاہ کو بھی پریشان کر دیا، پھر وہ سب اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے، کوئی بھی ایسی بات نہ کرتے جس سے اس کا موز خراب ہو۔

ایک دن لائبہ کا فون آیا، مجبوراً اسے بات کرنا پڑی، وہ تو اس پر برس پڑی تھی۔
 ”حد ہوتی ہے زاری! تم نے واپس آتے ہوئے مجھ سے ملنا بھی گوارا نہ کیا، اور لندن آ کر ایک بھی دفعہ فون نہیں کیا“۔ لائبہ نے شکوہ کیا، وہ بخل سی ہو گئی۔

”زاریہ! مجھے نہیں پتہ تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا، اور نہ ہی میں تم سے پوچھوں گی، لیکن ایک بات کا ضرور افسوس ہے کہ ذوالنون جیسے شاندار انسان کو ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا، بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کر دو، میں نے سنا ہے ذوالنون شاہ نے شادی کر لی ہے“۔ لائبہ نے افسردگی سے کہا، لائبہ آپ کی طویل بات کے بعد وہ آخری فقرے پر ٹھٹھک گئی، بے ساختہ ہی اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا، آ نکھیں نم سی ہو گئیں، لائبہ آپ سے بات کرنے کے بعد وہ کافی دیر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی، دردی لہر پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ وقت آگے بڑھتا گیا، لیکن اس کی زندگی وہیں ٹھہر گئی، عمان PH.D کر رہا تھا، جب بھی فارغ ہوتا اس سے خوب باتیں کرتا، خاموشی سے سنتی رہتی، وہ اس کی خاموشی سے چو جاتا، وہ ہر وقت اسے خوش کرنے کے جتن کرتا، لیکن اسے مایوس ہو پڑتا۔ ان پانچ سالوں میں اس کے لئے کافی پروپوزلز آئے، لیکن اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر دوبارہ بھی کسی نے اس ٹاپک پر بات نہ کی، عمان کا ایک دوست تھا، سیف... وہ اکثر اس کے ساتھ گھر آ جاتا، عمان کی طرح اسے بھی ایسا ہی کہتا تھا، وہ بھی اسے عمان کی طرح ٹریٹ کرتی تھی، لیکن کچھ ماہ سے سیف کے بڑے بھائی عقیف نے اس کی زندگی کو اور بھی مشکل کر دیا تھا، یہ نہیں اُس نے کہاں اسے دیکھا تھا، جب اسے پتہ چلا تھا کہ عمان کی بہن ہے تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ عقیف نے سیف سے بات کی تو اس نے جھجک کر عمان کو بتا دیا۔

اس نے جب زاریہ سے بات کی تو وہ ہمدی طرح اس پر بگڑنے لگی۔
 ”یابا! عقیف بھائی بہت اچھے انسان ہیں“۔ عمان اسے ہر طریقے سے قائل کرنا چاہتا تھا۔
 ”عمان! میں نے کہا تھا مجھے ابھی شادی نہیں کرنی، سو نہیں کرنی، اس لئے اسے دوست کو صاف انکار کر دو“۔ اس نے جھڑک کر کہا، تو وہ خائف سا ہو گیا۔ عقیف اس کے انکار سے بہت دل برداشتہ ہوا، لیکن بہت نہ باری اس نے

”ٹھیک ہے پاپاجان! دونوں نے خوشی سے کہا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ آمنہ شاہ نے اپنی غم آنکھوں کو صاف کیا۔“

”ذوالنون! آ جاؤ بیٹا! تم بھی ناشتہ کرو۔“

”نہیں! تھیں جان! ابھی مجھے جانا ہے! آفس جا کر کرلوں گا۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے، انوار شاہ نے حسرت سے اپنے لاڈلے پوتے کو دیکھا، ان کی ایک غلطی نے زندگی کی ساری خوشیاں اس سے چھین لی تھیں، ان کا ضمیر ان کو چین نہ لینے دیتا، وہ اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے تھے اور نہ ہی ان میں پہلے جیسا دم خرم رہا تھا۔

”دادا جان! آپ نے بلوایا، خیریت تو ہے ناں۔“

”ذوالنون! مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے۔“ انوار شاہ نے آہستگی سے کہا۔

”دادا جان! پوچھنے کی کیا بات ہے؟ آپ کریں، کیا بات کرنی ہے؟“ اس نے مؤدب لہجے میں کہا۔

”ذوالنون! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔“ انوار شاہ نے آہستگی سے کہا۔

”دادا جان! میں جانتا ہوں آپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، اس میں تو شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

ذوالنون نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ذوالنون! مجھے معاف کرو۔“ انوار شاہ کی آواز بھگ گئی تھی۔

”رمضان جیسا باہرکت مہینہ آ رہا ہے، میں چاہتا ہوں سب گناہوں سے پاک ہو کر اس رب کی عبادت کروں تاکہ وہ بھی مجھے معاف کر دے۔“

”دادا جان! آپ مجھ سے کیوں معافی مانگ رہے ہیں؟ آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔“ ذوالنون نے تڑپ کر انوار شاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”ذوالنون! میں گنہگار ہوں، شاید اس وجہ سے خوشیاں اس گھر سے روٹھ کر بہت دیر چلی گئی ہیں۔“ انوار شاہ نے آوازی سے کہا۔

”واوا جان! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ ذوالنون نے بے چینی سے کہا۔

”وہ زاریہ!۔“ انوار شاہ ہچکچائے۔

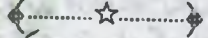
”وہ زاریہ! کیا دادا جان؟“ ذوالنون نے بے تابی سے پوچھا۔ انوار شاہ سر جھونے دھیرے دھیرے ہر راز سے پردہ فاش کرتے چلے گئے، وہ مساکت نظروں سے انوار شاہ کے ہلنے لپ وکھ رہا تھا، بہت دیر بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہوا، وہ حیرت و بے چینی سے انوار شاہ کو دیکھ رہا تھا۔

”ذوالنون! مجھے معاف کرو، مجھے یہ ذرا تھا کہ شادی کے بعد زاریہ تمہیں لے کر لندن شفٹ نہ ہو جائے اور میں اپنے دوست سے پہلے سے بات کر چکا تھا، اگر بعد میں میں اسے انکار کرتا تو خود کو دوسروں کی نظروں میں قماش بناتا۔“ انوار شاہ نے شرمندگی سے کہا۔

”دادا جان! صاف کو آپ نے کذیب کروایا، مجھے یقین نہیں آ رہا، میں زاریہ کو بے وفا سمجھتا رہا، دادا جان وہ تو عظیم لڑکی تھی، جس نے اپنی خاطر قربانی دے دی، اور آپ دادا جان! آپ تو مجھ سے بہت پیار کرتے تھے، پھر آپ نے کیوں میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی مجھ سے چھین لی؟ دادا جان! آپ نے صرف میری یا زاریہ کی زندگی خراب نہیں کی، آپ نے تو ہائیڈو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا، آپ جانتے تھے دادا جان! کہ میں زاریہ سے

تنتی جبت کرتا ہوں، آپ نے زبردستی میری شادی ہانیہ سے کروادی، اور میں اسے ایک بھی خوشی نہ دے سکا، کیوں کیا آپ نے ایسا؟“ وہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، ساری زندگی کا لاوا آج پھٹ پڑا تھا، ذوالنون شاہ تڑپ رہا تھا، وحشتیں اس کے اندر بھر گئی تھیں، وہ تو زاریہ کو قصور وار سمجھتا تھا اور قصور وار کون نکالا؟ پانچ برس اس نے تنہی اذیت میں گزارے تھے۔

”کاش دادا جان! میں آپ کا پوتا نہ ہوتا۔“ ذوالنون نے روتے ہوئے بے بسی سے کہا، پھر تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گیا، اور باہر کھڑے حمزہ شاہ نے بھی غم آنکھوں سے اپنے لپٹ جگر کو دیکھا جو لڑکھاتے قدموں سے بیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ حمزہ شاہ کسی کام سے انوار شاہ کے کمرے میں آئے تھے، لیکن اندر سے آنے والی آوازیوں نے ان کے قدم جکڑ لئے تھے، حمزہ شاہ نے تاسف سے بند دروازے کی طرف دیکھا۔



”بیٹا! اپنی پیکنگ کر لیں، ہم پاکستان جا رہے ہیں۔“ اس نے کن آنکھوں سے زاریہ کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا، وہ لپٹاپ پر کوئی کام کر رہی تھی، اس کی انگلیاں وہیں جم گئیں۔ اس نے سراسیمگی نگاہ سے عمان کی طرف دیکھا، جواب مکمل طور پر پیرا کھانے میں لگن تھا۔

”پاکستان کیوں جانا ہے؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”ویسے ہی، میرے ایگزام ہو گئے ہیں، اب تو یوریت ہی یوریت ہے، اس لئے سوچا تھا، زاریہ کو گھوم لیا جائے، اس لئے پاکستان جانے کا پروگرام بنایا ہے۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔

”تم نے جانا ہے تو جاؤ، میں نے نہیں جانا۔“ اس نے لب بھینچ کر کہا۔

”جانا تو آپ کو پڑے گا، چاہے آپ سو بار انکار کر لیں۔“ عمان نے سنجیدگی سے کہا۔

”ناؤ! تم چلے جاؤ، میں نے تو لکھی بار پاکستان دیکھا ہے۔“ اس نے نظریں پھرا کر کہا۔

”ایسا! ام اور ڈیڈ بھی جا رہے ہیں، اور ہم وہاں سے عید کے بعد ہی واپس آئیں گے، آپ بھی ہمارے ساتھ جا رہی ہیں، کیوں کہ میں نے ٹکٹ کنفرم کر دالے ہیں۔“ عمان نے پرسکون لہجے میں کہا۔

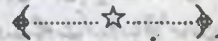
”کیا... اتنی جلدی؟ میں نے کوئی تیاری نہیں کی، میں کیسے جا سکتی ہوں؟“

”پلیز بیٹا! اب انکار مت کیجئے گا، میں نے آپ کی ہر بات مانی تھی، کیا میری خاطر آپ میرے ساتھ پاکستان نہیں جا سکتیں؟“ اس نے التجا جت سے کہا، تو اس کا سر بے اختیار ہی اقباب میں مل گیا۔

”یا... ہو!“ عمان نے خوشی سے نعرہ لگایا، وہ بھی ہلکا سا مسکرائی، پھر عمان نے اس کے ساتھ مل کر پیکنگ مکمل کی، سب پاکستان جانے کے لئے بے حد خوش تھے، سوائے زاریہ کے، وہ بے حد پریشان تھی، وہاں ذوالنون شاہ سے اگر سامنا ہو گیا تو...؟ وہ یہی سوچ سوچ کر پریشان تھی، پھر جمعہ کے دن صبح سات بجے وہ سب لاہور ایئر پورٹ پر تھے، پھوپھو زید بھائی، نمرہ بھابی اور لالہ بیچوں سمیت انہیں ریسیو کرنے آئے تھے، اسے دیکھ کر تو لالہ بیچ چلا اٹھی تھیں، کتنے شکوے تھے، جولا بیہ اور نمرہ بھابی نے ایئر پورٹ پر کھڑے ہی کر ڈالے، وہ سر جھکا کر تنہی رہی، پھر یہ ہنسا مسکراتا قافلہ گھر لوٹ آیا۔ جب گاڑی ان کے بنگلے کے قریب رکی تو اس نے بے تابی سے وائٹ کل کو دیکھا، آج بھی وہ باہر سے اتنا ہی شاندار تھا اور وہی واضح من باہر کھڑا تھا، اس کی آنکھیں بے اختیار ہی غم ہونے لگیں، اس نے جلدی سے خود پر کنٹرول کیا۔

وہ فریش ہو کر نیچے آئی، تب تک ٹیبل پر ناشتہ لگ چکا تھا، سب نے ناشتہ کیا، پھر سب بیٹھے کافی دیر باتیں کرتے

رہے وہ بھی لائیبہ آپنی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا جواب دیتی رہی بعد میں ریٹ کرنے کے لئے کمرے میں آگئی۔



وہ میسر پر کھڑی وائٹ محل کو دیکھ رہی تھی آج انہیں آئے ہوئے ساتواں دن تھا اور اس کا زیادہ تر وقت میسر پر گزرتا لیکن وہ حیران تھی ان دنوں میں ایک بھی وفد اس گھر میں رہنے والے افراد کو دیکھا اور نہ ذوالنون شاہ کو اور نہ ہی اس کی بیوی کو شاید وہ لوگ کچھ دنوں کے لئے کراچی گئے ہوں وہ خود ہی کہتی لیکن وہ اس دل کا کیا کرنی جو ایک بار ذوالنون شاہ سے ملنے کو محل رہا تھا؟ اس نے حسرت سے وائٹ محل کو دیکھا کسی وقت پوری آزادی کے ساتھ وہ اس محل میں گھومنا کرتی تھی وہ انہی سوچوں میں گھری ہوئی تھی جب عمان اسے پکارتا ہوا اوپر آ گیا۔

”ایسا! آپ یہاں ہیں میں آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈ رہا تھا۔“ عمان نے خشکی سے کہا۔

”کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ لائیبہ آپنی صبح اسلام آباد جا رہی ہیں تو ہم سب نے پردگراں بنایا ہے اسلام آباد اور دوسری جگہوں کی سیر کی جائے اس لئے ہم سب اسلام آباد لائیبہ آپنی کے ساتھ جا رہے ہیں۔“ عمان نے بڑبڑاتے انداز میں کہا۔ سب ہی جا رہے تھے اس لئے چاروٹا چار اُسے بھی جانا پڑا۔

پہلے دن وہ جی بھر کے بور ہوئی اسلام آباد میں وہ سب لائیبہ آپنی کے گھر تھے۔

”کیا ضرورت تھی ابھی آنے کی؟ کچھ دن بعد پلان بنالیتے۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”اپنا! صرف ایک ہفتہ ہے ہمارے پاس اس کے بعد رمضان شروع ہو جائے گا روزوں میں تو ہم گھوم نہیں سکتے اور پھر عید کے بعد تو ہمیں واپس جانا ہے۔“ عمان نے چوکر کہا پہلے تو انہوں نے اسلام آباد گھومنا پھر مری ایوبیہ کاغان، تھانہ علی سارے علاقوں کی سیر کی۔ سب نے بے حد انجوائے کیا جبکہ وہ بے حد اُداس تھی بار بار اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں ہر چیز میں اس کی دلچسپی مفرغی۔ وہ سب واپس اسلام آباد آ گئے۔

”زاری! تم زک جاؤ میرے پاس چند دنوں کے لئے۔“ لائیبہ نے کہا صبح ان لوگوں نے واپس لاہور چلے جانا تھا پرسوں پہلا روزہ تھا۔ لائیبہ چاہتی تھی کہ زاری یہاں زک جائے۔

”نہیں آپنی! اتنے دن تو یہاں رہ لیا ہے میں بھی سب کے ساتھ ہی جاؤں گی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”بیٹا! بہن اتنے پیار سے اصرار کر رہی ہے تو زک جاؤ۔“ ذیل شاہ نے زری سے کہا تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔



”ذوالنون بیٹا! اب کیسی طبیعت ہے؟“ آمنہ شاہ نے زری سے پوچھا۔

”پہلے سے بہتر ہے۔“ اس نے مختصر کہا وہ اس وقت لان میں بیٹھا خانے کس سوچ میں گم تھا۔

”ذوالنون! تمہارے دادا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ تمہیں یاد کر رہے ہیں تمہاری بے اعتنائی انہیں اُدے گی انہیں معاف کر دو۔“ آمنہ شاہ نے زری سے کہا۔

”لتناں! مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا دادا جان میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں کتنا مان تھا مجھے ان پر۔“ اس نے دھکی لکھے میں کہا۔

”بیٹا! غلطی سب سے ہو جاتی ہے انسان تو خطا کا پٹلا ہے پھر جو ہوا وہ تمہاری قسمت میں لکھا تھا کتنے دن ہو گئے ہیں تم ان کے کمرے میں نہیں گئے بیٹا! وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں ابھی جاؤ ان سے مل کر آؤ۔“ آمنہ شاہ

نے رمان سے کہا۔

”جی لتناں! جاتا ہوں۔“ اس نے مؤدب لہجے میں کہا وہ ابھی اٹھا ہی تھا اس کا سیل فون بجنے لگا حمزہ شاہ کا فون تھا۔

”السلام وعلیکم! بابا جان!“

”علیکم السلام! ذوالنون بیٹا! آپ کراچی میں ہو؟“ حمزہ شاہ نے پوچھا۔

”جی بابا جان! خیریت تو ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ذوالنون! اسلام آباد کی فرم میں کچھ مسئلہ ہو گیا ہے اس لئے تم صبح ارجنٹ وہاں پہنچو۔“ حمزہ نے پریشانی سے کہا۔

”اوکے بابا جان! آپ پریشان نہ ہوں میں سنہال لوں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا! مجھے وہاں جا کر ساری اپ ڈیٹ دینے رہتا۔“ حمزہ شاہ نے کہا۔

”اللہ حافظ!“ اس نے سٹل جیب میں رکھا آمنہ شاہ کو اسلام آباد جانے کا بتا کر وہ دادا جان کے کمرے میں آ گیا۔ انوار شاہ اسے دیکھ کر محل اٹھے تھے۔

”ذوالنون! اپنے دادا کو معاف کر دے۔“ انوار شاہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

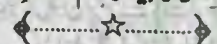
”دادا جان! معافی مانگ کر مجھے گنہگار مت کریں۔“ اس نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ بھوم لئے۔

”ذوالنون! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں تمہاری بے اعتنائی مجھے اُدے گی۔“ انوار شاہ نے ہیکے لہجے میں کہا۔

”دادا جان! میں بھی آپ سے بہت پیار کرتا ہوں ناراض نہیں ہوں اس دن جو بھی کہا وہ غصے میں کہہ دیا لیکن مجھے سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”اب آپ آرام کریں مجھے کچھ کام کرنا ہے صبح اسلام آباد کے لئے نکلتا ہے۔“ اس نے زری سے کہا۔

”اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے اس آنے والے بابرکت مہینے کے صدقے اللہ تمہاری چھوٹی خوشیوں سے بھر دے آمین!“ انوار شاہ نے اس کی پیشانی بھوم کر صدقہ دل سے دعا دی۔



”زاری! چلو مارکیٹ چلیں۔“ لائیبہ نے جگلت میں کہا۔

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”یار! صبح پہلا روزہ ہے روزہ رکھ کے شاپنگ کرنا میرے بس میں نہیں ہے اور رات کو اتنا ہجوم ہوتا ہے مجھے گھبراہٹ ہوئی ہے۔“ زاری نے جھرجھری لے کر کہا۔

”آپنی اس وقت؟“ اس نے ہچکچا کر کہا اس کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا باہر جانے کے لئے۔

”ارے! ابھی تو شام کے چار بجے ہیں کوئی بھانڈ نہیں چلے گا۔“ لائیبہ نے زری سے کہا۔

”لو کہ چلیں۔“ وہ فونڈ کھڑی ہوئی وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ مارکیٹ آ گئیں لائیبہ جانے کس کس دکان میں شاپنگ کرتی تھا میں اسے بھی گھسیٹ رہی تھی وہ جی بھر کے بے حشرہ ہوئی جانے اس کا دل کیوں گھبرا رہا تھا؟ اس کی پٹائی جس الرٹ کر رہی تھی پیچھے کھونے والا ہو۔

”آپنی! بس کریں گھر چلیں۔“ اس نے پریشانی سے کہا۔

”اوکے ڈیز! چلو“۔ لائبہ نے اس کے لئے بھی کافی شاپنگ کی، لیکن اس نے کوئی انٹرسٹ نہ لیا، اس نے شاپنگ بیگز گاڑی میں رکھے۔

”زاری! آؤ! شکرمہ کھالیں“۔ لائبہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نو... آئی! مگر چلیں پھر کسی دن آئیں گے“۔ اس نے تیزی سے کہا تو لائبہ اس کی جلد بازی پر مسکرا دی۔

وہ بارنگ میں گاڑی پارک کر کے باہر آیا، گاڑی کولاک کیا دفعتاً لائبہ کی نظر اس پر پڑی تو حیرت زدہ اسے دیکھتی رہ گئی، اچانک اس کی نظر لائبہ پر پڑی جو اسے دیکھ رہی تھی وہ چونک گیا، فاصلہ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔

”لابیہ آئی! چلیں“۔ اس نے گاڑی کا گیٹ کھول کر کہا، لیکن لائبہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی اس نے زچ ہو کر ذرا کی ذرا لائبہ آئی کی نظروں کی سمت دیکھا، اور اس کی نگاہ پلٹنا بھول گئی وہ ساکت نظروں سے ایک ٹنگ اسے دیکھ رہی تھی۔

”السلام وعلیکم لائبہ آئی! کیسی ہیں آپ؟“ وہ چلتا ہوا لائبہ کے قریب آ گیا۔

”علیکم السلام! اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں“۔ لائبہ نے اپنی حیرت پر قابو پا کر کہا، تبھی ذوالنون شاہ کو اپنے چہرے پر کسی کی نظروں کی پیش کا احساس ہوا، اس نے نگاہ گھما کر دیکھا تو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا، دنگ نظروں سے وہ زاریہ کی طرف دیکھ رہا تھا، جو چند قدم کے فاصلے پر گاڑی کا گیٹ ہاتھ میں پکڑے، فتنے چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لائبہ نے گھبرا کر زاریہ کی طرف دیکھا، جو ذوالنون شاہ کی طرف دیکھ رہی تھی، لائبہ اسے عجیب سی جوشین سے بوکھلائی تھی۔

”زاریہ...!“ ذوالنون شاہ کے لب نیم وا ہوئے وہ بے یقینی سے زاریہ کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ تیز قدم اٹھاتا اس کے پاس آ گیا۔ ذوالنون شاہ نے بے قراری سے پکارا، آنسو زاریہ کا چہرہ تیزی سے بھگور رہے تھے اس نے برستی آنکھوں سے ذوالنون شاہ کی طرف دیکھا، پھر تیزی سے گاڑی میں بیٹھ کر اپنی سائیکل کا ڈور بند کر لیا۔

”ڈرائیور! گاڑی اسٹارٹ کرو“۔ زاریہ نے تیزی سے کہا۔ وہ ٹنگ سا کھڑا زاریہ کا شدید دھمک دیکھتا رہا۔

”ذوالنون! تم مجھے اپنا فون نمبر دے دو میں فون پر تم سے بات کروں گی“۔ لائبہ آئی نے تیزی سے کہا تو اس نے اپنا کارڈ لائبہ آئی کو دے دیا۔ وہ شاکڈ سا کھڑا سلور کھڑکی گاڑی کو تیزی سے اپنی نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھ رہا تھا۔

وہ سارے راستے آنسو ضبط کرتی رہی، دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھیں، گھر آ کر وہ کمرے میں چلی گئی، لائبہ اس کے پیچھے نہ گئی، کیونکہ وہ جانتی تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ رات کو وہ کھانے کے ٹیبل پر بیٹھی نہ آئی، تو لائبہ تشویش میں گھر گئی، وہ اس کا کھانا کمرے میں لے آئیں وہ ٹیکے میں منہ دیئے رونے میں مصروف تھی، بھیگی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”رازی! اٹھو... کھانا کھا لو“۔ لائبہ نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تو اس کے رونے میں اور بھی رویا آ گئی۔

آئی! مجھے صبح لاہور جانا ہے“۔ زاریہ نے کہا۔

”زاری! افراد کی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے“۔ لائبہ نے رمان سے کہا۔

”آئی! میری زندگی جیسے گزر رہی ہے سو گزر رہی ہے، لیکن اب میں یہ نہیں چاہتی کہ ذوالنون دوبارہ میری

طرف پئے اور اس معصوم لڑکی کی زندگی خراب ہو، وہ شادی شدہ ہے، یقیناً اس نے بچے ہی ہوں گے، میری وجہ سے کسی کا گھر خراب ہو، یہ میں برداشت نہیں کر سکتی، اور انوار شاہ...“ ایک دم اس نے اپنی زبان دانتوں کے نیچے دبا دی۔

”انوار شاہ...! کیا مطلب؟“ لائبہ جو اسے غور سے سن رہی تھی، انوار شاہ کے ذکر پر چونک گئی۔

”کچھ نہیں... میرا مطلب تھا اس کی فیملی بھی ڈسٹر ب ہو جائے گی“۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔

”زاری! تم بہت اعلیٰ ظرف کی مالک ہو“۔ لائبہ نے بے ساختہ اسے سراہا۔

”لیکن یوں اچانک ذوالنون شاہ کو راستے میں انکود کرنا مجھے اچھا نہیں لگا“۔ لائبہ نے افسوس سے کہا تو زاریہ کا دل ڈوب سا گیا، جب سے وہ پاکستان آئی تھی اس وقت سے یہی خواہش کر رہی تھی، ذوالنون کو دیکھنے کی، جب وہ سامنے آیا تو وہ بوکھلا کے بھاگ آئی، وہ کسی بھی صورت اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”آئی! مجھے اس ٹاپک پر مزید بات نہیں کرنی“۔ اس نے ہلکی سی ہوا کر کہا۔

”اوکے فائن! تم کھانا کھا لو اور سو جاؤ“ صبح حری کے وقت اٹھنا بھی ہے“۔ لائبہ نے محبت سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا، لائبہ نے کمرے سے اپنا سیل فون اور کارڈ لیا، جو ذوالنون شاہ نے اسے دیا تھا اور وہ میسر پر آ کر اس کا نمبر ملانے لگی، تیسری نیل پرفون اٹھایا گیا۔

”ہیلو...!“ ذوالنون کی بھاری آواز اس کے کانوں سے گرائی، وہ تو اتفاق سے بچوں کے لئے شاپنگ کرنے چلا گیا تھا، اس کے تصور میں بھی نہیں تھا، زاریہ سے سامنا ہو جائے گا، جس طرح زاریہ نے اسے انکود کیا تھا، وہ بہت ہرٹ ہوا تھا، فوراً واپس گھر آ گیا، بے تابی سے وہ لائبہ کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔

”جی لائبہ آئی! میں بھی آپ کے فون کا انتظار کر رہا تھا“۔ ذوالنون نے بے یقینی سے کہا۔

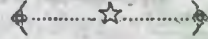
”ذوالنون! مجھے تم سے بات کرنی ہے فون پر نہیں، میں ٹوفن“۔ لائبہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”جی کیا بات کرنی ہے؟“ ذوالنون کی بے قراری عروج پر تھی۔

”وہ تو کل ہی بتاؤں گی، کیا کل افطار پر تم میرے گھر آ سکتے ہو؟“ لائبہ نے پوچھا۔

”لابیہ آئی! افطار پر تو نہیں آ سکتا، دن کے ٹائم آ سکتا ہوں“۔ ذوالنون نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، کل میں انتظار کروں گی“۔ پھر اس نے ذوالنون کو ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا۔



آج پہلا روز تھا، ہر طرف عجیب سا نور پھیلا تھا، بچے بوئے سب ہی روزہ رکھنے کے لئے پرجوش تھے، وہ حری کر کے کمرے میں آ گئی، فجر کی نماز ادا کی، جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو لب خاموش تھے آنکھوں سے آنسو جاری تھے، تنہا ہی دیر ہاتھ اٹھائے وہ روتی رہی، پھر قرآن پاک پڑھ کر وہ لیٹ گئی۔

”نیکیم صلیبہ! باہر کوئی ذوالنون شاہ آئے ہیں، کبیرہ ہیں آپ سے ملنا ہے“۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھی، جب ملازم نے آ کر کہا۔

”آپ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آتی ہوں“۔ لائبہ نے قرآن پاک کو احتیاط سے بند کرتے ہوئے کہا۔ حری کرنے کے بعد سب سو گئے تھے، صبح بچوں کو اسکول اور شوہر کو آفس بھیجنے کے بعد وہ پھر سو گئی، ساڑھے دس بجے اس کی آنکھ کھلی تو وہ اٹھ کر قرآن پاک پڑھنے لگی، ابھی اسے پڑھتے ہوئے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا، جب ملازم نے اسے ذوالنون شاہ کی آمد کا بتایا۔

”السلام علیکم؟“ اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

”علیکم السلام!“ ذوالنون احترام سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ ذوالنون!“ لائبہ نے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔

”اسلام آباد کیسے آتا ہوا؟“ لائبہ نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”یہاں کی فہم میں کچھ پرالیم ہو گیا تھا اس سلسلے میں کل اسلام آباد آیا تھا۔“ ذوالنون نے کہا۔

”لائبہ آپ کی بات کرنا چاہتی تھیں؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”ذوالنون! چند سال پہلے کیا ہوا تھا؟ تم مجھے ساری سچائی بتاؤ!“ لائبہ نے بنجیدگی سے کہا۔

”کیا آپ کو زاریہ نے کچھ نہیں بتایا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”بتایا ہے صرف یہ کہ اس نے نکستی سے پہلے شرط رکھی تھی کہ شادی کے بعد تم اس کے ساتھ لندن رہو گے“ تم نے

انکار کر دیا تو وہ لندن چلی آئی۔“ لائبہ نے کہا۔

”یہ حقیقت نہیں ہے۔“ ذوالنون نے مدہم لہجے میں کہا۔

”کیا حقیقت ہے؟“ لائبہ نے بے چینی سے پوچھا تو ذوالنون نے الف سے لے کر ی تک ساری بات بتادی

اور لائبہ حیرت زدہ رہ گئی چند لمحوں پر وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”اتنا کچھ ہو گیا اس بے وقوف لڑکی نے کسی کو بتایا ہی نہیں۔“ لائبہ نے افسردگی سے کہا۔

”انوار شاہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا انہوں نے تم دونوں کی زندگی خراب کر دی۔“ لائبہ نے افسوس سے کہا۔

”دادا جان اب خود اپنے کیے پر افسوس کرتے ہیں لیکن اب ان کے افسوس کرنے سے گزرا ہوا وقت واپس

نہیں آ سکتا۔“ ذوالنون نے گہری سانس لے کر کہا۔

”ہانیہ کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔“ اس نے دہمی لہجے میں کہا تو وہ چند لمحوں پر کچھ بول ہی نہ سکا۔

”زاریہ پاکستان کب آئی؟“ اس نے پوچھا۔

”دو ہفتے ہو گئے ہیں پانچ سال بعد آئی ہے عید کے بعد چلی جائے گی۔“ لائبہ نے کہا۔

”کیسی ہے زاریہ... اپنے گھر خوش تو ہے؟ میرا مطلب ہے اپنے شوہر کے ساتھ؟“ اس نے ہچکچا کر پوچھا۔

”زاریہ نے شادی نہیں کی۔“ لائبہ نے عام سے لہجے میں کہا۔

”کیا...؟“ وہ ششدر رہ گیا۔

”ہاں... بالکل... اس نے شادی نہیں کی کیونکہ وہ آج بھی تم سے محبت کرتی ہے۔“ لائبہ نے مدہم لہجے میں

کہا۔

”زاریہ تو بہت معصوم ہے ذوالنون! آج بھی اُسے اپنی نہیں تمہاری زندگی کی خوشیوں کا خیال ہے ذوالنون تم

زاریہ سے شادی کر لو۔“ لائبہ نے بنجیدگی سے کہا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں لائبہ آپ! یہ زاریہ کے ساتھ نا انصافی ہے۔“ اس نے بے قراری سے کہا۔

”کیوں؟ اس میں نا انصافی کیا ہے؟“ لائبہ نے الجھ کر پوچھا۔

”لائبہ آپ! پہلے کی بات اور تھی اب میں دو بچوں کا باپ ہوں کیا یہ زاریہ کے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی؟“

”ذوالنون! تم مجھے ایک بات بتاؤ کیا اب بھی تم زاریہ سے محبت کرتے ہو؟“

”لائبہ آپ! میں اس سے آج بھی بہت محبت کرتا ہوں ایک پل اُسے نہیں بھول پایا۔“ اس نے بے بسی سے

کہا۔

”ذوالنون! مجھے پتہ ہے زاریہ کسی سے شادی نہیں کرے گی ابھی بھی وقت ہے تم دونوں کے پاس سوچ کچھ

فیصلہ کر لو زاریہ سے میں بات کروں گی۔“ لائبہ نے سمجھداری سے کہا۔

”کیا ایسا ممکن ہے لائبہ آپ!؟“ وہ تجھیر ہوا امیدیک ایک کرن نے اس کے اندر توانائی سی بھری تھی۔

”ہوئے کو تو سب کچھ ممکن ہے اور زاریہ کا ظرف بہت بڑا ہے وہ تمہارے بچوں کو قبول کر لے گی۔“ لائبہ آپ

نے یقین سے کہا۔

”تم اپنے پیرئس سے بات کرڈ باقی میں بیٹل کروں گی اس دفعہ میں تم دونوں کو کوئی بے وقوفی نہیں کرنے

دوں گی۔“ لائبہ نے بٹاش لہجے میں کہا تو وہ محل اٹھا تھا۔



اگلے دن زاریہ کے ساتھ وہ بھی لاہور آ گئی اس نے سب کو ساری بات بتادی سب حیرت زدہ رہ گئے انوار شاہ

کی سنگدی پر سب کو بہت دکھ ہوا پھر اس نے اپنے اور ذوالنون شاہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا بھی بتایا۔

”اب آپ لوگ سوچ لیں میرے خیال سے جب ساری غلط فہمی دور ہوگئی ہے تو زاریہ اور ذوالنون شاہ کی

شادی کر دینی چاہیے۔“ لائبہ نے بنجیدگی سے کہا۔

”لیکن زاریہ! وہ کیا کہتی ہے؟“ نبیل شاہ متذبذب تھے۔

”ماموں! زاریہ مان جائے گی ابھی وہ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہے پہلے میں نے سوچا آپ لوگوں سے پوچھ

لوں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہیں تو میں زاریہ سے بات کرتی ہوں۔“ لائبہ نے پُر سوچ انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے لائبہ! تم زاریہ سے پوچھ لو اگر وہ رضی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ علیہا شاہ نے مسکرا کر کہا،

کیونکہ وہ جانتی تھیں زاریہ ذوالنون سے بہت محبت کرتی ہے۔

”کیا... یہ کیا کہہ رہی ہیں لائبہ آپ!؟“ وہ ساری بات سن کر حیرت سے چلا اٹھی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں زاری! ساری بات میں نے تمہارے سامنے بیان کر دی ہے اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے

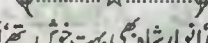
لیکن پہلے والی بے وقوفی مت دکھانا۔“ انہوں نے شرارت سے کہا تو وہ درط حیرت میں ڈوب گئی تھی اسے یقین

نہیں آ رہا تھا قسمت یوں بھی مہربان ہوتی ہے اسے آج پتہ چلا تھا ذوالنون شاہ اس کا ہور ہا تھا اس کی محبت جیت

گئی تھی خوشی اور سرشاری اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”زاری! کہاں کھو گئیں؟“ لائبہ نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ خوشی سے لائبہ کے ساتھ لپٹ گئی۔

”تھینک یو سوچ لائبہ آپ! اس نے ٹھکتے لہجے میں کہا لائبہ نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔



پھر دونوں گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی انوار شاہ بھی بہت خوش تھے ایک بوجھ تھا جوان کے دل سے سرک گیا

تھا وہ خود زاریہ سے ملنے آئے تھے اس سے معافی بھی مانگی تو اس نے تڑپ کر دونوں ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔ آم نہ

شاہ اور حمزہ شاہ بھی بہت خوش تھے اور بچوں کی خوشی کا تو ٹھکانہ نہ تھا وہ سب لوگ ذوالنون شاہ میل آئے ہوئے

تھے سوائے ذوالنون کے وہ ابھی تک گراہی تھا اس دن کے بعد کبھی اس کا ذوالنون شاہ سے سامنا نہیں ہوا

تھا۔ عثمان اسے خوش دیکھ کر بے حد خوش تھا اسے اکثر چھیڑتا رہتا ذوالنون شاہ کے دونوں بچوں سے اس کی اچھی

خاص دوستی ہوگئی تھی زندگی ایک دم بہت خوبصورت سی ہوگئی تھی رمضان کا دوسرا عشرہ چلا رہا تھا اس نے خوب

نے؟“ ذوالنون نے اس کی طرف دیکھ کر نرمی سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا، پھر وہ اٹھا اور الماری سے ایک فائل نکال کر لے آیا۔

”زار یہ! یہ تمہاری رونمائی کا گفٹ ہے۔“ ذوالنون نے وہ فائل اس کے ہاتھ میں پکڑادی، اس نے حیرت سے پہلے فائل کو پھر ذوالنون شاہ کو دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”زار یہ! یہ وائٹ کل کے کاغذات ہیں آج سے یہ محل تمہارا ہے۔“ ذوالنون شاہ نے محبت سے چور لہجے میں کہا۔

”لیکن ذوالنون!۔۔۔۔۔“

”پلیز۔۔۔۔۔ زار یہ! کچھ مت کہنا، میں جانتا ہوں اُس وقت تم نے جان بوجھ کر کہا تھا، لیکن اب میں اپنی خوشی سے تمہیں دے رہا ہوں، اگر تم نے انکار کیا تو مجھے تکلیف ہوگی۔“ زار یہ نے کچھ کہنا چاہا تو ذوالنون نے اسے ٹوک کر نرمی سے کہا، بے اختیار محبت کے اس مظاہرے پر اس کی آنکھیں جھلک پڑی تھیں، وہ اس کے آنسو دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا۔

”زار یہ! آج تو خوشی کا دن ہے، پھر یہ آسو۔۔۔۔۔؟“ ذوالنون نے بے قراری سے کہا۔

”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں، اس مالک کائنات نے اتنا نواز دیا کہ میں اس کا شکر کس طرح ادا کروں؟“ اس نے ہیکلے لہجے میں کہا۔

”تم نے ٹھیک کہا زار یہ! اتنا جان کہتی ہیں جو ہوا وہ ہماری قسمت میں لکھا تھا، صبر کا پھل ضرور ملتا ہے۔“ ذوالنون شاہ نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا، وہ غم آنکھوں سے مسکرا دی۔

”یہ آنے والی عید ہمارے لئے بہت خوشیاں لے کر آئی ہے، اب ہمیں رونا نہیں مسکرانا ہے۔“ ذوالنون شاہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تمام کر محبت سے چور لہجے میں کہا، تو وہ ٹھیک آنکھوں سے مسکرا کر اس دیوانے کو دیکھنے لگی۔

”زار یہ! یہ آنے والی عید میرے لئے بہت اسپیشل ہے، ویسے تو عید دو دن بعد آئے گی، لیکن میری عید تو آج ہے، کیونکہ ”میری عید تم ہو۔“ ذوالنون شاہ نے خوشی سے سرشار ہو کر محبت بھرے لہجے میں کہا، اور نرمی سے اسے اپنے حصار میں لے کر غدا بھرے لہجے میں شعر پڑھنے لگا۔

۔ ہر دکھ غم کو بھول جائیں ہم
تم جو آؤ تو عید منا میں ہم
سنیال رکھے ہیں لفظوں کے مونی
داغ دل پھیلاؤ تو برسائیں ہم

زار یہ کے رخسار تھما اٹھے تھے، اس نے بڑی محبت سے ذوالنون شاہ کے خوشی سے دکتے چہرے کو دیکھا اور دل ہی دل میں اللہ پاک کا شکر ادا کرنے لگی، اس نے اپنا فیصلہ اللہ کے سپرد کیا تھا اور اس کی رضا میں راضی ہو گئی تھی، اور آج اللہ پاک نے اسے اتنا نواز اٹھا کہ وہ جتنا شکر ادا کرتی کہ تم۔

ختم شد

☆.....☆

دل لگا کر عبادت کی، شکرانے کے نوافل ادا کرتی رہی۔ ان دونوں کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی، اٹھائیسویں روز سے کوان کی شادی بھی، عید کے تیسرے دن اس کی فیملی نے لندن چلے جانا تھا، دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں زور و شور پکڑی تھیں، آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا، وہ پوری گن سے اور عقیدت سے عبادت کر رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا نواز دیا تھا وہ اس کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کہ تھا، ذوالنون شاہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، ایک دفعہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ گھر سے نہ نکلتی، ذوالنون شاہ کا کئی بار اس کے سیل پر فون آیا، اس نے یک ہی نہ کیا، اسے لائبہ آبی بتا چکی تھیں، وہ اس سے تھوڑی بچتا ہے، اس لئے وہ فون پک نہیں کر رہی، کیونکہ وہ جانتی تھی وہ اس سے باز پرس ضرور کرے گا، اس لئے وہ گھبرا جاتی کہ وہ کیسے فیس کرے گی۔ آخر کار اس کی شادی کا دن بھی آن پہنچا، عجیب سی گھبراہٹ اس پر سوار تھی، جانے کتنی بار رو پکچی تھی، وہ ساری ارینج منٹ لان میں کی گئی تھی، ویسے بھی شادی سادگی سے کی گئی تھی۔

بچے اپنی پتی ماما کو پا کر بہت خوش تھے، مختلف رسموں کے بعد اسے ذوالنون کے کمرے میں پہنچا دیا گیا، کمرہ بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، ذوالنون شاہ سے سامنا کرنے سے اس کا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا، تھوڑی دیر بعد ذوالنون شاہ کمرے میں آ گیا تو اس کی دھڑکنیں اور بھی تیزی سے چلنے لگی تھیں، وہ چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

”السلام وعلیک!“ ذوالنون نے فریش لہجے میں کہا، آج وہ بہت خوش تھا، اتنا کہ اس کا کوئی شمار نہیں، اسے تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ زار یہ اس کی ہو چکی ہے۔

”علیک السلام!“ اس کے صرف لب بلبے تھے، ذوالنون شاہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہا تھا، اس کی نظروں کی تپش سے وہ گلہزار ہو گئی تھی، شرم سے اس کا چہرہ جھک گیا تھا۔

”زار یہ! تمہارا نام کمزور کہاں ہے؟“ اس کی آنکھوں سے شرارت صاف نظر آ رہی تھی، وہ مسکراہٹ ضبط کرتا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”نام مر گیا۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”بہت افسوس ہوا، ورنہ آج تم سب نام ہوتیں۔“ ذوالنون شاہ نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”میں بچے سے کیسے شادی کر سکتی تھی؟“ اس نے برا مان کر کہا، تو ذوالنون شاہ کا ہتھکڑ بے ساختہ تھا، وہ سخت سے دوچار ہو گئی۔

”زار یہ!۔۔۔۔۔؟“ ذوالنون شاہ نے سنجیدگی سے پکارا۔

”زار یہ! تمہارا ظرف بہت اعلیٰ ہے، دوسروں کی خاطر تم نے اپنی خوشیوں کی قربانی دے دی، لیکن زار یہ! تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا؟ ایک بار۔۔۔۔۔ صرف ایک بار مجھ پر اعتبار کر کے تو دیکھتیں زار یہ! ہم نے محبت کی بھی کوئی گناہ نہیں جو دوسروں سے ڈرتے، دادا جان نے جو کیا سو کیا، تمہیں تو مجھے بتانا چاہئے تھا۔“ ذوالنون شاہ نے دھکی لہجے میں کہا۔

”سوری ذوالنون! دادا جان نے مجھے سختی سے منع کیا تھا اور صائم والے واقع نے مجھے اندر تک خوف زدہ کر دیا تھا۔“ اس نے آہستگی سے صفائی پیش کی۔

”زار یہ! آج ہماری زندگی کی نئی شروعات ہے، جس کو چلانے کے لئے اعتبار بہت ضروری ہے، ہمیں ایک دوسرے پر اعتبار کرنا ہے، کچھ بھی ہو جائے ہم ایک دوسرے سے کبھی کبھار نہیں چھپائیں گے، ٹھیک کہاں میں

سیدہ طوبیٰ

افسانہ

میرے وطن کے اولس لونگو

”السلام علیکم دیورز چچ نیوز کے ساتھ میں ہوں دعا سب سے پہلے چچ بیڈ لائنز پنجاب کے شہر ملتان کی رہائشی عاشر میں ہوں عالیان خان بولیشن میں شامل کرتے ہیں ایک خاتون نے مہنگائی سے تنگ آ کر اپنی تین بیٹیوں اور



میں مزید خبروں اور بیڈ لائنز کے ساتھ حاضر ہوں گے لیتے ہیں ایک کمرشل بریک دیکھتے رہنے چچ نیوز۔“
”اللہ جانے کیسے ماں باپ ہوتے ہیں جو اپنے ہی بچوں کو مار دیتے ہیں۔“ دائم صاحب کے ساتھ صوفی پریشی ان کی شریک حیات طائلہ خاتون نے کچھ دیر پہلے ہی جانے والی خبر پر جھرجھری لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔
”بس بیگم! جس کے پاس رہنے کو گھر بھوک مٹانے کو کھانا اور تن ڈھانپنے کو کپڑا نہ ہو وہ ایک اکیلا آدمی ہی عاجز ہے پھر وہ تو چار بچوں کی ماں تھی یہ سوچو کہ کس دل گردے اور مجبوری کے عالم میں اس نے یہ

ایک بیٹے کو زہر کھلا کر خود کشی کر لی اور ہر سال کی طرح اس سال بھی رحمتوں اور برکتوں والے مہینے کی آمد آمد اور اشیاء خورد و نوش کی قیمتوں میں چوتھائی فیصد اضافہ غریب عوام کے لئے ایک ایٹم بم سے کم نہیں آج پھر روڈ شیوں کا شہر کراچی اندھیرے میں ڈوبا رہا شہر کے مختلف علاقوں میں 12 سے 16 گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ جبکہ کراچی ہی میں آج لقمہ اجل بن جانے والوں کی تعداد 12 رہی ان میں سے 9 افراد کا تعلق کسی گروہ سے نہیں تھا جبکہ لی مارکیٹ کا رہنے والا اشرف جو اپنے کبے کا واحد کفیل تھا دہشت گردوں کی اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ بنا بولیشن



انتہائی قدم اٹھایا ہے ہمارا دین ایک مکمل دین ہے اگر اس پر عمل کرتے رہیں تو پیسہ روٹنگ میں رہے اور کوئی غریب بھوکا نہ ہوئے کوئی آدی اپنے گھر کو آگ نہ لگائے اور کوئی بھی شخص خود کش دھماکے کے لئے تیار کھڑا نہ ملے۔

”ٹھیک کہتے ہیں آپ جب ہم روٹی، کپڑا اور مکان کی آس لوگوں سے لگائیں گے تو ایسا ہی ہوگا اور پھر اللہ تعالیٰ صاف کہتا ہے کہ تمہارے ہی اعمال کی صورت تم پر حکمران بھیجے جائیں گے تو یہ ہمارے ہی اعمال ہیں جو ہم پر بھوک و افلاس کا حملہ ہے۔ ان کی پاں میں پاں ملاتے ہوئے وہ خبروں کی طرف متوجہ ہوگی جس جہاں اب تفتیلات بتائی جا رہی ہیں۔

”اف اس لائٹ کو بھی انہی جانا تھا۔“ طائلہ خاتون جھنجھلا کر بولیں۔

”زامہ، زامہ بیٹا گیس لائٹ تو جلاؤ۔“ صوفے پر بیٹھے ہی انہوں نے بیٹی کو آواز لگائی۔

”کیا بات ہے بیٹا جی آج کیا کھانا نہیں ملے گا۔۔۔۔۔؟“ لاؤنج میں موجود گیس لائٹ جلا کر وہ واپس کچن میں جا رہی تھی جب دائم صاحب نے کھانے کے بارے میں استفسار کیا، عموماً وہ لوگ نوبے تک کھانا کھا لیتے تھے مگر اب ساڑھے نو بجنے کو تھے اور کھانا نادر۔

”بس ابو! تھوڑی دیر ہے اصل میں آج سارا دن گیس نہیں تھی ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی ہے اسی لئے دیر ہوئی۔“ کہتے ساتھ ہی وہ کچن میں بھاگی تھی کہ جانتی تھی والد صاحب بھوک کے کہتے ہیں۔

”لو ایک تو اس حکومت سے لائٹ کی لوڈ شیڈنگ کم ہوتی نہیں اور گیس کی لوڈ شیڈنگ بھی شروع کر دی۔“ ائم صاحب جھنجھلائے۔

”یہ صمیمین نہیں آیا ابھی تک نوبے تک تو آ جاتا ہے۔“ وہ طائلہ خاتون سے بیٹے کے بارے میں استفسار کر رہے تھے جو نائنٹ شفٹ میں کوچنگ پڑھا تھا۔

”اوا گیا۔“ دروازے کی مخصوص دستک پر وہ اٹھ

کر کھولنے چل دیں۔

”السلام علیکم!“ اندر آ کر با آواز بلند سلام کرتا وہ صوفے پر گر کرنے کے انداز میں بیٹھا تھا۔

”یہ لیس بھائی جان! میں نے آپ کے لئے شربت بنا کر پہلے ہی فریج میں رکھ دیا تھا۔“ صندل فوراً بھائی کے لئے شربت اٹھا لائی۔

”کیا ہوا بیٹا جی! آج کچھ زیادہ ہی تھک گئے ہو کیا۔۔۔۔۔؟“ دائم صاحب نے اس کے تھکے ماندے وجود کو غور سے دیکھا۔

”بس ابو! صبح کالج اور پھر شام کو کوچنگ کے بچے ساری انرجی چوس لیتے ہیں اور پھر گرمی بھی تو غضب کی ہے میں ذرا فریش ہو جاؤں پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔“ باپ کو مطمئن کرتا وہ کمرے میں فریش ہونے چل دیا اور دائم صاحب اپنے ہونہار اور فریئر دار بیٹے کی پشت دیکھتے رہ گئے جو پچھلے دو سال سے اپنا ایم بی اے مکمل کر کے جاب کی تلاش میں تھا اور آخر تھک ہار کر اس نے صبح کالج اور شام کو کوچنگ میں پڑھانا شروع کر دیا تھا کہ کچھ تو مل ہی جاتا تھا ورنہ دائم صاحب کی پنشن اور زمامہ کی ٹیوشن سے گھر کا خرچ کیا چلنا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مس! پاکستان کا قومی پہل کون سا ہے۔۔۔۔۔؟“

زامہ کے ایک شاگرد نے سوال کیا تو اس سے پہلے صندل بول پڑی۔

”ممبر کا پہل۔“

”اور قومی لباس۔۔۔۔۔؟“

”کفن۔“ صندل کے بولنے پر زامہ نے ابرو چڑھا کر دیکھا۔

”قومی کھیل۔“ بچہ صندل کے جوابات نوٹ بک پر لکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور وہ مزے سے بتا رہی تھی۔

”خود کش حملہ نہیں وہ بھی پرانا ہو گیا کوئٹرا اسٹرائیک۔“ صندل زامہ کی گھوریوں سے بے پرواہ بولے جا رہی تھی دراصل وہ رات کے لئے آٹا گوندھ

رہی تھی اس لئے صندل کو یقین تھا کہ وہ اسے اس وقت بار نہیں سکتی۔

”لیکن صندل باجی! کوئٹرا اسٹرائیک تو گیم ہے میں نے بھی کھیلا ہے۔“ چوٹی جماعت کا فرید حیرت سے صندل کا منہ دیکھ رہا تھا۔

”اف۔۔۔۔۔ بے وقوف وہی تو ہمارا قومی کھیل ہے ابھی پچھلے سال کئی پہاڑی پر کھیلا گیا اس سال لیاری میں اور اگلے سال کہیں اور کھیلا جائے گا۔“ مزے سے بچوں کی معلومات میں اضافہ کیا گیا۔

”مگر میری مس نے تو قومی کھیل ہاکی لکھوایا تھا“ جب میں ون کلاس میں تھا۔“ صندل کی بات فرید کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”ہاں تو اب تم کون سی کلاس میں ہو۔۔۔۔۔؟“ بگڑ کر پوچھا گیا۔

”فور۔“

”تو بس پھر ان تین سالوں میں قومی کھیل بھی تبدیل ہو گیا۔“ ہنری کاٹتے ہوئے شان بے نیازی سے کہا گیا۔

”چلیں میں اپنی مس سے پوچھوں گا۔“ فرید اس کی باتوں پر ذرا کم ہی یقین کرتا تھا کہ پہلے ایک دو بار وہ صندل کے مذاق کی وجہ سے اپنی مس سے پٹ چکا تھا۔

”تمہاری تو۔۔۔۔۔“

”صندل! جاؤ کچن میں سارا کام سمینو میرے بچے ہیں میں دیکھ لوں گی تمہیں تردد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ فرید کی طرف غصے سے بڑھتی ہوئی صندل کو زامہ نے کچن کے اندر دھکیلا۔

”بچے آپ کے نہیں اپنے ماں باپ کے ہیں آپ کے پاس تو صرف بڑھتے آتے ہیں۔“ کچن کی کڑکی سے گردن نکال کر صبح کی گئی جس پر سارے ہی بچوں کے دانت باہر نکل گئے۔

”بس۔۔۔۔۔ کام کرو اپنا اپنا اور شامیر دکھاؤ اپنی نوٹ بک۔“

”مس! 14 اگست آنے والی ہے تو مجھے اس پر لکھنا ہے اس اسائنمنٹ کے مارکس فائل میں ملیں گے۔“ آٹھویں کلاس کی روائے بھی اپنی نوٹ بک اس کی طرف بڑھائی۔

”ہاں تو لکھو اپنے ملک کے بارے میں کہ کتنی قربانیاں دے کر اور کتنی مشکلات جھیل کر حاصل کیا ہے ہم نے یہ ملک جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔“ ٹائٹل دیکھ کر اس نے ردا کو چیدہ چیدہ باتیں بتائیں۔

”مس! آپ جو باتیں کر رہی ہیں وہ تو ہسٹری ہے ہمیں تو کرنٹ انٹیر ز پڑھنا ہے تو میرا خیال ہے کہ میں دہشت گردی پوری بند لاشوں اور بقول صندل باجی کوئٹرا اسٹرائیک کے بارے میں ہی لکھ لیتی ہوں میرا اسائنمنٹ سب سے زیادہ اچھا ہے گا سب اب یہ ملک رہنے کے لئے نہیں چھوڑ جانے کے قابل ہے ہمیں کہا گیا ہے کہ اپنے ملک کی تعریف میں لکھو تو ملک میں کچھ اچھا ہوگا تو تعریف کی جائے گی ناں۔“ روائے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نوٹ بک اس سے لے لی۔

”نہیں ردا! یہ ملک یہ سرزمین آج بھی اتنی ہی انمول ہے جتنی ہسٹری میں رہی ہے ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے تاریخ کو لکھنے کی کوشش کی ہے اس سے سبق حاصل نہیں کیا جیسی آج ہسٹری اپنا آپ دہرا رہی ہے ہمارا ملک اگر دہشت گردی اور دوسری آفات میں جکڑا ہوا ہے تو کیا ہم اس کو چھوڑ دیں اگر تمہارے گھر کی عمارت خراب ہو جائے تو کیا تم اس کو چھوڑ کر چلی جاؤ گی نہیں ناں اس کی مرمت کرواؤ گی کہ جب تمہیں سامنے کی ضرورت تھی تو اس گھر نے تمہیں سایہ فراہم کیا پھر پاکستان کو چھوڑ جانے کی بات ہم اتنے آرام سے کیے کر جاتے ہیں کہ جب مسلمانوں پر برا وقت پڑا تو اس سرزمین نے بھی تو سایہ فراہم کیا تھا اور اب اگر یہ سرزمین مشکل میں ہے تو کیا ہمارا فرض نہیں اس کو ان مشکلات سے نکلانے کا اور پھر تم سب پاکستان کا آنے والا کل ہو اور کسی مفکر نے کہا ہے کہ۔ ماضی کی یاد

اور مستقبل کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے بہتر اپنے حال کو تعمیر کرو۔“ اسی لئے تمہارے ذہن اور نیت صاف ہونی چاہئے، مقصد نیک ہونے چاہئے اللہ تمہاری مدد کرے گا اور دیکھنا وہ دن دور نہیں جب ہمارا ملک بھی تمام تر آفات اور مشکلات سے آزاد ہوگا، اور ہم اس میں سکون و اطمینان سے رہیں گے۔“ زمامہ نے سنجیدگی اور رساں سے سمجھانا چاہا تھا۔

”مس! اس بات پر ایک نعرہ ہو جائے۔“ سب سے چھوٹا شامیر جوش سے بولا تھا۔
”پاکستان زندہ باد“ اور سب نے اس کا ساتھ دیا تھا۔
”او میرے بھولے بچو! صحیح کر لو پاکستان سے زندہ بھاگ۔“ عدیل پھر بھی مٹی اور اب چوں کہ زمامہ کے ہاتھ صاف تھے اس لئے اس کی ہونے والی عزت افزائی پر سب کلکھلا کر ہنس دیئے۔

☆.....☆.....☆
”اللہ خیر کرے پتا نہیں کس حال میں ہوگا میرا مصیبت“۔ طائلہ خاتون جلے ہیکر کی بلی کی طرح پورے لاؤنج میں پھر لگا رہی تھیں، مصیبت نوبے تک آجاتا تھا مگر اب گیارہ بجے کو تھے اور وہ اندر۔

”ای! ابو! پتا کرنے گئے ہیں ناں کچھ نہیں ہوگا بھائی کو“۔ زمامہ نے انہیں صوفے پر بٹھا کر آرام سے سمجھایا۔
”کہاں سے پریشان ناں ہوں فون اس کا آف ہے اور شہر کے حالات تم جانتی ہو پھر اس کا کوچنگ تو دور بھی اتنا ہے“۔ طائلہ خاتون کو طرح طرح کے خیالات ستائے جا رہے تھے۔

”لیس آگئے ابو بھی یقیناً بھائی کے ساتھ ہوں گے“۔ دروازے پر کھٹکے کی آواز سن کر عدیل بھاگی تھی۔
”کیا ہوا مصیبت کہاں ہے.....؟“ دایم صاحب کو اکیلا دیکھ کر طائلہ خاتون کا ہاسٹا حوصلہ بھی جاتا رہا۔

”کیا ہو گیا ہے طائلہ! قابو رکھو خود پڑ آجائے گا حالات کی وجہ سے ٹریفک بھی تو جام ہو جاتا ہے“۔ اپنی پریشانی چھپائے وہ بیوی کو حوصلہ دے رہے تھے اور پھر

پورے دو گھنٹے بعد دروازے پر ہونے والی تیل نے ان سب کو چونکا دیا تھا! آنکھوں ہی آنکھوں میں طائلہ خاتون کو حوصلہ دیتے دایم صاحب دروازہ کھولنے چل دیئے۔
”مصیبت یہ کیا..... کیا ہوا ہے.....؟“ مانتے اور ہاتھ پر بندھی پٹی اور خون آلود شرٹ کے ساتھ دایم صاحب کے سہارے چل کر اندر آتے مصیبت کو دیکھ کر طائلہ خاتون فوراً اس کی طرف ہلکی تھیں۔

”طائلہ! آرام سے کچھ نہیں ہوا! اپنے بیٹے تو دو زمامہ بھائی کے لئے چین کمر اور ہلدی ملا دودھ لے کر آئیں قاف!“۔ مصیبت کو اس کے بیڈ پر لٹاتے ہوئے انہوں نے طائلہ خاتون کو سکون سے رہنے کی ہدایت دی۔
”میں ٹھیک ہوں ابو! آپ امی کو ادھر میرے پاس ہی رہنے دیں“۔ چین کمر کے ساتھ دودھ پلا کر دایم صاحب اسے آرام کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے طائلہ خاتون کو باہر لے جانا ہی چاہتے تھے مصیبت نے ماں کی فکر مند دی دیکھتے ہوئے انہیں اپنے پاس رکھنے کو کہا تھا۔
”کہاں سے ٹھیک ہو خون دیکھو کتنا بہہ گیا ہے تمہارا یہ سب ہوا کیسے آخر.....؟“ اپنی روکھی آواز پر قابو پاتے ہوئے پیار سے استفسار کیا۔

”کچھ نہیں امی! حالات تو بعد میں خراب ہوئے تھے اصل میں ہمارے کوچنگ میں پڑنے والے کچھ اوباش لڑکوں کو سر عارف نے ڈانٹا تھا وہی لڑکے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سر عارف کو اسٹاف روم میں ہی مارنے لگے وہاں موجود باقی اسٹاف اور میں نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا تو انہوں نے ہمیں بھی چھوڑا بات زیادہ بڑھی تو کوچنگ کے ہی لڑکوں نے ان سے مقابلہ کیا کچھ لڑکوں کو بھی چوٹیں آئیں اور کوچنگ کو بھی نقصان پہنچا سر عارف اور سر عدیل تو اچھے خاصے زخمی ہو گئے تھے کوچنگ کے لڑکے ہی ان کو اپنی گاڑیوں میں ہاسٹل لے کر گئے اور پھر تمام زخمیوں کو حالات کے پیش نظر ان کے گھر تک چھوڑا مجھے بھی ایک اسٹنڈنٹ ہی چھوڑ کر گیا ہے۔“ اس کی ہمت تو نہیں تھی مگر ماں اور باقی گھر والوں

بہن کرنے کے لئے ساری بات بتانا پڑی۔
”اچھا بیٹا! زمامہ تمہارے لئے یہ جوں لائی ہے یہ بی لہو اور آرام کرو“۔ طائلہ خاتون نے بھی شکر کا کلمہ پڑھا اسے بہت زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں اور آرام کی ہدایت دیتی ہوئی باہر چل دیں۔

”بیٹا! بھلا جب استاد جو روحانی باپ ہوتا ہے اس کا یہ حال کریں گے تو ایسی تعلیم پاؤ گئی کسی کام کی جو تینز ادب و احترام ہی نہ سکھا سکے“۔ طائلہ خاتون نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اپنی رائے پیش کی۔
”بس بیگم! بعض اوقات وہ کام جو ہمارا دشمن انجام دے سکے اُس کو ہم خود اپنے ہاتھوں سے انجام دے کر پاپہ تک پہنچا دیتے ہیں پاکستان کو بگاڑنے والے پہلے کیا کتے تھے جو ہماری نوجوان نسل بھی اس مشن پر ان کے ہم قدم ہو گئی ہے اللہ ہی بھلا کرے پاکستان کا بیٹا ڈاکس بری طرح چٹا ہے اپنے استادوں کو اسے استاد نہ ہوں تو رہیں ہمارے جاہل کے جاہل“۔ دایم صاحب نے بھی اپنے غصے کا اظہار کیا۔

”ابو! ٹھیک ہے ہمارے ملک میں کچھ اچھا نہیں ہو رہا، مگر ہم سب ہی کیوں برائی ڈھونڈتے ہیں اچھائی ہمیں نظر کیوں نہیں آتی، بھائی کو اگر مارنے والے ان کے شاگرد تھے تو بچانے والے بھی تو شاگرد ہی تھے ناں۔“ زمامہ نے پانی کا گلاس دیتے ہوئے باپ کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔
”اچھا چلو اب چل کر سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے کل دیے بھی جمعہ ہے“۔ بات سمیٹنے اور ان دونوں کو سونے کی تلقین کرتے ہوئے طائلہ خاتون خود بھی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

”آئی! یہ آپ ہر بات کا اچھا پہلو ہی کیوں کھوجتی ہیں.....؟“ بیڈ پر اس کے برابر لیٹتے ہوئے عدیل نے اس سے پوچھا تھا۔
”اور مشکلات کیا کم ہیں جو ہم ہر بات کا برا پہلو دیکھ کر تھوڑی دیر میں کھانا لگا رہی ہوں، جب تک بھائی بھی آجائیں گے آپ دونوں بھی منہ ہاتھ دھو کر فریش

جواب دیتے ہوئے اس نے لمب آف کیا تھا۔
اور پھر عدیل کے سو جانے کے بعد وہ چپکے سے اٹھ کر وضو کرنے کی نیت سے ہاتھ روم گئی تھی اور دو رکعت نفل پڑھ کر اس نے رورور کر اپنے ملک و قوم کی سلامتی کے لئے دعا مانگی تھی کہ چاہے یہ ملک جیسا بھی تھا اس کا اپنا تھا اسے اس ملک سے محبت تھی۔

☆.....☆.....☆
”عدیل! والیم تو کم کروٹی وی کی آواز پورے گھر میں گونج رہی ہے“۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتی زمامہ نے عدیل کو تنبیہ کی۔
”افوہ! آپ! 14 اگست آنے والی ہے تو یہ بلی نغے سننے کو مل رہے ہیں ورنہ اب تو پاکستان کے بھی ہر جھیل پر مٹی اور شیلہ اچھلتی کودتی نظر آتی ہیں“۔ وہ لم تھوڑا اور بڑھا دیا گیا۔

”اف اللہ پوچھے تمہیں عدیل! دیکھو دروازے پر شاید امی ابو ہیں جا کر کھول دو دروازہ“۔ زمامہ نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر آواز دہرائی۔
”اف اللہ کی پناہ آج تو تھکا مارا ایک گرمی نے دوسرا مہنگائی نے ہر چیز کی قیمت آسمان کو چھو رہی ہے بیجاری غریب عوام کو تو اللہ ہی حافظ ہے“۔ طائلہ خاتون آج اشیاء کی خریداری کے سلسلے میں دایم صاحب کے ساتھ اتوار بازار گئی تھیں۔

”آج تو غضب کی گرمی تھی آپ نے آج جانا ہی نہیں تھا“۔ دونوں کو لیسن جوس دیتے ہوئے عدیل نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔
”بیٹا جی! اب جولائی میں تو گرمی ہوگی ہی آج کا دن ہو یا بعد کا اور پھر آج کل میں رمضان بھی شروع ہو جانے ہیں تو میں نے اور تمہاری امی نے سوچا آج ہی لے آئیں تمام چیزیں“۔

”ٹھیک کیا ابو! آپ نے میں ذرا یہ سارا سامان رکھ کر تھوڑی دیر میں کھانا لگا رہی ہوں، جب تک بھائی بھی آجائیں گے آپ دونوں بھی منہ ہاتھ دھو کر فریش

رداؤ انجسٹ [147] ستمبر 2012ء

ہو جائیں۔“ لاؤنج میں گھرا سارا سامان اٹھا کر زامہ کچن کی طرف چل دی تھی۔

”یہ میس کہاں گیا ہوا ہے ابھی اس کے رزم ٹھیک کہاں ہوئے ہیں اور پرے گری بھی آج غصہ کی ہے۔“ زامہ کے پیچھے پیچھے بھی طاہرہ خاتون بھی کچن میں داخل ہوئی تھیں۔

”آپ جا کر یاہر میس آرام سے بھائی کو ان کے کلي کے عی دوست لے گئے ہیں ہر سال کی طرح اس سال بھی شاید یہ لوگ 14 اگست کا فنکشن رکھیں گے۔“

”دیکھو! اس سال کیا کرتے ہیں یہ لوگ۔“ بڑبڑاتے ہوئے دوام صاحب کے پاس جا بیٹھی تھیں جو پوری طرح فی دی کی طرف متوجہ تھے جس پر مونگائی کے بارے میں عوام کی رائے لی جا رہی تھی۔

”میں صاحب دودھ پھل فرد تو غریب عوام پر حرام کر دی گئی ہے یہ لوگ اب دالوں پر سے بھی ان کی اجارہ داری چھیننا چاہتے ہیں صاحب آپ خود بڑے لکھے ہو آپ جانتے ہو کہ پوری دنیا میں رمضان کے لئے خصوصی رعایت ہوتی ہے یہاں تو ایک روپے کی چیز چار روپے کی کر دی جاتی ہے کھانے کے مرتے آج مرزا۔ کمرے پر بولنے والا شاید کچھ زیادہ ہی دکی تھا اسی لئے رو پڑا۔

”آپ پلیز اپنے جذبات پر قابو رکھیں مگر آپ کو نہیں لگتا حکومت کے ساتھ ساتھ یہاں عوام بھی بے حس ہے لوگ اگر صحیح طرح اپنی ذکوہ اور خیرات نکالیں تو غریب کوئی فرق ہوتا ہے نہ دوسری طرف لگایا۔

”میں صاحب! یہاں دشمنی روڑ پر تو پڑ چکے ہیں مگر کوئی اٹھا کر اسپتال لے کر نہیں جاتا کہ کہیں سارا کس منہ پر آتا جائے تو غریب کی مدد تو بہت دور کی بات ہے مجھے تو۔“

”نہیں یہ بات غلط ہے۔ ابھی وہ اسکرے شاید کچھ لکھ رہا تھا مگر پیچھے سے آنے والی آواز نے اسے روک دیا کوئی شخص جھگڑا تھا اور آگے بڑھا تھا۔

”میں آپ کی بات سے متفق نہیں ہوں ٹھیک ہے یہاں بہت سے لوگ بے حس ہیں ہماری حکومت کی طرح مگر سرپا نچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس سرزمین پر برے لوگ بھی رہتے ہیں مگر ہم ان کے ساتھ اچھوں کو بھی نہیں برا کہہ سکتے۔“

”میں آپ کی بات سے انگری کرتا ہوں۔“ لیڈر نے فوراً پیٹیر ابدالا۔

”بالکل سرور نہ سیلانی، تمہیں! ایڈمی ولفیئر کے ادارے نہیں ہوتے۔“

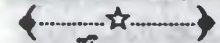
”آپ کی بات انہی جگہ مگر یہاں حکومت کے ساتھ ساتھ عوام بھی عوام کی دکن ہے کوئی بھی بحیثیت قوم نہیں سوچتا ہر کوئی صرف بحیثیت فرد سوچتا ہے پہلے اپنا مفاد پھر چاہے عوام و ملک کی جزیں کھو گئی ہو جائیں آپ دیکھیں ہمیں بھی احتجاج ہو رہا ہو عوام کو نقصان پہنچانے والی بھی عوام ہی ہوتی ہے روڈ ہلاک کر کے اور گاڑیاں جلا کر عوام کو ہی تو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اب تیسرے بندے نے بحث میں حصہ دیا تھا۔

”اف تو بے کیا ہے آپ ہر وقت یہ لڑائی جھگڑا دیکھتے رہتے ہیں۔“ طاہرہ خاتون ہنسنے لگی۔

”نہیں بات وہ بالکل ٹھیک کر رہا تھا حکومت تو اپنی جگہ مگر عوام بھی کچھ نہیں ہے اور اگر یہاں دیکھوں تو کیا آپ کی طرح مگر مگر جا کر ایک دوسرے کی برائی کیا کروں۔“ دوام صاحب نے اپنی مسکراہٹ روکی۔

”تو میں کب کسی کے مگر جا کر ایک دوسرے کی برائی کرتی ہوں۔“

”اب یہاں بھی ناک شوٹر در۔“ عندل بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی جانتی تھی کہ یہ شو جلدی ختم ہونے والا نہیں ہے۔



”پاکستان 2050 تک تقسیم ہو جائے گا اور میں نہیں کوئی ماہر تجزیہ کار کہہ رہا ہے۔“ طاہرہ نے انہما کی سرخی پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”اے چل ہٹ تو 2050 کی بات کرتا ہے بس تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے سرحد کو حکومت نے ہی جاہ کر دیا آپریشن کر کر کے بلوچستان کی اپنی الگ کہانیاں چل رہی ہیں پنجاب میں سرانگہ اور اللہ جانے کون کون سی تحریکیں چل رہی ہیں رہ گیا ہے چارہ سندھ تو بھائی یہ حکمران پورا اسے بھی رہے نہیں دیں گے تو بس ہو گیا ناں پاکستان الگ اس پر عمل بھی آہستہ آہستہ ہو رہا ہے نتیجہ 2025 تک آبی جائے گا دیکھ لیتا۔“

”کیا دیکھ لیتا۔“ نعمان کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی جب میس اور ارم چلے آئے۔

”ہاں تو کیا دیکھنے کی بات ہو رہی تھی۔“ نعمان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ارم نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑنا چاہا۔

”پاکستان کو تقسیم دیکھنے کی بات ہو رہی تھی۔“ بڑے سکون سے جواب دیا گیا۔

”کیا مطلب۔“ چوتھے والا میس تھا۔

”مطلب یہ کہ یہ قاب کہہ رہا تھا کہ کسی نے تجزیہ کیا ہے کہ پاکستان 2050ء میں نوٹے گا میں نے کہا بھائی کہاں انہی دور بھاگ رہا ہے پاکستان تو سمجھو نوٹ ہی کیا کیوں صحیح کہا ناں میں نے۔“ استہزیائے ہلکی بٹنے ہوئے کہا گیا۔

”جن لوگوں کا خواب ہے کہ وہ پاکستان کو ٹوٹا ہوا دیکھیں ان کی تسلیں ختم ہو جائیں گی، حکمران کا خواب انشاء اللہ پورا نہیں ہوگا۔“ میس نے پر یقین لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ارم اور قاب نے بھی انشاء اللہ کہا تھا۔

”ابے چل کن ہو شوں میں ہے صرف سرحدیں ایک ہونے سے ملک ایک نہیں ہوتا لوگوں کو ایک ہونا پڑتا ہے اور یہاں بلوچ اور پنجاب کی نہیں بنتی تو سندھی اور پنجتون ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں بات کرتا ہے ایک ملک کی ہونہ۔“ نعمان جذباتی ہوا۔

”ہاں کچھ لوگ ہیں۔“ کچھ لوگ ارے یہ پورا ملک ہی اب رہنے کے

قابل نہیں ہے مجھے کوئی دوسرے میں فوراً یہاں سے نکلوں رہنے کے لئے یہاں ہے ہی کیا اب بھوک اٹلاک یہ ملک اب صرف مرنے کے لئے رہ گیا ہے یا پھر بڑھاوے کے لئے جوانی یہاں پر لے تو سکتی ہے پل نہیں کتی۔“ نعمان زہر خند ہوا۔

”مگر پاکستان کو ہماری قبروں اور تابوتوں کی ضرورت نہیں ہے پاکستان کو ہماری جوانی اور وہ گرم خون چاہئے جو ہماری رگوں میں خواب اور آئینڈیزم بن کے دوڑتا ہے ہم پاکستان کو اپنی جوانی نہیں دے سکتے تو پاکستان کو اپنا بڑھاوہا بھی مت دینا جس ملک میں تم جینا نہیں وہاں مرنا بھی مت کہ پاکستان کی سرزمین کو ان کا وجود زب دیتا ہے جو اس سرزمین کے لئے مریں۔“ میس بولا۔

”اچھا چل چھوڑ ہم یہاں جھگڑا کرنے نہیں 14 اگست کے بارے میں بات کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔“ قاب نے معاملہ دفع کرنا چاہا۔

”14 اگست مناؤ گے تم لوگ جاؤ جا کر دیکھو ان لوگوں کے گمردوں میں کیا کہرام چاہو گا جن کے باپ اور بھائی بے وجہ مارے گئے صرف ہلے گا اور کھلی کھلی تقریروں سے حب الوطنی کا حق لوانا نہیں ہوتا کچھ کرنا ہے ناں تو سب کے لیے نہیں تو کچھ لوگوں کے ہی مسائل حل کرنے کا سبب بنو حق لدا ہو جائے گا 14 اگست کا۔“ غصے میں ارم کا ہاتھ جھک کر نعمان بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

”بات اس نے غصے میں کی ہے مگر صحیح کی۔“ میس نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔

”ہاں واقعی چلو سوچے ہیں کچھ اس بارے میں مگر یاد یہ کب نکلے گا اس غصے سے۔“ ارم نے تاسف سے اسے ہلایا۔

”جان سے پیارا بھائی کو کیا ہے اس نے کوئی معمولی بات نہیں۔“ قاب بھی افسردہ ہوا نعمان کا بھائی بچھلے سال ان کی جامع مسجد میں ہونے والے دھماکے

میں شہید ہوا تھا۔ اور اس واقعے کے بعد سے ہی نعمان اس ملک اور یہاں کے رہنے والوں سے خائف تھا۔
”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ.....“ ان دونوں کو بھی افسردہ دیکھ کر مصمیں نے بات چلی تھی اور اب وہ تینوں سر جوڑے ڈسکشن میں مصروف تھے۔

☆.....☆.....☆

”بھائی 14 اگست میں کتنے تھوڑے دن رہ گئے ہیں اور آپ لوگوں نے ناں تو گلی کو سجایا اور ناں ہی مجھے کسی فنکشن کے آثار لگتے ہیں تو پھر پچھلے سال سے بھی زیادہ پیسے کس خوشی میں لئے ہیں آپ کی چندہ کمیٹی نے“۔ مصمیں کے دوستوں کو عندل چندہ کمیٹی ہی کہتی تھی کہ ہر ایونٹ پر وہ لوگ چندہ جمع کرتے تھے۔
”بس اس دفعہ 14 اگست پر کچھ نہیں ہوگا اور پھر رمضان میں فنکشن کچھ مناسب نہیں لگتا“۔ مصمیں نے پلان بتاتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر پیسے کس خوشی میں لئے آپ کی کمیٹی نے.....؟“ عندل بکڑی کے اسے ہلے گلے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔

”تمہارے تو نہیں ہیں ناں تو چلو بھاگو یہاں سے“۔ اس کی مسلسل انکار پڑی پروہاں سے اسے بھاگایا۔
”زامہ.....“ کمرے کی طرف جاتی زامہ کو آواز دے کر اسے بلایا۔

”جی بھائی!“

”تمہاری پاکٹ مٹی بلکہ بچوں کی فیس جو تمہارے پاس آتی ہے اس میں سے تمہارے پاس کتنی رقم ہے.....؟“ بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو چاہئے کیا.....؟“ تعجب سے استفسار کیا کہ اس سے پہلے مصمیں نے اسے پیسے دیئے ضرور تھے مگر مطالبہ بھی نہیں کیا تھا۔

”ہاں اگر دل سے دو تومریہ بات یاد رکھنا کہ ان کا استعمال اچھی جگہ ہوگا اور پلیز یہ مت پوچھنا کہ کہاں ہوگا عید پر سب بتا چل جائے گا۔“

”مجھے آپ پر یقین ہے بھائی“۔ اور پھر اس نے اپنی ساری جمع پونجی جو امی نے اس کو اپنے خرچ کے لئے دیئے تھے مصمیں کو دے دیئے۔
”شکریہ“۔ اس کو جاتا ہوا دیکھ کر مصمیں مسکرا دیا اسے پتہ تھا کہ جب اسے ان پیسوں کے مصروف کا پتہ چلے گا تو بہت خوش ہوگی۔

☆.....☆.....☆

اور پھر گزرتے دنوں کے ساتھ رستوں اور برکتوں والا مہینہ اپنی تمام تر شان و شوکت سے اختتام پذیر ہوا تھا۔
”چاند مبارک ہو ابو!“ تمام مساجد میں چاند کا اعلان ہو چکا تھا اور سب ہی ایک دوسرے کو چاند کی مبارکباد دے رہے تھے۔

”آپ کو بھی مبارک ہو“۔ دائم صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی۔

”آپ! یہ آج گلی میں کچھ زیادہ ہی ہنگامہ نہیں لگ رہا۔“

”کیوں بھی چاند رات ہے تو ہنگامہ تو ہوگا ہی“۔ صبح کے لئے سب کے کپڑے استری کرتے ہوئے زامہ نے جواب دیا۔

”نہیں ناں آج بات کچھ اور لگتی ہے ابھی دو تین بڑک وہاں میدان کی طرف گئے ہیں“۔ عندل پر ہنسنے ہوئی۔

”چھوڑو بھی ہمیں کیا اور تم جا کر ذرا امی کا ہاتھ بناؤ پھر تمہارے بھندری لگا دیتی ہوں“۔ اور پھر تمام کاموں سے فارغ ہو کر عشاء پڑھنے کے بعد بے اختیار ہی زامہ نے سب کی عید کی خوشیوں کے لئے دعا مانگی تھی۔

لونا دے ہمیں وہ عید کی خوشیاں جو ہم سے روٹھ گئی ہیں

اسے میرے مولا تو ایسا مجرہ کر دکھا

میری سر زمین پر محبت کا وہ اہتمام کر دے

☆.....☆.....☆

”آپ سب کو عید مبارک“۔ نماز پڑھ کر آتے ہی

مصمیں نے سب کو شتر کہ مبارک باد دی۔
”بھائی خالی مبارکباد“۔ عندل ٹھٹکی۔

”نہیں ایک خوشخبری بھی ہے“۔ مصمیں شرارتی ہوا۔
”ناں بھئی پہلے عیدی بعد میں خوشخبری کہیں اب خالی اسی پر ناں شتر خادیں“۔ عندل کے کہنے پر سب ہی ہنس پڑے۔

”اچھا بھی تم پہلے عیدی لے لو“۔ مصمیں نے اس کی مطلوبہ رقم اس کے ہاتھ پر رکھی۔

”ہونہ.....“ یعنی آپ بھولے نہیں چلیں اب خوشخبری سنادیں“۔ نوٹ لگتے ہوئے شان بے نیازی سے کہا گیا۔

”محلے کے میدان میں میلہ لگا ہے وہ بھی بالکل فری“۔ اس نے دھماکے کیا کہاں ان کا چھوٹا سا محلہ کہاں میلہ۔

”کس نے لگوا یا ہے؟“ زامہ نے بھائی کو بخور دیکھا۔

”ہم نے یار! اور کس نے دراصل اس سال ہم نے جو 14 اگست کے لئے گھروں سے پیسے لئے تھے تو اس سے ہم نے محلے کے تمام غریب گھروں میں راشن ڈلوایا اور چونکہ اضافی رقم لی تھی اسی لئے اس فری میلے کا انتظام کیا تاکہ محلے کے تمام غریب بچے صحیح طرح انجوائے کر سکیں رقم جو بھی کم پڑی وہ ہم نے علاقے کے باغیچے سے درخواست جمع کروا کر لے لی اس سال ہم نے فنکشن اسی لئے نہیں کیا کہ فنکشن کا کیا ہے ایک دن کا ہلہ گلہ اور پھر شتر اب بہت ساروں کی نہیں تو کچھ تو اپنے ہم وطنوں اور محلے داروں کی مدد کر ہی دی ہم لوگوں نے“۔ مصمیں خوشی خوشی اپنا کارنامہ بتا رہا تھا۔

”بہت اچھا کیا بیٹا! تم لوگوں نے اپنے محلے داروں کے بارے میں سوچ کر پاکستان کو تمہاری اسی سوچ کی ضرورت ہے“۔ دائم صاحب نے ہر ابا۔

”جہیں پتا ہے زامہ تم سے جو اضافی رقم لی تھی اس طرح ارقم، نعمان اور ثاقب وغیرہ نے بھی رقم جمع کی تھی اس رقم سے ہم لوگوں نے محلے کے کچھ بہت ہی سفید

پوش گھروں میں رہنے والے بچوں کے عید کے کپڑے خریدے اور ان سب بچوں میں اس طرح بانٹنے کے کمر والوں اور بچوں کو شک نہیں ہوا ہوگا۔“

”واہ جی واہ گھر والوں کو کیسے پتہ نہیں چلا ہوگا۔“ عندل نے بیچ میں ٹانگ اڑائی۔

”اف دادی اماں وہی بتا رہا تھا ہم لوگوں نے ایک کوڑ رکھا اور پھر بچوں سے نہایت ہی آسان سوالات پوچھتے ہر جتنے والے بچے کو ایک گفٹ ملا جس میں ایک نیا سوٹ تھا اور زامہ مجھے نہایت ہی شرمندگی ہوئی جب میں نے شامیر سے پوچھا کہ ہمارا قومی کھیل کون سا ہے جانتی ہو اس نے کیا کہا.....؟“ وہ کچھ توقف کورکا۔

”کوئٹہ اسٹرائیک جو پہلے کئی پہاڑی پر کھیلا گیا پھر لیاری میں اور اگلے سال کہیں اور کھیلا جائے گا“۔ اس کے بتانے پر سب ہنس پڑے اور زامہ عندل کو گھور کر رہ گئی۔

”یہ ہنسنے کی بات ہے یہ سکھاتی ہو تم بچوں کو“۔ مصمیں نے ڈپٹا۔

”بھائی! یہ عندل ہی اوٹ پٹا ٹنگ بولتی رہتی ہے“۔ وہ ہنسنائی۔

”ناں عندل بیٹا! بچوں کو ہمیشہ اپنے ملک کے بارے میں اچھی بات بتانا چاہئے تاکہ وہ ملک کے بارے میں اچھا سوچیں اس کو ریزن اچھا دیں“۔ طائلہ خاتون نے تنبیہ کی۔

”جی بالکل“۔ مصمیں نے ماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”اچھا چھوڑیں پہلے میں کب تک چلیں گے“۔ عندل نے فوراً بات چلی۔

”شام میں ابھی دھوپ دیکھی ہے تم نے“۔ زامہ نے گیلری سے ہو کر آتی دھوپ کی طرف متوجہ کیا۔ اور پھر شام کو میلے میں ہنسنے لگھکھلاتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر اسے لگا تھا کہ شاید کل اس نے جو دعا مانگی تھی وہ پوری ہوئی تھی اور اس نے دل سے ایک اور دعا کی تھی کہ اس سال جو ان کی چندہ کمیٹی نے کیا تھا اگلے سال کوئی اور بھی کرے۔

☆.....☆.....☆

روزِ اربعہ 151 ستمبر 2012ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روزِ اربعہ 150 ستمبر 2012ء

میرا کدھر رہا

”اک بار آ جاؤ پلیز حنان اس سے پہلے کہ بندھن
ٹوٹ جائیں سانس چھوٹ جائے“ اک بار آ کے
مجھے معاف کر دو پلیز تمہارے بھاشب و روز یہ زندگی
اک دشت سی لگتی ہے میں کب تک سب سے چھاؤں



گی کہ تم میری وجہ سے اتنی دور ہو گئے ہو اور کتنی سزا سہوں
میں اب مجھ میں ہمت نہیں ہے اک بار آ جاؤ پلیز.....“
روتے روتے وریشہ نے حنان کی تصویر پر اپنے لب رکھ
دیئے اور پچھلے ایک سال سے اس کی یہی حالت تھی روز
کمرے کی تنہائی میں حنان کی تصویر سے باتیں کرنا اور
روتے روتے واوی تیند میں کھوجانا غلطی بھی تو اسی سے
سرزد ہوئی تھی جس کا کفارہ اسے ہجر کی صورت ادا کرنا
پڑ رہا تھا حنان نے تو پلٹ کر خبر تک نہ لی کس قدر
دلبرداشتہ اور خفا ہو کے گیا تھا وہ یہی احساس وریشہ کے
پچھتاوے کو بہت بڑھا دیتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”وریشہ! کدھر عتاب ہو یا ر! میں پورے گھر میں
تمہیں آوازیں دے رہا ہوں اور تم یہاں وارڈ روب
میں کپڑے نکالنے میں مگن ہو۔“ حنان نے اپنا بیگ اور
فائلز بیڈ پر اچھالتے ہوئے وریشہ کے قریب جا کے کہا جو
کافی دیر سے کپڑے سیلکٹ کرنے میں مصروف تھی۔
”کیا ہوا! آج آپ اتنی جلدی آگئے خیریت
تو ہے نا سب.....؟“ وریشہ نے حنان کی جانب پلٹتے
ہوئے مسکرا کر کہا تو حنان نے اسے اپنے بازوؤں
میں بھر لیا۔

”ہاں ہاں سب خیریت ہے جناب ہم تو بس آپ
کی ایک مسکراہٹ دیکھنے کے لئے جلدی آ جاتے ہیں
بس۔“ حنان نے شراوت کرتے ہوئے کہا تو وریشہ اس
کے حصار سے نکل کر بھاگ گئی جبکہ حنان کی ہنسی سے
پورا کمرہ مہک اٹھا۔

”ارے سنبھل کے بھابی کدھر بھاگی جا رہی ہیں
آپ کوئی بھوت تو نہیں دیکھ لیا۔“ تیزی سے کمرے
سے نکلتے ہوئے وریشہ اپنی انگوٹھی نذر فرح سے ٹکرائی تو
اس نے معنی خیزی سے اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے پوچھا۔
”ارے نہیں فرح! وہ بس بچن میں کچھ کام تھا
اس لئے۔“ وریشہ نے شرمندگی سے کہا تو فرح کی
ہنسی نکل گئی۔

”اف..... میری پیاری بھابی جان! صاف صاف
کہئے نا کہ آج بھابی جان جلدی آگئے ہیں اس لئے
آپ کو مارے خوشی کے کچھ سوچ نہیں رہا۔“ فرح نے
چھینرتے ہوئے کہا تو وریشہ اسے مارنے کے لئے اس
کے پیچھے بھاگی جبکہ فرح اسی کے کمرے میں جا گئی۔

☆.....☆.....☆

”وریشہ اک بات پوچھوں تم سے.....؟“ حنان
نے وریشہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
”جی پوچھیں نا.....؟“ وریشہ نے جواباً مسکراتے
ہوئے کہا۔

”نہیں مجھ پر کتنا بھروسہ ہے اگر میں تم سے کبھی
کہوں کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں ہو
تو تم کیا کہو گی.....؟“ حنان نے سنجیدگی سے کہا تو
وریشہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔

”حنان پلیز! اسناپ اٹ آج کے بعد مجھ سے
مذاق میں بھی ایسی کوئی بات مت کہئے گا مجھے آپ پر
اپنے آپ سے بھی زیادہ بھروسہ ہے مگر میں یہ بات
کبھی نہیں برداشت کر سکتی نہ بان سکتی ہوں کہ میرے
حنان کی زندگی میں میرے علاوہ کبھی کوئی لڑکی ہو سکتی
ہے آپ کی زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی
صرف میں ہوں اوکے۔“ وریشہ نے غصے میں کہا تو
حنان کی ہنسی نکل گئی۔

”اف..... تو بے ہے تم سے تو مذاق بھی نہیں کرنا
چاہئے میری جان! میں تو بس تمہارے منہ سے اٹھار سننا
چاہ رہا تھا اور تم اتنی سیریس ہو گئیں ذرا شکل دیکھو اس
وقت شیشے میں اپنی ایسا لگ رہا ہے جیسے حقیقت میں
میری زندگی میں کوئی لڑکی آگئی ہے۔“ حنان نے اس کی
آنکھوں کی نمی کو صاف کرتے ہوئے کہا تو وریشہ کے
رونے میں اور شدت آگئی اور وہ حنان کے سینے میں سر
چھپا کے بھوٹ کے رو دی۔

”حنان! آپ بہت برا کرتے ہیں ایسے مت
کہئے گا اب۔“ وریشہ نے روتے ہوئے کہا تو حنان نے

اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔
”نہیں جان حنان کبھی نہیں بس آج معاف کرو۔“ حنان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وریشہ بھی مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆

حنان نوید، نوید اقبال اور عائشہ نوید اقبال کا اکلوتا بیٹا تھا اس کے بعد اللہ نے انہیں فرح اور حراسے نوازہ تھا حنان نے ایم بی اے کے بعد اپنا فیملی بزنس سنبھال لیا تھا جس کے بعد نوید اقبال نے اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی فرید اقبال اور زرش فرید اقبال کی بیٹی وریشہ فرید اقبال سے حنان نوید کی شادی کر دی وریشہ فرید اور زرش کی اکلوتی اولاد تھی جسے انہوں نے منٹوں سے شادی کے پانچ سالوں بعد پایا تھا یہی وجہ تھی وہ بہت نازوں میں پلی بڑھی نہ صرف فرید بلکہ نوید اور عائشہ کو بھی وہ بے حد عزیز تھی ایک ہی گھر میں پلنے بڑھنے کے سبب بچپن سے ہی وریشہ اور حنان میں دشمنی ہم آہنگی تھی جو کب پیار کے رنگ میں بدل گئی پتہ ہی نہ چلا اور وہ رشتہ ازدواج میں بندھ گئے مگر ان کی پرسکون زندگی کے سکوت توڑنے والی ہستی زویا رخصت ان کے اس رشتے کی دھجیاں اڑا گئی جسے وریشہ اور حنان کا پیار بھی نہیں بچا پایا۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو..... جی کون؟“ کافی دیر سے متواتر بجاتے حنان کے موبائل فون کو اٹھاتے ہوئے وریشہ نے کہا مگر دوسری جانب چھائی خاموشی سے وریشہ کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔

”جب بات کرنی نہیں ہے تو کال کیوں کی ہے حد ہے بہت فاتو وقت ہے آج کل لوگوں کے پاس۔“ مسئل چھائی خاموشی سے تنگ آ کر وریشہ نے جھنجھلا کر کہا تو دوسری جانب کاسکوت ٹوٹا۔

”مجھے حنان سے بات کرنی ہے زویا بول رہی ہوں۔“ دوسری جانب سے آواز آئی تو نسواری آواز

سننے ہی وریشہ کو یکدم غصہ آ گیا اور اس نے کال کاٹ دی مگر موبائل تھوڑی دیر بعد پھر بجنے لگا اور اسکرین پر جگمگاتے اسی نمبر کو دیکھ کر وریشہ کا دماغ آڈٹ ہو گیا اس نے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

☆.....☆.....☆

”یہ زویا کون ہے؟“ اگلے دن وریشہ نے حنان سے پوچھا جو اس وقت کمپیوٹر میں کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھا وریشہ کے لہجے میں چھپے شک کو حنان نے بہت اذیت سے محسوس کیا۔
”آفس کو لیک ہے میری اور کون ہوگی اور یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے پہلے تو آج تک تم نے اس طرح بات نہیں کی۔“ حنان نے کمپیوٹر آف کرتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

”تو اور کس طرح سے بات کروں آج سے پہلے گھر میں اس طرح آپ کو لڑکیوں کے فون بھی تو نہیں آئے اور آفس کو لیک ہے رات میں فون کرنے کی اجازت اسے کس نے دی وہ بھی آپ کے برسل نمبر پر بولیں۔“ وریشہ نے حنان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

”کب کی کال اور اگر کب بھی لی تو کیا گناہ ہو گیا ہمارے آفس کی بہت قابل وکر ہے وہ کوئی کام ہوگا اسے تم بلاوجہ بات کو مت بڑھاؤ وریشہ حد ہے غلط رویے کی بھی پتا نہیں کیا کیا التیاسید حاسو جتی رہتی ہو۔“ اب کے حنان نے غصے میں کہا تو وریشہ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی جس کو نظر انداز کرتے ہوئے حنان کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

”کہا بات ہے بیٹا! کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو کوئی پرابلم ہے؟“ کافی پریشان لگ رہے ہو۔۔۔۔۔“
نوید اقبال نے کھانا کھاتے ہوئے حنان سے پوچھا جو غائب دماغی سے پلیٹ میں جمع ہلا رہا تھا۔
”نہیں پاپا! کچھ نہیں بس ایسے ہی بھوک نہیں

ہے۔“ حنان نے جواب دیتے ہوئے وریشہ کو دیکھا جو اطمینان سے کھانے کے ساتھ انصاف کرنے میں مصروف تھی جبکہ اس کے دل میں اک طوفان بپا تھا۔
”اچھا شکر ہے ورنہ میں سمجھا آفس کی کوئی پرابلم ہوگی ارے ہاں آفس سے یاد آیا وہ اپنے رخصت صاحب کی بیٹی کیا نام ہے اس کا ہاں زویا اس نے آفس جو اسن کر لیا نا۔۔۔۔۔؟“ نوید صاحب نے زویا کے متعلق پوچھا جو ان کے نہایت قریبی دوست رخصت صاحب کی بیٹی تھی۔ کچھ فائنشل پرابلمز کی بنیاد پر اسے جاب کی ضرورت پڑی تو نوید اقبال نے حنان سے کہہ کر اسے رکھ لیا تھا۔

”جی پاپا! کر لیا ہے جو اسن اس نے بہت ہی ہارڈ ورکنگ ہے وہ اور کام بھی جلدی سمجھ گئی ہے وہ سب۔“ حنان نے مسکراتے ہوئے کہا تو زویا کے ذکر پر وریشہ اٹھ کر چلی گئی حنان نے اس کی اس حرکت کو بہت سنجیدگی سے نوٹ کیا اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

”وریشہ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ حنان نے وریشہ کو بلا تے ہوئے کہا جو سونے کی تیاری کرنے میں مصروف تھی۔

”جی کیا کام ہے بولیں۔۔۔۔۔؟“ وریشہ نے پوچھا۔
”کوئی کام نہیں ہے ادھر بیٹھو بس ذرا۔“ حنان نے وریشہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پیلو میں بٹھالیا۔

”سنو! کیوں اتنی بدگمان ہو رہی ہو مجھ سے فقط اس لڑکی کی کال سے کیوں اتنی پریشان ہو گئی ہو مجھے پتا ہے تم مجھ سے بہت پیار کرتی ہو اور میری زندگی میں تمہیں کسی کا بھی اس طرح آنا برا لگا مگر جہاں پیار ہوتا ہے جان! وہاں اعتبار ہوتا ہے وہ لڑکی فقط اک ورکر ہی تو ہے اس نے اگر کسی کام سے رات میں فون کر لیا کل تو اس طرح کیوں بدگمان ہو گیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں بولو کیا تمہیں ایسا لگتا ہوں میں تمہیں اندازہ بھی ہے تمہارے اس رویے سے میری ذات کے مان کو فخر کو کس

قدر تمہیں پہنچی ہے کیوں کیا تم نے ایسا بولو۔۔۔۔۔؟“ حنان نے وریشہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے رسائی سے کہا تو وریشہ کی آنکھوں میں نمی در آئی اور وہ حنان کے سینے سے جا لگی۔

”بس اب رومت پلیز وریشہ! مجھے تکلف ہوتی ہے تمہارے آنسوؤں سے ڈر لگتا ہے مجھے کبھی کبھی تمہاری محبت سے جذباتیت ہے۔“ حنان نے وریشہ کو چھپ کر اتے ہوئے کہا تو اس کے رونے میں اور شدت آ گئی۔

”نہیں حنان پلیز! مجھے معاف کر دیں میں نہ جانے کیوں ایسا کر دیتی ہوں پلیز آئی لو یو سوچ آپ کو پتا ہے نا میں بچپن سے ہی آپ کے معاملے میں کس قدر پوزیشن ہوں۔“ وریشہ نے کہا تو حنان نے اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی اور اسے اپنی آنکھوں میں بھر لیا دونوں کے من ایک دم پرسکون ہو گئے تھے اور محبت ابر بن کر ان پر برس رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”بھائی! یہ ڈریس دیکھیں ذرا اچھا لگ رہا ہے ناں لے لوں میں۔۔۔۔۔؟“ فرح نے وریشہ سے پوچھا جو اس کے ساتھ کافی دیر سے شاپنگ کرنے میں مگن تھی۔

”ہاں لے لو شکر ہے اتنی دیر بعد کچھ تو پسند آیا تمہیں ورنہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی خوار کروانے کا ارادہ تھا تمہارا۔“ وریشہ نے شرارت سے کہا تو فرح مسکرا دی وریشہ نے کاؤنٹر پر بے منٹ کی اور دونوں بیگز اٹھاتے ہوئے باہر نکل آئیں مگر شاپنگ سینٹر سے نکلے ہی نیچے کیفے ٹیریا میں بیٹھے حنان پر وریشہ کی نظر پڑی اور اس کے ساتھ بیٹھی زویا رخصت کو دیکھ کر وریشہ کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اسے ابھی طرح یاد تھا جب صبح اس نے حنان سے شاپنگ پر جانے کے لئے گھر جلدی آنے کا کہا تھا تو اس نے میٹنگ کا کہہ کر منع کر دیا تھا مگر اب اسے اس طرح زویا کے ساتھ دیکھ کر اسے حقیقتاً بہت دکھ ہوا تھا

اسے افسوس ہو رہا تھا کہ آخر کیوں اس کی نظریں ان پر پڑ گئیں؟ کاش اس نے نہ دیکھا ہوتا اس کی زرد پڑنی رنگت دیکھ کر فرح اس کی جانب بڑھی۔

”کیا ہوا بھائی! آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟“
فرح نے اس سے شاپنگ بیگ لیتے ہوئے کہا تو وریشہ نے خود کو سنبھالا۔

”ہاں نہیں کچھ نہیں چلو بس وہ گرمی بھی تو بہت ہے آج کل اس لئے ذرا چکر سے آ رہے ہیں۔“ وریشہ نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپاتے ہوئے کہا اور کار میں بیٹھ گئی مگر اس کا دل ابھی بھی حنان میں الجھا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆
شاپنگ سے لوٹنے کے بعد بھی وہ مستقل حنان کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ آخر اس نے جھوٹ کیوں کہا، مگر اس نے حنان پر کچھ بھی ظاہر نہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، کہیں پھر اس وجہ سے لڑائی نہ ہو جائے مگر اس کا دل اس بات کو نظر انداز کرنے پر بھی تیار نہ تھا وہ اپنی سوچوں میں ہی گم تھی کہ حنان نے اسے کیا۔

”وریشہ! کہاں گم ہو یا! میں کب سے آفس سے آیا ہوا ہوں اور تمہیں فرصت ہی نہیں کہ ہم غریبوں کو بھی وقت دو۔“ حنان نے شرارت سے شکوہ کرتے ہوئے کہا، تو وریشہ نے جاچتی نظروں سے حنان کی طرف دیکھا جو مسکراتا ہوا اسی کو دیکھ رہا تھا وریشہ نے بھی سب چھپاتے ہوئے خود کو نارمل ٹھیک۔

”نہیں وہ بس ذرا تھکن ہو گئی تھی شاپنگ میں آج بس اس لئے نیچے نہیں آئی آپ فریش ہو جائیں پھر کھانے کے لئے چلتے ہیں نیچے۔“ وریشہ نے کہا۔

”نہیں کھانا نہیں کھاؤں گا میں آج میٹنگ کے بعد میں نے ڈنر کر لیا تھا باہری بس چائے پلا دو اچھی سی۔“ حنان نے اس کا گال چھپھپھاتے ہوئے کہا۔

”او کے بنا دیتی ہوں آپ فریش ہو جائیں جا کے۔“ وریشہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو حنان فریش ہونے چلا گیا جبکہ وریشہ کا دماغ ڈنر میں ہی الجھ کے رہ

گیا، پہلے زویا کے ساتھ کافی اور اب یہ ڈنر اس کا دل اس بات کو تسلیم ہی نہیں کر پا رہا تھا اسے ایک عجیب سے طلال و تاسف نے آ گھیرا اور وہ جن کی جانب چل دی۔

☆.....☆.....☆
”واؤ بھائی! بہت پیاری لگ رہی ہیں آپ ماشاء اللہ سے آپ پر پنک کٹر بہت سوٹ کرتا ہے۔“ وریشہ کی چھوٹی ننہر حنان نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔
”تھنکس چھوٹی تم بھی بہت پیاری لگ رہی ہو ماشاء اللہ سے۔“ وریشہ نے پیار سے حنان کے گال چھپھپھاتے ہوئے کہا۔

”اف..... اگر آپ دونوں کی تعریفوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہو تو ہم نیچے چلیں سب انتظار کر رہے ہیں جانے کے لئے۔“ فرح نے انہی دیتے ہوئے کہا تو دونوں مسکرا دیں اور نیچے کی جانب چل پڑیں واصل آج نوید صاحب کے ایک قریبی دوست کے بیٹے کی شادی تھی جس میں پورے گھر کی شرکت لازمی تھی سو سب ہی جانے کے لئے تیار تھے ماسوائے حنان کے جو ابھی تک آفس سے گھر ہی نہیں آیا تھا، جبکہ وریشہ کب سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”ارے وریشہ بیٹا! حنان کیوں نہیں آیا اب تک اسے جانا نہیں تھا تو صبح ہی منع کر دیتا کچھ بتایا اس نے تمہیں.....؟“ نوید صاحب نے وریشہ سے پوچھا۔

”نہیں بابا صبح تک تو انہوں نے جانے کا کہا تھا مگر یہ نہیں بتایا کہ کب تک آئیں گے کوئی رپورٹنگ کام آ گیا ہو گا ورنہ بتا دیتے۔“ وریشہ نے جوابا کہا۔

”اچھا چھوڑو آئے گا تو آ جائے گا اس کو تو کام کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تم لوگ چلو ساتھ۔“ نوید صاحب نے غصے سے کہا اور حقیقت وہ خود حنان کی اس ہر وقت کام والی عادت سے خائف رہتے تھے اور انہیں

شادی میں بھی وریشہ کا اس طرح اکیلے جانا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر جانا بھی ضروری تھا سو انہوں نے اس وقت حنان کا انتظار ضروری نہ سمجھا اور چل پڑے

جبکہ وریشہ کا موڈ بھی سخت آف تھا، وہ کب سے حنان کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی مگر وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا نجانے کیا مسئلہ ہو اس کا دل بیٹھے جا رہا تھا۔

شادی میں سب ہی حنان کا پوچھ رہے تھے مگر سب نے آفس ورک کا ہول کر لوگوں کو ٹال دیا مگر وریشہ کا دھیان کہیں نہیں لگ رہا تھا اسے حنان کی ہی فکر ستائے جا رہی تھی ابھی ان کی شادی کو چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے اور اس طرح اکیلے اسے واقعی بہت غصہ آ رہا تھا، حنان فرح عائشہ کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو اکیلا محسوس کر رہی تھی اسے اپنے ماما یا با اس وقت بہت یاد آ رہے تھے جو اس کی شادی کے بعد عمرے پر چلے گئے تھے ایک بار اور وریشہ نے حنان کا نمبر ڈائل کیا اب کے کال پہلی ہی ڈائل پر رسیو کر لی گئی تھی۔

”ہیلو حنان! کہاں ہو تم ٹھیک تو ہونا سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں بولو نا۔“ وریشہ نے بے تابگی سے سانس لئے بناء سب سوال کر ڈالے۔

”ہیلویم! وہ مریزی ہیں وہ باہر گئے ہیں ذرا۔“ دوسری جانب سے آئی زویا کی آواز نے وریشہ کے حواس سن کر ڈالے زویا نے کیا کہا اسے کچھ سمجھ نہیں آیا اسے تو بس یہ پتا تھا کہ اس وقت وہ اس کے ساتھ نہیں

زویا کے ساتھ ہے وریشہ نے موبائل بند کر دیا اسے رونا آ رہا تھا مگر اسنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ اس وقت رو بھی نہیں سکتی تھی وہاں سے وہ کیسے گھر آئی کس سے بات ہوئی اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، گھر آ کر اس نے خود کو کمرے میں قید کر لیا اور پھوٹ

پھوٹ کر رو دی اندر روش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی اس کا مطلب حنان گھر آ چکا تھا اس کے رونے میں اور شدت آ گئی۔

”وریشہ! کیا ہوا رو کیوں رہی ہو تم اٹھو چلو۔“ حنان جب فریش ہو کر باہر آیا تو وریشہ کو نیچے بیٹھے بری طرح روتے دیکھ گھبرا گیا اسے اندازہ تو تھا کہ وریشہ ناراض ہو گئی مگر اتنا یہ اس نے نہ سوچا تھا وہ وریشہ کو اٹھا

رہا تھا مگر وریشہ نے بری طرح اس کے ہاتھ جھک دیئے اور جھج گئی۔
”او جسٹ اسٹاپ اٹ اور کتنا ڈرامہ کرنا باقی ہے تمہارا ہاں بولو مجھے اک بار بتانے کا کام نہیں ہر وقت کام کام اور مجھے انتظار کرا کے خود کتنے آرام سے اس زویا کے ساتھ حرا کر رہے تھے بس بہت ہو گیا حنان! بند کرو مجھے بے وقوف بنانا اس دن اس کے ساتھ کافی اور ڈنر اور آج یہ سب اب کچھ میں آیا کیوں تمہارا دل آج کل آفس میں اتنا لگ رہا ہے پہلے تو تم ایسے نہیں تھے مگر جب سے زویا آئی ہے جب دیکھو آفس آفس کام بھی اس کے ساتھ کافی بھی اس کے ساتھ کھانا بھی اس کے ساتھ اتنی پسند ہے وہ تو اسے گھر کیوں نہیں لے آتے۔“ اس سے پہلے کہ وریشہ کچھ اور بولتی تریخ کر کے آواز آئی اور وریشہ اپنا گال سنبھلاتی رہ گئی۔

”بس ایک لفظ اور نہیں“ افسوس کہ تم مجھے کبھی سمجھ ہی نہیں پائیں اور اپنی یہ گھٹیا سوچ اپنے پاس سنبھال کر رکھو بہت ہی دکھ ہوتا ہے مجھے تمہاری ذہنیت پر اور اپنے انتخاب پر آج آئندہ مجھ سے کبھی بات مت کرنا چلا جاؤں گا نہیں یہاں سے کل اور تمہاری زندگی سے بھی وریشہ کہا تھا ناں اعتبار رکھنا، مگر تم نے میرا مان سب ختم کر دیا اپنا خیال رکھنا۔“ حنان نے غصے سے کہا اور روم سے باہر نکل گیا، جبکہ وریشہ شاک کی سی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی اسے تو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ حنان نے اس پر ہاتھ اٹھایا اور اس کے الفاظ کیا کہہ گیا تھا وہ وریشہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

☆.....☆.....☆
حنان چلا گیا آخر کیوں یہ وہ سوال تھا جو سب گھر والوں کے دل و دماغ پر حاوی تھا اور وریشہ وہ تو ابھی تک شاک کی سی کیفیت میں تھی اس نے اپنا بزنس چھوڑ کے لیپا میں جاب کر لی تھی نوید صاحب کو اس نے کیا کہا عائشہ کو کیا کہا وریشہ کو کچھ نہیں معلوم تھا، خیر تھی تو صرف اتنی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا آخر صفائی تو دیتا

انتا کزور تھا کیا ان کا رشتہ وریشہ کو شدت سے احساس ہو رہا تھا، مگر جانے والا جا چکا تھا اور کسی کے جانے سے زندگی تو رک جاتی ہے، مگر وقت نہیں رکتا، کبھی حنان کے جانے کے ایک ہفتے بعد زویا اس سے ملنے آئی تھی اور اس نے ملنے کے بعد جو انکشاف کئے تھے وہ وریشہ کے لئے شاک سے کم نہ تھے۔

”کیوں کیا آپ نے ایسا وریشہ بھائی! آخر ایسا سوچ بھی کیسے لیا آپ نے حنان بھائی کے بارے میں آپ تو انہیں بچپن سے جانتی ہیں پھر بھی نہ صرف کزن بلکہ آپ تو ان کی شریک حیات بھی ہیں وریشہ بھائی اک بار تو سوچ لیا ہوتا اور ہی بات ان کے میرے ساتھ ہونے کی تو میرے بابا کو اس وقت ہارٹ ایک ہو گیا تھا اور میں آفس میں تھی اس لئے وہ میرے ساتھ چلے گئے تھے وہ ہی اسپتال میں تھے میرے ساتھ ان کا موبائل میرے پاس رہ گیا تھا جب وہ باہر دوایاں لینے گئے تھے اس لئے میں نے آپ کی کال ریسیو کی تھی اور رہی بات اس دن کافی شاپ کی تو آپ کو پتا ہی ہو گا حنان بھائی اور نوید اکل میری فیملی کے کافی قریب ہیں اور میں ایک لڑکے جنید کو پسند کرتی ہوں اسی سے ملوانا تھا حنان بھائی کو تا کہ وہ بابا سے بات کریں انہوں نے ہمیشہ مجھے سنی بہنوں سے بڑھ کر چاہا مگر انہوں نے آپ پر جو ایک فرشتہ مفت شوہر پر شک کیا آپ نے، صرف آپ کی وجہ سے وہ سب سے دور ہو گئے آپ کو تو اللہ بھی معاف نہیں کرے گا یاد رکھئے گا۔“ زویا نے روتے ہوئے کہا تو وریشہ کے دل پر منوں بوجھ آن پڑا شک کی پٹی آنکھوں سے کیا تھی اسے اپنے لئے کانٹیں تھیں دامن ہونے کا سب کچھ کھودینے کا احساس شدت سے ہوا مگر جانے والا تو اس قدر خفا ہو کر گیا تھا کہ پلٹ کے خبر تک نہ لی اور اب روٹھے ہوئے جن کو وریشہ نے منانا تھا سب سے پہلے وریشہ نے زویا سے معافی مانگی، جس نے اسے معاف بھی کر دیا اور اس کی مدد کا وعدہ بھی کیا۔

دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

آج رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر اس نے شدت سے حنان کی واپسی و خیریت کی دعا مانگی تھی آج اسے گئے پورے گیارہ مہینے ہو گئے تھے وریشہ نے بہت کوشش کی اسے منانے کی مگر اس نے بات نہیں کی، وریشہ روز اسے ای میل کرتی تھی کال کرتی مگر حنان نہ اس کی ای میل کے جواب دیتا نہ اس کی کال اٹھاتا مگر والوں پر حنان اور وریشہ نے کچھ بھی ظاہر نہیں کیا تھا وہ روز اس کا پُرکھر میں سب سے بات کرتا تھا اس کی خیریت وریشہ تک پہنچ جاتی تھی مگر دشمن جان اس کی سرانجام کرنے پر آمادہ نہیں تھا وریشہ نے شدت سے اس کے واپس آنے کی دعا مانگی تھی شادی کے بعد یہ اس کی دوسری عید آنے والی تھی پہلی عید تو وہ اس کے بیکاز رہی چکی تھی مگر اب اس میں ہمت نہیں تھی حنان کے بنا چھینے کی۔

☆.....☆.....☆

”بہت برے ہیں آپ اور تو بہت برا حال ہے لوگوں کا“ بس کر دیں اب ستانا بات کبھی لیں ان سے حنان بھائی۔“ زویا نے حنان سے بات کرتے ہوئے شکوہ کیا تو حنان کی ہنسی نکل گئی۔

”بس تمہیں بھائی ہی مظلوم نظر آتی ہیں زویا کی بچی بھائی کا کچھ خیال نہیں تمہیں ارے ایسے کیسے مخاف کردوں ابھی تو ایک سال ہی ہوا ہے۔“ حنان نے شوخی سے کہا۔

”بہت بری بات ہے حنان بھائی! بہت شرمندہ ہیں وہ یہ ایک سال ان کے لئے ایک صدی سے کم نہیں اور آپ کو یہاں فکر ہی نہیں آجائیں ناں پلیز۔“ زویا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بس کر دو بھائی کی طرف داری ان کے علاوہ کوئی بات کرنی ہے تو کرو ورنہ میں فون رکھ رہا ہوں۔“ حنان نے جواباً کہا تو زویا کو بھی غصہ آ گیا۔

”اوکے نہیں سننا تو نہ سنیں میں بھی بات نہیں کر رہی

اب اللہ حافظ۔“ زویا نے فون رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

”نہ میں نے چاند دیکھا نہ کوئی تہنیت کا پھول کھڑکی سے اٹھایا میرا بس اب بھی ملگیا ہے حنا سے ہاتھ خالی چوڑی سے کلائی نہ میرے پاس تھے تم نہ میرے شہر سے گزرے تم میں کیا افشاں لگائی مانگ میں سندور بھرتی رنگ اور خوشبو پہنتی چاند کی جانب نظر کرتی کہ میری لذت دیدار تو تم ہو کہ میرا تہوار تو تم ہو“

”اب دیکھ لو ناں تمہارا چاند تمہاری لذت دیدار تمہارے پاس بہت پاس ہے۔“ مانوس سی آواز اور مخصوص کلون کی مہک اور ادا ہوئے پہلے نے وریشہ کے ڈائری پر چلتے ہوئے ہاتھ روک دیئے وریشہ نے فوراً پلٹ کر دیکھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو اور آج کل اس کے ساتھ وہ بھی یہی رہا تھا ہر جگہ یہی آؤنڈریں چہرہ اسے نظر آتا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو یقین نہیں تو پاس آ کے یقین کر لو میں پہلے بھی تمہارا تھا اب بھی تمہارا ہی ہوں اور ہمیشہ تمہارا ہی رہوں گا بھئی۔“ حنان نے مسکراتے ہوئے کہا تو وریشہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے سینے سے جا لگی۔

”حنان پلیز! مجھے معاف کر دیں میں بہت بری ہوں ناں میں نے بہت برا کیا آپ کے ساتھ آئی پراس آئندہ بھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی ناں پلیز ایک بار کہہ دیں آپ نے مجھے معاف کر دیا۔“

زویا نے اس کی ہاتھوں میں روتے ہوئے کہا تو حنان نے اسے خود سے الگ کر کے اس کے آنسو صاف کئے۔

”پگلی ہو تم واقعی ارے میں اب ناراض نہیں نہ کسی ہوں گا جب ہی تو تمہارے پاس آیا ہوں مگر ایک شرط ہے۔“ حنان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ وریشہ نے فوراً کہا۔

”اعتبار شرط ہے وریشہ! بس یقین رکھنا میرا کیونکہ اگر اب یہ ٹوٹا تو.....“ وریشہ نے حنان کی بات ختم ہونے سے قبل ہی اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”بھی نہیں..... کبھی نہیں ٹوٹے گا I love you so much“ وریشہ نے کہا تو حنان نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے جنا کر ہر محبت ثبت کی تو وریشہ شرمائی۔

”اب تو دیکھ لیا ناں چاند عید مبارک جان۔“ حنان نے محبت سے کہا۔

”خیر مبارک اور ایسے نہیں چلیں مجھے شاپنگ کرائیں اور مہندی لگوائیں ابھی فوراً آپ کی وجہ سے میں نے کچھ نہیں کیا اور میری عیدی وہ بھی دیں پچھلی دفعہ بھی نہیں دی گئی۔“ وریشہ نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تو حنان کی ہنسی نکل گئی۔

”اچھا..... اچھا چلتے ہیں ابھی پہلے عید تو ملو۔“ حنان نے اس کی لٹ سے بھٹکتے ہوئے کہا تو وریشہ مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

”بہت ہی ناں وہ ہیں آپ! جلس جلدی انہیں فوراً۔“ وریشہ نے کہا۔

”وہ..... کیا ہوں بھلا.....؟“ حنان نے شوخی سے کہا اور کھینچ کر وریشہ کو اپنے اوپر گرا لیا جبکہ وریشہ نے بھی اس کے سینے میں سر چھادیا آخر اس کی عیدی عید سب کچھ حنان ہی تو تھا محبت کی دیوی دونوں کے ملن پر مسکرا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شازیہ مصطفیٰ عمران

قسط نمبر 15

سلسلے وار ناول

کبھی میری دلچسپی نہ تھی



”کیا بات ہے میرا بیٹا! کچھ پریشان ہے ادھر آؤ۔“ انہوں نے اسے اپنے قریب بلایا، اریشماء لب کھلتی ہوئی ان کے پاس ہی آکر بیٹھ گئی، روچیل سکندر نے اس کا سر اپنے شانے سے لگالیا۔ مسز روچیل بھی اندر آگئیں انہیں یہ ڈر ہو رہا تھا اریشماء ان سے انکار کرنے تو نہیں آئی ہے۔

”ہاں اب بولو کیا بات ہے؟“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اریشماء الفاظ ترتیب دے رہی تھی کہاں سے وہ بات شروع کرے؟ کس طرح ڈیڈی کو بولے۔

”اریشماء گڑیا! بولو کیا بات ہے؟“ انہوں نے اسے کچھ ٹیلیکس کیا۔

”ڈیڈی! میں آپ سے کچھ بولوں تو آپ میری اتنی بات تو نہیں گے۔“ وہ قدرے توقف کے بعد رک رک کر گویا ہوئی۔

”ہاں بولو کون سی ایسی بات ہے جو میری اتنی پُر اعتمادی بیٹی کو بولنے میں اتنی جھجک آ رہی ہے۔“ انہوں نے فریش سے لہجے میں اس کے ہاتھوں کو دبایا۔

”ڈیڈی! میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہ کوئی ایسی بات ہے جو میں نہیں مانوں گا، گڈیو تو آپ نے بہت اچھا سوچا آگے اسٹڈی کرنے کا اور یہ تو آپ اپنی شادی کے بعد بھی کر سکتی ہیں۔“ وہ خوش ہو کر گویا ہونے لگا۔

”نہیں ڈیڈی! میں شادی سے پہلے پوری کروں گی، کیونکہ بعد میں اسٹڈی کرنا مشکل ہوتا ہے۔“ وہ غصیدہ سے لہجے میں ان سے مخاطب تھی، روچیل سکندر بھی سمجھتے تھے وہ کیوں ایسا کر رہی ہے شادی سے بچنے کے لئے اس نے اسٹڈی کا ذکر نکالا ہے۔

”بیٹا! آپ کی شادی میں نے نیکسٹ ایئر رکھی ہے۔“

”ایسا آپ بالکل نہیں سوچے؟ میں نے آپ کی بات مانی ہے آپ میری اتنی توانا ہی سکتے ہیں۔“

”مجھے کامران سے اور شاہدہ سے بات کرنی پڑے گی۔“ وہ جیسے کہی سوچ میں پڑ گئے تھے اور وہ جانتے تھے اریشماء ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس کرنا چاہتی تھی وہ آفس میں لگ گئی تو اپنی پڑھائی بھی ادھوری چھوڑ دی تھی اور یہ کورس چار سال کا تھا اور اتنے سال بدکنارہ روچیل سکندر کو نگہ دو پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا۔

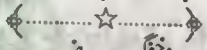
”ڈیڈی! کیوں ان سے بات کریں، ابھی سارے اختیارات آپ پر رکھے ہیں چاچو اور چاچی سے پوچھنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔“ وہ سن کے بھٹکا گئی، غصہ بھی آئے گا، اس کی زندگی کیا اس کی نہیں رہی سارے اختیارات چاچو چاچی کو کیوں حاصل ہونے لگے۔

”پھر بھی بات کرنی ہے کل آپ کی معافی ہے اور میں ابھی ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا کہ رشتے میں فرق آئے۔“ لہجہ ان کا درشت اور سخت ہو گیا۔ مسز روچیل پہلو بدل کر رہ گئیں، روچیل سکندر کی تنقیدی نگاہ ان پر بھی اٹھی تھی جانے کیوں انہیں ایسا لگ رہا تھا اریشماء کو اس نے والی وہی ہیں۔

”ڈیڈی! میں شادی سے انکار نہیں کروں گی مگر مجھے سننے کے لئے کچھ وقت دیں، ہو سکتا ہے میں کچھ عرصے میں سنبھل جاؤں اور آپ کو پھر اختیار ہے میری شادی فوراً کر دیجیے گا مجھے اعتراض نہیں ہوگا مگر پلیز میں آپ سے صرف یہی کہہ رہی ہوں مجھے پڑھنا ہے۔“ لہجہ اتنا بھیجا ہوا تھا وہ اس کی جانب دیکھ کر کمزور نہیں پڑنا چاہتے تھے ان کی وہ کل کائنات تھی اس پر تو وہ اپنی جان تک لٹا سکتے تھے مگر وہ اسے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنے دینا چاہتے تھے جو بلند

میں نقصان دہ ہو۔

اگر حمدان کا مستقبل بہتر نظر آتا تو وہ اس سے رشتہ کرنے میں عار نہیں سمجھتے، کیونکہ ان کی بیٹی آسانٹوں میں پروان چڑھی تھی وہ کیسے چھوٹے سے گھر میں رہ سکتی تھی وہ اسے اس کے شانہ مزاج جیسا ہی گھرانہ دینا چاہتے تھے جہاں اسے اپنی ضروریات کے لئے اپنا دل نہیں مارتا پڑے وہ باپ تھے وہ بھی اس کا برا نہیں سوچ رہے تھے۔



”آپ مجھے بھی نہیں بلائیں گی؟“ عدین نے خفگی اور ناراضی سے اس سے شکوہ کیا۔

حمدان کے کان عدین کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے وہ سمجھ گیا تھا اریشماء ہے ضرور اپنی معافی کا پتا رہی ہوگی جبکہ اس نے گھر میں ابھی تک بھی کسی کو نہیں بتایا تھا اور پھر وہ کس دل سے بتاتا، جب دل کی ہستی میں دیر لگی چھائی ہوئی تھی وہ کل کسی اور کی ہونے جا رہی تھی کیسے اریشماء اس کے آگے گڑ گڑائی تھی اور وہ دل پر پھر رکھ کر سرد مہری سے آگے

بڑھ گیا تھا اسے بھی اگر کوئی لڑکی پسند آتی تھی تو ایسی جس سے اس کا ملاپ ہی مشکل تھا۔

”دیکھئے اریشماء باجی! میں آپ کو اپنی سگی بہن ہی سمجھتا ہوں اور آپ اپنے سگے بھائی کو ایسے کیسے بھول سکتی ہیں۔“ وہ تیز لہجے میں غصہ کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے پھر مجھ سے بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ عدین نے موبائل آف کر دیا اس کا چہرہ تپا ہوا تھا۔

حمدان کو اندازہ تھا وہ اسے بھی نہیں بلارہی ہے جب ہی عدین کو اتنا غصہ آ گیا ہے۔

”آپ اپنی اکڑ میں رہے گا، وہ نہیں نہیں کیا کیا کر رہی ہیں۔“ حمدان اس کے سر پر ہونچ کے غصہ نکالنے لگا۔

”کیا جو اس کر رہے ہو۔“ وہ برہم ہوا چوتن ٹیکھے کر کے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کی بات خاک بھی پلے نہیں پڑی ہو۔

”بھائی! میں اریشماء باجی کی بات کر رہا ہوں وہ معافی کر رہی ہیں وہ بھی زبردستی کی آپ جانتے ہیں وہ آپ کو لائیک کرتی ہیں۔“

”عدین! اگر تمہاری یہ بکواس بند نہیں ہوئی تو میں رکھ کر چھاپ پڑاؤں گا۔“ اس نے وارننگ دی وہ تو شکر تھا اس وقت امی اور مصباح گھر پر نہیں تھیں وہ نیچے والوں کے گئی ہوئی تھیں کسی کی عیادت کو حمدان آفس سے جلدی آ گیا تھا اور عدین نوبت گھر میں گھسا تھا۔

”بھائی! آپ کو ذرا بھی ان پر رحم نہیں آ رہا۔“ عدین تو خود اندر ہوا تھا اریشماء جتنی دیر اس سے باتیں کرتی رہی روتی رہی تھی مگر آج اسے اپنے بھائی کی بے بسی پر بھی رونا آ رہا تھا۔

”میں جو بہتر سمجھتا ہوں وہ کرتا ہوں اور تم اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو کہ ایسی باتیں کر ڈالو اپنی پڑھائی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیا کرو سمجھے۔“ وہ ڈانٹ کے اندر چلا گیا۔

حمدان کا سر ڈکھنے لگا تھا وہ سوچ رہا تھا یہی چاہ ہی چھوڑ دے گا تا کہ اریشماء اسے بھول جائے وہ جتنا اس کے سامنے رہے گا اسے غصہ ہی رہے گا اور تیمور بھی کون سا یہ سب برداشت کرے گا۔

”حمدان احمد! تم اسے بھول جاؤ گے وہ تمہیں نظر نہیں آئے گی تم پھر کیا کرو گے؟“ اندر سے کوئی چیخ رہا تھا وہ گھبرا کے کھڑا ہو گیا، کھڑکی کے پردے ہٹا دیے باہر کے منظر پر نگاہ جمادی۔

وہ نازک کامنٹی کا کچ کی گڑیا اتنی پُر اعتمادی ساری لڑکیوں سے اس کی ادا لگ تھی اس کا دیکھنا بات کرنا ہنستا سب کتنا منفرد تھا وہ نا چاہتے ہوئے بھی اس سے نگاہ نہیں جدا کرتا تھا، کبھی سوچا ہی نہیں تھا یوں اچانک سے کوئی اتنا

اچھا بھی لگ سکتا ہے اسے سوچنا ہر وقت خیالوں میں رکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔

”اریشماء! میں بھی تمہیں شدتوں سے چاہنے لگا ہوں میرے دل پر بھی تو قیامت گزر رہی ہے یہ میں ہی جانتا ہوں۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے ہمکھاتا تھا۔

”اگر میرے جسم و جان کے مالک ہیں تو حمدان وہ آپ ہیں۔“ کانوں میں اریشماء کے الفاظ گونجنے لگے اس دن جب کال آئی کتنی کتنی اداس اور غمزدہ سی ہو رہی تھی اور وہ اسے ہرٹ کیے جا رہا تھا۔

”اریشماء! کیسے تم رہو گی بعد میں تیور سے تمہاری ایک لمحے کو نہیں بچتی ہے اور ساری زندگی کیسے گزرے گی۔“ اسے یہ بھی فکر اور پریشانی تھی تیور سے اس کی دودھ دلائی ہوئی رہتی تھی جبکہ حمدان بھی اریشماء کو کوئی دفعہ ہرٹ کر چکا تھا مگر وہ اس سے کبھی نہیں لڑی تھی بلکہ افسردہ ہی نظر آتی تھی۔

”اف..... تو یہ بڑی مشکل سے آنے دیا ہے۔“ امی کی آواز پر وہ چونکا تھا۔

”مصباح کھانا لگا لو عدین بھی آ گیا ہے۔“

”جی اچھا امی۔“ مصباح کچن میں چلی گئی تھی حمدان بھی روم سے نکل آیا تھا۔

”عدین عدین.....“ امی نے اسے آوازیں دی تھیں مگر وہ ایسے بنا ہوا تھا جیسے آواز ہی نہیں جا رہی ہو۔

حمدان نے امی کے روم میں جھانکا وہ میز پر تکیہ رکھے ہوئے لیٹا تھا۔

”عدین! تمہیں سنا بی نہیں دے رہا ہے امی کب سے آوازیں دے رہی ہیں۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے ہنوز لیٹے ہوئے جواب دیا۔

”یہ بچوں کی طرح حرکتیں کم کیا کر ڈیڑے ہو گئے ہواٹھو چل کے کھانا کھاؤ۔“ اس نے تکیہ میز پر سے ہٹا کے

سائیڈ پر رکھا۔

”جب کہہ دیا نہیں کھانا تو نہیں کھانا“ آپ کیا چاہتے ہیں ہر کوئی آپ کی مرضی سے ہر کام کرے۔“ وہ تو تنک کر رہ گیا۔ حمدان ہلکا سا اس کی بات پر رہ گیا وہ اس سے کتنی ترشی سے مخاطب ہو رہا تھا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو بچ ہے وہ کہہ رہا ہوں ابھی تو آپ کو سمجھ نہیں آ رہی ہے مگر بعد میں احساس ہو گا سب آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں اور آپ جواب میں کیا کرتے ہیں صرف دل توڑتے ہیں دل

دکھاتے ہیں۔“ اسے تو اریشماء کا خیال بار بار آ رہا تھا جس نے اپنے دل کی تمام باتیں اسے بتائی ہوئی تھیں اسے اریشماء اپنے بھائی کے لحاظ سے بہت پسندھی کتنا اپنائیت اور محبت و پیار سے بھرا ہوا اس کا انداز تھا مغروریت کا

شائبہ تک نہیں تھا۔

”ان فضول اور بے کار باتوں کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔“ چہرہ اس کا ساٹ تھا۔

”بھائی جواب آپ کے دل میں موجود ہے مگر زبان پر لاتے ہوئے ڈرتے ہیں آپ حقیقت سے کیوں نگاہ چرا رہے ہیں۔“ وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا آواز اس نے دھیمی دھیمی ہوئی تھی تاکہ امی اور مصباح تک نہیں پہنچ جائے۔

”حقیقت سے تم نے بھی نگاہ چرا لی ہوئی ہے دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا جب سے تمہاری اریشماء سے دوستی ہوئی ہے وہی تمہارے دماغ میں یہ سب بھر رہی ہے۔“ وہ اسے ڈانٹنے لگا۔

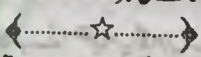
”وہ مجھے کچھ نہیں کہتی ہیں مجھے بھی اندازہ ہے۔“

”میں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کھانا کھانے آ جاؤ اور میں یہ نہیں چاہتا اریشماء کی وجہ سے ہمارے گھر کا

ماحول خراب ہو فوراً آؤ۔“ وہ حکم کیے لہجے میں اسے کہہ کر روم سے نکل گیا۔

عدین دانت چیس کے تکیہ پر کے برسانے لگا حمدان سے وہ نہیں جیت سکتا تھا اس کا اندازہ اسے اچھی طرح ہو گیا تھا اس کے دل و دماغ میں کیا تھا یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ مگر عدین کو ملال اور دکھ تھا اریشماء کی تنگنگی کی اور سے ہو رہی تھی وہ تو اسے اپنے بھائی کے حوالے سے دیکھنے لگا تھا مگر اریشماء کی حوصلہ افزائی کبھی نہیں کی اور نہ ہی امید بندھائی تھی۔

”بھائی! مجھے ایسے معجزہ کا انتظار ہے کسی طرح اریشماء باقی سے آپ کی شادی ہو جائے پھر میں تب آپ سے پوچھوں گا“ معجزے بھی تو اللہ ہی کرتا ہے اگر اریشماء باقی کے جذبے سے بچے ہیں تو وہ کہیں نہیں جاسکتی ہیں۔“ وہ آہیں کھینچ کر بالوں میں برش کرنے لگا، موڈ اس کا اب سیٹ ہو گیا تھا کھانا اگر نہیں کھائے گا تو حمدان پھر اس کی خبر لینے آ جائے گا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا امی اس معاملے کی خبر ہو۔



آج وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی، لیل ماہ کو شہر کا خوف رات دن سوار تھا ایک دن گزر گیا تھا اس نے تین دن کا ناٹم دیا تھا اس وجہ سے یونیورسٹی نہیں گئی تھی اگر پھر راستہ روک کے کھڑا ہو گیا تو اسے یہ تو نظر آ گیا تھا وہ ضرورت سے زیادہ بڑا اور بے باک انسان تھا اس سے ہر طرح کی حرکت کی امید تھی وہ کس حد تک جاسکتا ہے اسے اندازہ تھا اس نے اس کے باپ سے جو بیر باندھ لیا تھا اور اگر اس کے باپ کی اس محلے میں اس کی وجہ سے رسوائی ہو گئی تو پہلے ہی بے عزتی کی بجائے تھے حرام کو کس طرح ابو نے رخصت کیا تھا صفائی میں کچھ نہیں سنا تھا بے چاری حرام بے خبری میں ماری گئی تھی اور ان کا دیو شہر ان اب اس کے ارادے کتنے خطرناک تھے حرام کو بتانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ حرام کو دیکھ کر ہی پتہ چل گیا تھا اس نے اپنے بڑے پن کا رعب شہر ان پر رکھا ہوا ہے اگر اس نے لیل ماہ کی کوئی بات پوچھ بھی لی تو وہ تو ہنگامہ کرنے اس کے گھر تک آ سکتا ہے۔

”کیا کروں کس سے کہوں ابو کو ناروا بھائی کو خبر ہو گئی تو میں تو منہ دکھانے کی نہیں رہوں گی۔“ وہ اضطرابی کیفیت میں ناخن کترنے لگی تھی۔

”پھپھو! کتنی گندی ہیں ناخن کھا رہی ہیں۔“ دعاروم میں آئی تو اسے یوں سوچ میں متفرق دیکھا تو ٹوٹ کے بنا نہیں رہ سکی، لیل ماہ خفیف سی ہو گئی ہاتھ نیچے کر لیا۔

”پھپھو! لائے آئی بلارہی تھیں دادی جان نے کھلوادیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ اپنی کاپیاں اور کتا میں اٹھا کے جانے لگی۔

وہ سر ہلا کر رہ گئی تھی لائے اسے ایک سہارا نظر آئی اس سے تو اپنے دل کا پوچھ ہلکا کر سکتی ہے مگر اس کے گھر تک جانے کی اجازت نہیں تھی مشکل سے ہی امی مانتی تھیں اگر وہ لائے کو یہاں بلاتی ہے تو بھائی پورا وقت اس کے پاس بیٹھی رہتی ہیں، لیل ماہ کو بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

”کیا کروں کیسے جاؤں؟“ کاسی آج کل شانون پر برابر کیا امی کے پاس آ گئی۔

”لیل ماہ! وہ لائے بلارہی تھی جاؤ چلی جاؤ۔“ وہ حیران رہ گئی امی اور اسے خود کہہ رہی ہیں جاؤ چلی جاؤ یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔

”خیریت تو ہے؟“ حیرانگی ظاہر کی۔

”پتہ نہیں تم پوچھ آؤ دو تین دفعہ کھلو اچکی ہے تمہیں اور ہاں جلدی آ جانا کہیں تمہارے ابو نہ آ جائیں۔“ انہوں نے ساتھ ہی ہدایت بھی کی وہ سر ہلاتی ہوئی سر پر آج کل قرعے سے اوڈھ کے باہر نکل آئی پہلے اطراف میں نگاہ

دوڑائی شہران تو کہیں نہیں ہے، کہیں ڈرانے دھمکانے آجائے۔

”شکر ہے آئی تو“۔ لائبہ نیوشن پڑھاری تھی۔

بسمہ نے چونک کر لیل ماہ کو ضرور دیکھا، لیل ماہ کی بھی نگاہ اس پر اٹھ گئی وہ بڑی سی ہو گئی۔

”حتاے بولتی ہوں وہ بچوں کو دیکھ لے گی ہم دونوں ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں“۔ لائبہ بچوں کے سامنے گفتگو کرنے سے گریز کرتی تھی کیونکہ سارے بچے پھر گفتگو پر کان لگاتے تھے۔

”یونیورسٹی کیوں نہیں آئی تھیں؟“

”کیسے آئی اتنی بڑی ٹینشن میں ہوں“۔ لیل ماہ صوفے پر بیٹھی، شکر تھا آج اسے لائبہ سے بات کرنے کا موقع تو مل گیا تھا۔

”کیوں کیا ہوا خیریت، کیسی ٹینشن؟“ لائبہ نے استہمامہ نگاہوں سے دیکھا۔

لیل ماہ نے جواب میں اپنی ساری ٹینشن جو شہران سے متعلق تھی اس کے گوش گزار کر دی۔

”لیل ماہ! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“ وہ بھی سنائے میں آ گئی۔

”میری رات دن کا سکون تباہ ہو گیا ہے ہر وقت اس کے اظہار میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں“۔ لیل ماہ نے اپنے سر کو تھام لیا تھا۔

”خرباجی سے بول پاؤں بھائی سے“۔

”آئی سے بالکل بھی نہیں اور ڈیٹان بھائی ان سے بھی نہیں، تمہیں نہیں پتہ لائبہ اس پر تو جیسے ضد سوار ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے“۔ وہ روہانی ہو رہی تھی۔

”اگر اس نے زبردستی تیری انگلی میں انگوٹھی پہنا دی تو کیا پہن لے گی؟“

”منہ تو زردوں اگر میرا تو سچے پلے مگر لائبہ بہت وحشی ہے مجھے اس نے بہت دفعہ بے دردی سے پکڑا ہے“۔ وہ جب بھی بازو کی تکلیف سوچتی درد کا احساس ہونے لگتا، شہران بے حس تھا اسے کسی کی کوئی پروا نہیں تھی اس سے ہر بات کی توقع تھی۔

”پتہ ہے مجھے جیسی تو طرم خان بنتی ہے اندر سے اتنی ہی نکرد رہے“ مجھے تو شہران بھائی پر حیرانگی ہو رہی ہے وہ اور ایسی حرکت جبکہ وہ مجھ سے جب بھی ملتے ہیں بہتا کر کے بات کرتے ہیں وہ کسی اور لڑکی کی کیسے بے عزتی کر سکتے ہیں“۔ لائبہ کو یقین نہیں آ رہا تھا پھر جب بھی وہ شہران کے گھر گئی کبھی کوئی ایسی حرکت بھی نہیں دیکھی جس سے لگتا شہران اچھی سمجھ کا نہیں ہے۔

”تمہیں اتنا سب کچھ بتا دیا ہے پھر بھی یقین نہیں ہے“۔ لیل ماہ کو غصہ آیا۔

”میں ایسا کب کہہ رہی ہوں کہ تم بھی اب جھوٹ نہیں بول رہی ہو مجھے یقین ہے“۔ اس نے لیل ماہ کو غصہ اکیا۔

”میں کیا کروں سمجھ نہیں آ رہا ہے کہتا ہے شادی میری تم سے ہی ہوگی“۔

”کیوں تم لوگوں کے وہ پیچھے پڑ گئے ہیں میں ان سے بات کروں“۔

”بالکل ہو گئی ہو بالکل نہیں کرنا وہ نہ دوائے دماغ کا ہے اگر کچھ الٹی سیدھی بکواس کر دی تو میں تو پھر ماری جاؤں گی“۔ وہ گھبراہٹ سے شہران کے ہر قدم سے ڈر و خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”لڑکی ہونا بھی گناہ ہے“۔ وہ بڑبڑائی۔

”اور ہو بخوبی صورت تو اور زیادہ گناہ جیسے تم ہو سکتا ہے شہران بھائی کو تم سے جج میں پیار ہو گیا ہو“۔

”لائبہ! فضول ہاں کتنے کی ضرورت نہیں ہے یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں مزے سوچ رہے ہیں“۔ لیل ماہ کے تو چنگے لگ گئے وہ ایسی بات تو مذاق میں بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”سوری سوری“۔ لائبہ نے لب سمجھ لائے۔

”اچھا اچھا ہونیک کر دیکھو تو اس مسئلے کا حل سوچنا ہے میں تیرے لئے چائے کے ساتھ ٹیس لاتی ہوں“۔

”نہیں میں اب چلوں گی ابو آ جا میں گے“۔ لیل ماہ فوراً ہی کھڑی ہو گئی۔

”ابھی مغرب نہیں ہوئی ہے تاہم ہے انکل مغرب کے بعد کیا عشاء پڑھ کر آتے ہیں“۔ لائبہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں صوفے پر گرادیا۔

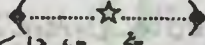
”نہیں لائبہ! وہ بھائی امی سے بار بار پوچھتی رہیں گی آپ کی شادی کے بعد سے تو میں بھی بہت محتاط ہو گئی ہوں کیونکہ وہ مجھ پر بہت نظر رکھنے لگیں ہیں“۔

”ہاں مجھے پتہ ہے تمہاری بھائی کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے“۔ لائبہ نے بات مذاق میں اڑا کر اسے فرسٹ کرنے کے لئے کہا۔

”تو بیٹھ میں دو منٹ میں آئی امی سے کہہ دوں گی چائے وہ بنا دیں گی“۔ وہ لیل ماہ کو سکرا کے دیکھتی ہوئی نکل گئی۔

لیل ماہ سائینڈ ٹیبل سے میگزین اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی جانے کی جلدی کی وجہ سے ڈرائنگ روم میں بھی دل نہیں لگا۔

”آئی صرف چائے پیوں کی ٹیس کھانے کا موڈ نہیں“۔ وہ کچن میں ہی آ گئی اتنی اس سے خیر خیریت پوچھنے لگی تھیں لائبہ نیوشن کے بچوں کو دیکھنے چلی گئی تھی۔



شہر کا مہنگا ترین ہوٹل بک کر دیا تھا، وہاں سارا ارجمند تھا، روٹیل سکندر نے خاص خاص بڑے بڑے لوگوں کو بھی مدعو کیا تھا، مگر ایشیاء نے اپنی کسی فریڈ کو نہیں بلایا تھا، زویا عدین کتنا ناراض ہوئے تھے مگر جب وہی اس مشکل سے خوش نہیں تھی تو وہ انہیں کیوں بلاتی۔

خوبصورت بلیوں کے فرائ کو تو اس نے استری سے جان کے جلا دیا تھا، یہ بھی وہ انڈین ڈراموں میں اس نے ایک دن دیکھ لیا تھا، اس نے بھی وہی کیا تاکہ پہننا نہ پڑے اپنی مرضی سے بلیو کوئلڈن کڑھائی کارڈی میڈ ٹراؤزر کے ساتھ ڈریس پہن لیا تھا، چیلری اس نے یہ کہہ کر منہ کر دی کہ اسے عادت نہیں ہے چاچی تو اپنا سامنے لے کر رہ گئی تھیں اور تیور اس کی ان حرکتوں کو خوب سمجھ رہا تھا۔

اگلے پر اسے اور تیور کو ساتھ بٹھا دیا گیا تھا، امی اور ڈیڈی اس کے آس پاس تھے، ایشیاء سپاٹ چہرے کے ساتھ وہاں موجود تھی چہرے پر اس کے کوئی خوشی نہیں تھی۔

ہوٹل کے ہال کو خوبصورت انداز میں ڈیکورٹ کیا ہوا تھا، اسٹیج پر اصلی پھولوں کی ایسا لگتا تھا بہار آئی ہوئی ہے۔

”بھائی صاحب! اجازت ہے تیور انگوٹھی پہنا دے؟“ چاچی اپنی سلک کی کادر پر پل سا ڈھکی کا پلو سنباہتی ہوئی جملہ لاری تھیں، کامران چاچو اتنے خوش تھے جیسے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔ تیور کی نگاہوں میں فتح مندی تھی وہ ایک ڈسٹ میں اکڑ کے بیٹھا تھا، روٹیل سکندر کی اجازت ملنے ہی اس نے استحقاق سے اس کا نازک ہاتھ تھام لیا، ایشیاء اس کے کڑے ضبط سے گزر رہی تھی، تیور نے ہیرے کی جگہ لگائی انگوٹھی اس کی عزت ملی، انگلی میں پہنا دی تھی فوراً ہی ہاتھ

کے مٹھی بھینچی۔ سب لوگوں نے مبارک سلامت کا شور مچا دیا مٹی نے اسے دی انگوٹھی پہنانے کو تیمور کو اس نے گھورا۔
 ”ڈیڑی! آپ بہت اچھے کیونکہ ڈیڑی میرے لئے سب کچھ ہیں۔“ اریشما نے فوراً ہی لائن پہنچ کر دی۔
 تیمور اندر گرم گرم مٹھونٹ اتارنے لگا۔ اپنی توہین ہی لگ رہی تھی روجیل سکندر جیسے تیمور کے تاثرات جانچ کر
 تھے، انگوٹھی تیمور کو اریشما پہنانے چاہی نے تاکید کی اور لوگوں نے بھی شور مچا دیا اریشما نے مارے باندھے اس کی
 جانب دیکھے بغیر انگوٹھی پہنادی مٹی نے ڈیڑی نے مٹی نے دونوں کو ہی ساتھ لپٹا کے دعائیں دی تھیں چاہے ان کا دل اندر
 سے خوش نہیں تھا مگر دنیا کو دکھانے کے لئے دکھاوے کا قسم رکھا ہوا تھا۔ روجیل سکندر نے ایک دفعہ پھر دونوں کو ساتھ
 لگا کے پکارا کیا۔

اب دونوں اسٹیج پر بیٹھے تھے اریشما نے نخوت سے منہ دوسری طرف کیا ہوا تھا جبکہ تیمور کی کاٹ دار اور طور پر
 نگاہیں حمدان پر تھیں جو چند آفس ایمپلائز کے ساتھ بلیک پیٹ پر آف وائٹ شرٹ میں چہرے پر سنجیدگی رکھے
 ہوئے تھا ویسے بھی وہ ہر وقت ہی سنجیدہ رہتا تھا۔

”ادمنہ..... لوگ کلاس لوگ“ وہ بڑبڑایا۔
 اریشما نے چتون چمکے کئے اور اس کی بڑبڑاہٹ واضح سنائی اس نے بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی
 نگاہیں دوڑائیں حمدان کو دیکھ کر اس کے چہرے پر چمک آگئی مگر ایدیم ہی دل اداس دھمکن ہو گیا وہ گفتگو میں اتنا
 منہمک تھا جیسے اطراف کے منظر پر نگاہ ڈالنا بھی عبث سمجھ رہا تھا مگر پھر شاید اسے نظروں کی تپش محسوس ہوئی اریشما کو
 دیکھ کر خفیف سا ہو گیا۔

”تایا ابو بھی گید رنگ کا خیال نہیں کرتے ہیں اپنے ایمپلائز تک کو انوائٹ کیا ہوا ہے۔“ تیمور کے لہجے میں
 حقارت، نفرت اور کاٹ تھی۔
 ”ہر کوئی تمہاری طرح نہیں سوچتا ہے۔“ وہ پہلو بدل کے فہمائی نگاہوں سے اسے دیکھتی ہوئی اسٹیج سے ہی اتر گئی
 تیمور کا یوں اس کے قریب بیٹھے رہنا اسے برا لگ رہا تھا۔

تیمور سب جانتا تھا اسے حمدان کے قریب جانے کی جلدی ہو رہی تھی اور وہ اسے ایسے تو خوش نہیں ہونے دے گا۔
 ”آؤ اریشما! ہمیں میں اپنے فریڈز سے ملواتا ہوں۔“ وہ روش پر چلتی جاری تھی تیمور نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
 ”کیا حرکت ہے چھوڑو میرا بازو“ محفل کا بھی اس نے خیال نہیں کیا اور تیمور کی سب کے سامنے انسلٹ کر دی تو
 اسے حمدان کے سامنے اپنے پوزیشن بھی آکورد لگی اس کی نگاہوں نے کچھ بھی غنی نہیں تھا۔

”دور رہ کر بات کرنا اگر آئندہ یہ حرکت کی تو میں چاچو سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔“ ہاتھ اٹھا کر اسے
 دبے دبے لہجے میں وارن کر رہی تھی اور تیمور کا چہرہ حواس باختہ اور دھواں دھواں ہو گیا یعنی اریشما کو اس کی
 پروا نہیں تھی بھری محفل میں اس نے جھاڑ کے رکھ دیا تھا وہ صرف اپنے باپ کی وجہ سے برداشت کر رہا تھا
 اریشما سو نے کی چڑیا تھی اگر کہیں اور یہ چڑیا اڑ کے چلی گئی تو وہاں تو سونا ہی سونا ہو جاتا اور ایسا وہ اور پاپا بالکل
 نہیں چاہتے تھے۔

”سوری“ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔
 چاچی نے شاید دونوں کو اچھے ہوئے دیکھ لیا تھا وہ ماحول کی تلخی کو دور کرنے کے لئے چلی آئیں۔
 ”ارے ابھی بھی تم دونوں لڑ رہے ہو“ انہوں نے اریشما پر تو محبت و پیارا اور شفقت کی بارش کی ہوئی تھی اور
 اسے کوفت ہو رہی تھی۔

”چاچی! تیمور سے بولنے مجھ سے دور رہ کر بات کیا کرے۔“ وہ یہ کہہ کر کی نہیں اور بے مروتی سے ان دونوں
 کے درمیان سے نکلی چلی گئی حمدان نے ساری گفتگو سنی اور وہ بھی مٹی۔
 ”آپ نے دیکھا کتنی میری انسلٹ کرتی ہے اور آپ بھی اس کی سائیڈ لیتی ہیں۔“ تیمور کو غصہ آ گیا۔
 ”ابھی چپ رہو بیٹا! برداشت کرو بعد میں تو تمہارا ہی حکم مانے گی۔“ حمدان کی ساتھیوں نے جو اسے یقین نہیں
 آیا شاید ان ماں بے اندازہ نہیں تھا حمدان ان کے عقب میں ہی بیٹھا بھلے چاہے فاصلہ تھا مگر چاچی کی تلخی سی آواز
 بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

”مجھے غصہ آرہا ہے۔“ تیمور مضطرب بھینچ رہا تھا۔
 حمدان نے دور بیٹھی اریشما کو دیکھا جو کبھی کبھلی کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی مگر اس کے چہرے سے خوشی نام کی
 کسی چیز کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا وہ لوگوں کو دکھانے کے لئے خوشی کا تاثر بھی نہیں دے رہی تھی۔

☆.....☆.....☆
 وہ دونوں سے سوچ سوچ کے پریشان تھا آفس میں بھی نارمل تھا مگر خود کو چپ کرایا ہوا تھا اگر روجیل سکندریا
 اریشما سے کچھ بولے گا جب بھی ٹھیک نہیں ہوگا اور اریشما تو سن کے خوش ہو جائے گی اسے اس کی پروا ہے اور وہ
 اپنی کسی بھی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ اریشما کے لئے بہت بے چین ہے۔
 ”مصباح کے سسرال والے تاریخ کا پوچھ رہے تھے۔“ امی نے اسے سوچوں میں مستغرق دیکھا مگر پھر بھی
 مخاطب کر لیا۔

”آں..... ہاں۔“ وہ چونک کے سیدھا ہو گیا وہاں سے آکر وہ ڈرائنگ روم میں لیٹ گیا تھا کھانا وغیرہ نو بجے
 تک کھا کے فارغ ہو جاتے تھے۔

”وہ تو سال کی بات کر رہے تھے۔“
 ”اس کی نند کہتی ہے بہت پریشانی ہو رہی ہے اس کے باپ کو بھی دیکھنا پڑتا ہے۔“ وہ ہٹانے لگیں۔
 ”آپ کہہ دیتیں سوچ کے مشورہ کر کے جواب دوں گی۔“
 ”بیٹا! میں نے کہہ دیا ہے اتنی جلدی تو ممکن نہیں ہو سکے گا۔“

”ارے امی! آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں مصباح کا سب بہت اچھا ہو جائے گا بے فکر رہے۔“ حمدان نے
 انہیں تسلی دی کیونکہ پورے گھر کی ذمہ داری اس پر تھی پھر اس کی بھی یہی کوشش تھی مصباح جتنی جلدی اسے گھر کی
 ہو جائے ورنہ جتنا لمبا نام رشتہ لگنے کے بعد لگتا ہے فضول کی باتیں ہوتی رہتی ہیں وہ سسرال میں زیادہ جانے کا بھی
 قائل نہیں تھا جتنا سب کچھ چھپا رہے زیادہ اچھا ہے۔

”تم کیسے اتنی جلدی انتظام کر سکو گے۔“
 ”آپ فکر نہیں کریں سب میں نے انتظام کیا ہوا ہے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے اپنی دانست میں اطمینان
 دلانے کی پوری کوشش کی۔

”حمدان بیٹا! لڑکی کی شادی کے لئے دس طرح کی تیاریاں ہوتی ہیں ابھی مصباح کی تو کچھ بھی نہیں ہے
 کپڑے زبیر برتن اور فرنیچر کیا کچھ نہیں ہوگا سب کیسے ہوگا اتنی جلدی۔“ انہیں سوچ سوچ کے فکر ہو رہی تھی۔
 (جاری ہے)

دل کا رشتہ اور اعجاز

”عشال! ایسے کیوں لیٹی ہو.....؟“ شایان لائٹ بھی آف تھی۔
کمرے میں داخل ہوا تو عشال آنکھ بند کئے لیٹی تھی اور ”کچھ نہیں ویسے ہی“۔ عشال نے کہا اور آنکھیں

دوبارہ بند کر لیں دو آنسو اس کی آنکھوں سے باوجود ضبط کے باہر آنکھوں سے چھپ نہ رہ سکے وہ اس کے پاس ہی بیٹھ پریشانہ گیا۔
”عشال! کیا ہوا کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے شیئر کرو“
مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں تمہاری مدد کروں گا۔“
شایان نے کہا۔
”آپ نہیں کر سکتے کچھ بھی آپ بھی چاہے جتنے اچھے ہوں اندر سے ایک مرد ہی ہیں جو کبھی برداشت نہیں کرے گا۔“ عشال نے دل میں سوچا پر کہا کچھ نہیں۔
”مجھے اپنی دوستوں کی یاد آ رہی ہے۔“ عشال نے کہا۔
”بس اتنی سی بات تو چلو کوئی بات نہیں تم بات کر کو ان سے۔“ شایان نے کہا۔
”کاش ایسا ہو پاتا۔“ عشال نے سوچا۔
”کرو تا کیا ہوا اچھا چھوڑو میں خود ہی ڈائل کرتا ہوں کیا نام ہے بسمہ ہے ناں ایک منٹ۔“ خود ہی بولتے ہوئے اس نے نمبر بھی ڈائل کرنا شروع کر دیا۔
”نہیں شایان! ارکس وہ سو گئی ہوگی اب تک۔“
عشال نے فٹ سے موبائل لیا۔



”او کے چلو کوئی بات نہیں کل کر لیتا“۔ شایان نے کہا۔

”اچھا ایک کام کرو ایک کپ اچھی سی چائے پلا دو اچھی بیوی ہونے کا فرض ادا کرو“۔

”اچھا اچھی لائی“۔ عشاں نے کہا اور چائے بنانے چل دی پیچھے شایان کو سوچوں میں ڈال گئی۔

”ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات ہے جس کا عشاں کو دکھ ہے اکثر اس بات پر روئی ہے کہ فریڈ کی یاد آ رہی ہے پھر بات بھی نہیں کرتی“۔ پتہ نہیں بہر حال کیا پتہ خود ہی بتا دے“۔ شایان نے سوچا اور بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆

”نہیں یہ میری پلیٹ ہے بھائی واپس دیں بھئی“۔ ٹومیہ نے چلاتے ہوئے کہا اس وقت تینوں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

”اچھا تو تم اپنے بھائی کے لئے دوبارہ بنا نہیں سکتی کیا ظالم لڑکی“۔ شایان نے بھی پلیٹ ہچکتے ہوئے کہا۔

”لے لیں مجھے نہیں چاہئے“۔ ٹومیہ نے ناراضی سے کہا اور پلیٹ چھوڑ دی۔

”اچھا میری گڑیا! سوری سوری پلیز بہتا معاف کرو مذاق کر رہا ہوں میں“۔ شایان نے جھٹ پلیٹ واپس کرنا چاہی۔

”یہ ہوئی نابات“۔ ٹومیہ نے ہنستے ہوئے کہا اور جلدی سے پلیٹ پکڑ لی۔

”اوہ..... یو جمنر گندی بچی میں سمجھا تم سچ سچ ناراض ہو گئی ہو جاؤ بات مت کرنا اب“۔ شایان نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے حساب بے باقی کیا۔

”سوری بھائی! پلیز سوری تانہ لے لیں پلیٹ میں دوبارہ اپنے لئے نکال لوں گی“۔ ٹومیہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ ہوئی نابات“۔ شایان نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

”چلو آج کھانا اپنی گڑیا کو میں کھلاتا ہوں“۔ شایان نے پیار بھرے لہجے میں کہا عشاں آج صبح جب بھی وہ دونوں کو دیکھ رہی تھی شایان کا یہ انداز دیکھ کر اسے بھی اپنے بھائی کی یاد آ گئی اسے ٹومیہ کی جگہ خود اور شایان کی جگہ بھائی نظر آ رہے تھے اور اسے یہ ہی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھ سے آنسو بہنے لگے شایان نے ٹومیہ کو کھانا کھلاتے ہوئے سرسری طور پر عشاں کو دیکھا تو ٹھیک گیا وہ شایان اور ٹومیہ کو اتنی محویت سے دیکھ رہی تھی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ شایان اسے دیکھ رہا ہے کھانا ختم کرنے کے بعد شایان ٹیس پر آ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔

”شایان ٹومیہ اور ندیا آپنی تین بھائی بہن تھیں ندیا شادی شدہ بھی شایان جب 22 سال کا ہوا تو اچانک ہی ایک حادثے میں ان کے والدین کا انتقال ہو گیا ندیا کی شادی والدین کی زندگی میں ہی ہو چکی تھی اب ٹومیہ صرف اور صرف اس کی ذمہ داری تھی والدین کے انتقال کے وقت ٹومیہ صرف 8 سال کی تھی ٹومیہ کی زندگی میں شایان باپ اور بھائی دونوں کا درجہ رکھتا تھا۔

شایان ٹیس پر کھڑا سوچ رہا تھا وہ کافی دنوں سے سوٹ کر رہا تھا کہ عشاں کو کوئی دکھ ہے بات نہ جانے کیا تھی وہ یہ نہیں جانتا تھا ان کی شادی کو 4 ماہ ہو گئے تھے اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ شایان سے باتوں میں عشاں نے ذکر کیا تھا کہ وہ اپنی بڑی آبی مشعل سے ہر بات ڈسکس کرتی تھی شایان کو اپنی مشکل حل کرنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا اور اس نے مشعل آپنی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مطمئن ہو گیا رات کو وہ جب کمرے میں آیا تو عشاں روم میں نہیں تھی وہ آتے ہی پر لٹ گیا تھوڑی دیر گزری تھی کہ عشاں روم میں داخل ہوئی ہاتھ میں موبائل اور کان میں وارنر لگا ہوا تھا شایان نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا۔

”کیا سن رہی ہو.....؟“

”ریڈیو سن رہی ہوں ریحان اسدی کا شو چل رہا ہے بہت زبردست شو ہے آپ سنیں گے؟“ عشاں نے پوچھا۔

”جی نہیں تم بھی فی الحال مت سنو کچھ ٹائم مجھے بھی دے دیا کرو“۔ شایان نے شکوہ کنان نظروں سے دیکھا تو عشاں نے ایک اچھی بیوی ہونے کا اعلیٰ مظاہرہ کیا اور موبائل اٹھا کر رکھ دیا۔

”تیس اب خوش رکھ دیا آپ کیا کر رہے تھے“۔ عشاں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

”تمہارا انتظار ظاہر ہے بیوی تو مجھے تم دیکھنے نہیں دیتیں اکیلے کہیں تمہاری غیر موجودگی میں کوئی لڑکی میرے دل پر قبضہ نہ کرے“۔ شایان نے اس کو جلاتے ہوئے کہا۔

”اچھا جی جیسے آپ تو ہر وقت میری بات مانتے ہیں نا“۔ عشاں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”کیوں؟ نہیں مانتا کیا ایمانداری سے بتاؤ.....؟“ شایان نے پوچھا۔

”اچھا! مانتے ہیں نا تو پھر ٹھیک ہے کل میں اور ٹومیہ ندیا آپنی کے گھر جا رہے ہیں شام 6 بجے تک آپ ہمیں لینے آجائے گا ویسے بھی ندیا آپنی کافی دنوں سے گھر ہی نہیں آنے کا“۔ عشاں نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے جیسا آپ چاہیں جو حکم سرکار عظام حاضر ہے“۔ شایان نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔

”ٹھیک اب سونے کی تیاری پکڑیں صبح اٹھنا ہوگا جلدی مجھے پھر“۔ عشاں نے لائٹ آف کی۔

”اچھا اب تک ریحان بھائی کا پروگرام سن رہی تھیں تب خیال نہیں آیا تھا میں نہیں بولتا تو میڈم نے 12 بجے تک پورا شو ختم کرنا تھا“۔ شایان نے کہا تو مشعل ہنس پڑی۔

”ہاں تو جانے کا یاد مجھے ابھی آیا ہے اس لئے“۔ مشعل نے کہا تو شایان کے دماغ میں ایک خیال کوندا۔

”چلو یہ صحیح ہے کل یہ لوگ ندیا آپنی کے گھر جائیں

کی تو میں جلدی آفس سے نکل کر مشعل آپنی کے گھر بھی ہواؤں گا“۔

☆.....☆

اگلے دن آفس سے وہ 3 بجے ہی نکل گیا اور 4 بجے تک مشعل آپنی کے گھر پہنچ گیا کیٹ ناک کرنے پر تانیہ نے کھولا تھا۔

”ارے شایان انکل! آپ آئیے نا“۔ تانیہ نے آگے سے ہٹتے ہوئے کہا۔

”آئیں ماما بچن میں ہیں“۔ تانیہ نے کہا اور بلانے چلی گئی۔

”مما! شایان انکل آئے ہیں آپ جائیں اندر باقی کامیں دیکھ لوں گی“۔ تانیہ نے آپنی سے یعنی اپنی ماما سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے یہ بچن صاف کر دو پھر آتے ہوئے چائے کے ساتھ کباب فرانی کر لیتا اور نمکدو وغیرہ لے آتا تو مشعل آپنی اس کو ہدایات دے کر خود ہاتھ صاف کرتے ہوئے کمرے میں آ جاتیں۔

”السلام علیکم“۔ شایان نے ان کو دیکھ کر کمرے ہوتے ہوئے سلام کیا۔

”علیکم السلام! عشاں کو کیوں نہیں لائے تم نکلتے.....؟“۔ مشعل آپنی نے پوچھا۔

”وہ ندیا آپنی کے گھر گئی ہے ٹومیہ کے ساتھ“۔ شایان نے کہا۔

”اور کیسے ہو تم جاتی سب کیسے ہیں گھر میں.....؟“۔ آپنی نے پوچھا۔

”الحمد للہ سب ٹھیک ہیں مجھے آپ سے کچھ ضروری کام تھا اس لئے میں اکیلے آ گیا“۔ شایان نے کہا۔

”مجھ سے ضروری کام تھا شکر خدا کالوگوں کو مجھ سے بھی ضروری کام پڑے ہیں تو نے اتنی تو عزت دی ہے مجھے اچھا کھو کیا کام تھا بولو“۔ مشعل آپنی نے ہنستے ہوئے کہا۔

ساری کلاس کی لڑکیاں آپ کی تعریف کر رہی تھیں اس لئے۔“ عشال نے بتایا۔

”چلو اب تو آپ کا شوق پورا ہو گیا نا۔“ ضائر نے کہا۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے پھر ملے ہیں گزیا نا کس ٹو میٹ یو۔“ ضائر ہاتھ ہلاتے ہوئے چا گیا۔

پھر اسی طرح کی ملاقاتوں پر عشال کو پتہ ہی نہ چلا کہ اس نے کیسے اسے اپنا بھائی بنالیا اور اسے سب

کچھ بتا دیا۔ جیسے سن کر ضائر نے اسے اپنی چھوٹی بہن بنالیا اور واقعی ضائر عشال کے لئے نہایت ہی اچھا بھائی

ثابت ہوا۔ عشال، ضائر بھائی کی فیملی سے بھی ملی تھی، ضائر بھائی شادی شدہ تھے ان کی 1 بیٹی اور 1 بیٹا تھے

ان کی وائف اور باقی تمام گھر والے اچھے تھے اور اسے ایک فیملی ممبر کی طرح ہی ٹریٹ کرتے تھے، ضائر بھائی

5 بھائی تھے بہن کوئی نہیں تھی، ضائر بھائی سب سے بڑے تھے، ضائر بھائی کی اما کو عشال کے روپ میں

ایک بیٹی کی جوتنا تھی وہ پوری ہو گئی تھی، ضائر بھائی سے اس کی ملاقات کا دورانیہ 3 سال کا ہو چکا تھا، عشال تھوڑا

ایسر میں آ گئی تھی، ضائر سے اسے اتنا پیار تھا کہ وہ اسے کھونے کا تصور بھی نہیں کرتی تھی، اس لئے اس نے کبھی

شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، کیونکہ کوئی بھی مرد یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی بیوی کا کسی سے کوئی رشتہ ہوا، انہی

دنوں تمہارا پر پوزل آ گیا تھا، بھائیوں کو تم پسند آ گئے اور انہوں نے عشال کی شادی کرنے کی ٹھان لی جب

عشال سے بات کی گئی تو اس نے انکار کر دیا، ضائر کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، عشال نے فہد بھائی اور احد

بھائی نے مجھے عشال کو سمجھانے کا کہا ایک دن میں گھر آئی اور عشال کو سمجھانے کی کوشش کی پر وہ ماننے کو

تیار ہی نہیں تھی۔

”عشال! شادی تو تم نے کرنی ہی ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو تو پھر.....“

بھی۔“ عشال نے دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ میں کچھ بول ہی نہ سکی۔

”آئی! میں ضائر بھائی سے الگ ہونا نہیں چاہتی ہوں اور یہ شادی مجھے ان سے الگ کر دے گی۔“ شادی

سے انکار کا مطلب تھا، عشال کی بھائیوں سے لڑائی مجھے ان سب کا ایک ہی حل نظر آیا اور میں نے ضائر کو فون

کر کے سب صورتحال سے آگاہ کیا، ضائر نے مجھے یقین دلایا کہ وہ عشال کو راضی کر لے گا اور اس نے کر بھی لیا۔

”بھائی آپ بھی میں سمجھتی تھی کہ مشال آپلی اور آپ مجھے جانتے ہیں تو میرا ساتھ دیں گے۔“ عشال

نے تم آنکھوں سے کہا۔

”عشال! تم اگر مجھے بھائی مانتی ہو نا دل سے تو تم دیکھنا کہ ہم دوبارہ ضرور ملیں گے گزیا شادی کے بعد تم

پلیز راضی ہو جاؤ، میری خاطر اپنے بھائی کی خاطر۔“ ضائر نے التجا کی۔

”ٹھیک ہے بھائی آپ کی خاطر یہ بھی سہی آپ میری شادی میں آئیں گے نا.....؟“ عشال نے مان

سے پوچھا۔

”کیوں نہیں میری گزیا ضرور آؤں گا میں۔“ انہوں نے پیار سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”اچھا اب گھر جاؤ اور شادی کے سنے دیکھو۔“ ضائر نے کہا۔

”میں۔“ تو تصویر نہیں دیکھی اس کے سنے کیسے دیکھوں.....؟“ عشال نے معصومیت سے پوچھا۔

”بتاؤں تمہیں ٹکی چلو جاؤ گھر پاگل۔“ ضائر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”جیسی بھی ہوں اپنے ضائر بھائی پر گئی ہوں پاگل ہوں تو پاگل سہی۔“ عشال نے بھی اسی کے لہجے میں

کہا۔ اوکے بائے بائے۔“ گھر آ کر اس نے شادی کی لئے رضامندی دے دی سب حیران ہونے کے ساتھ خوش بھی تھے، گھر میں

شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور پھر ایک دن

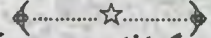
رخست ہو کر تمہارے گھر آ گئی، پر جاتے جاتے میں نے ہی اسے کہا تھا کہ وہ تمہیں کچھ نہ بتائے اب تمہاری مرضی ہے تم جو کرو پر پلیز میری بہن کو خوش رکھنا۔“

مشال آپلی نے التجا کی۔

”بھروسہ رکھئے مجھ پر اچھا یہ بتائیے کہ ضائر کا کوئی کاٹیکٹ نمبر ہے تو دیں مجھے۔“ شایان نے کہا تو آپلی

نے اسے نمبر دے دیا نمبر لے کے وہ ندیا آپلی کے گھر کی جانب نکل پڑا 618 نمبر گئے تھے اور عشال کا غصے سے بھرا

چہرہ دیکھنے کی اس کو پوری توقع تھی۔



ندیا آپلی کے گھر پہنچ کر اسے حسب توقع صورتحال ملی وہاں سے نکلے نکلے 7 نمبر گئے، گھر پہنچ کر ٹو میٹ اور

عشال کچن میں چلی گئیں رات کے کھانے کی تیاری کرنے کے لئے، کھانا کھانے کے بعد عشال نے برتن

دھوئے جب دودھ گرم کرنے لگی تو ٹو میٹ بھی آ گئی۔

”بھابی آج تو خوب تھکن ہو گئی نا۔“ ٹو میٹ نے کہا۔

”ہاں واقعی ٹو میٹ دے اگر سوچو یہ دودھ اس وقت پھٹ جائے تو تم کیسے کرو گی؟ ہمیں تو دودھ پنے بغیر نیند جو

نہیں آتی۔“ عشال نے مذاقاً کہا۔

”بھابی! کیا آپ بھی اچھا اچھا بولیں اور ویسے بھی اگر دودھ پھٹ جائے تو نو پر اہم آپ ایک کام

کیجئے گا وائٹ دھاگے سے سی لیجئے گا کچی کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔“ ٹو میٹ نے مسکراتے ہوئے کہا تو عشال ہنس

پڑی۔

”اچھا اب یہ بھی بتا دو وہ دھاگہ دکھتا تو ہو گا نہایا دھاگہ بھی کوئی جادوئی ہو گا کہ سل بھی جائے گا اور دکھے

کا بھی نہیں۔“ عشال نے ہنستے ہوئے کہا تو دونوں ہی ہنس دیں۔

”یار! دودھ گرم کر رہی ہو یا باتیں بکھار رہی ہو تم دونوں۔“ شایان کچن میں آیا تو بولا۔

”بس! آ رہی تھی آپ کو بھی نا ذرا صبر نہیں ہے۔“ کر کہا۔

عشال نے کہا اور دودھ گلاس میں ڈال کر ٹو میٹ کو دیا اور کچن کی لائٹ آف کی اور شایان کے ساتھ کمرے

میں آ گئی۔

”عشال یار! کل 5 بجے ریڈی رہتا تمہیں کسی سے ملوانا ہے سر پرانز ہے۔“ شایان نے کہا۔

”کس سے ملوانا ہے پہلے بتائیں ورنہ میں کوئی ریڈی نہیں ہوں گی۔“ عشال بولی۔

”سر پرانز بھی کبھی بتا کے دیتے ہیں بھلا۔“ شایان نے مذاق اڑایا۔

”اوکے پاگل ریڈی رہوں گی میں جو حکم سرکار۔“ عشال نے کہا۔

”اچھا میں پاگل ہوں تو اپنے بارے میں جناب کے کیا نا خیال ہیں۔“ شایان بولا۔

”میرے خیال اپنے بارے میں آپ سے کافی الگ ہیں۔“ عشال نے کہا۔

”اچھا میرا خیال تھا کہ آپ بڑی ذہین ہو غلطند ہو پر بابا! شکر ہے آپ نے خود ہی بتا دیا کہ میں خود خواہ کی

غلطی کا شکار ہوں۔“ شایان نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھے نہیں لگ رہے ذرا بھی اچھا آپ مجھے نہیں بات کرنی آپ سے۔“ عشال نے مصنوعی ناراضی سے

کہا اور کرٹ بدل کر لیٹ گئی۔

”اوکے بابا سوری! ابھی مذاق کر رہا تھا جسٹ کڈنگ اوکے سوری نا اب کان پکڑوں کیا۔“ شایان

نے اس کو اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ.....“ عشال نے جان کر بات ادھوری چھوڑی۔

”کیا سوچ رہی تھیں تم.....؟“ شایان کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

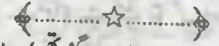
”بھی کہ آپ کان پکڑ کر معافی مانگتے ہوئے کتنے معصومہ لڑکیوں کے بابا!۔“ عشال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بڑی اچھی لگ رہی ہو ہے نا۔“ شایان نے جمل کر کہا۔

”ہاں یہ تو ہے آخر کار آپ بھی مان ہی گئے نا ویسے۔“

”اچھا بہت بولتی ہو تم اوکے گڈ ٹائم۔“

شایان نے کہا۔
”اوکے گڈ ٹائم۔“ عشال بولی۔



شام 6 بجے وہ ریڈی ہوئی تھی ریڈ اینڈ بلیک کسٹراس کی فراک اور چوڑی دار پا جاسے میں نہایت اچھی لگ رہی تھی شایان کمرے میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا، گھٹ کھولنے کی آواز پر بال بناتی ہوئی عشال نے مڑ کر دیکھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں آپ مجھے اچھی نہیں لگ رہی کیا۔؟“ عشال نے نروس ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھی نہیں تم بے حد اچھی لگ رہی ہو ایسے جیسے آسمان سے اتری ہوئی حور جیسے اور انی مخلوق۔“ شایان نے رومینک انداز میں کہا، عشال کو اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔

”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ آج آپ کو کہیں جانا ہے۔“ عشال نے اس کے سینے پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

”کیا یار! بہت ظالم بیوی ہو تم ویسے بس ابھی آیا۔“ پھر کچھ دیر بعد وہ دونوں گھر سے نکل پڑے گاڑی جن جن راستوں سے گزر رہی تھی وہ راستے عشال کے جانے پہچانے تھے اچانک ایک بنگلے کے سامنے کاررک گئی، عشال نے جونہی نگاہ اٹھائی اندر تک خوفزدہ رہ گئی وہ کہیں اور نہیں حنا بھائی کے گھر کے سامنے کھڑی تھی ڈرتے ڈرتے وہ گاڑی سے اتری اور شایان کی سنگت میں اندر بڑھی۔

”نجانے شایان کا یہاں پر کون سا فرینڈ ہے۔“ عشال نے سوچا۔

اندر گھسنے پر پورا بنگلہ تاریکی میں ڈوب گیا، وہ

شایان کے ساتھ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی شایان اسے لے کر ہال کمرے کی جانب بڑھا تو لائٹ فوراً ہی آن ہو گئی اور اس پر چھو لوں کی برسات ہوئی۔

”پہلی برتھ ڈے ٹوٹیو پی برتھ ڈے ٹوٹیو ڈیر گریا پی برتھ ڈے ٹوٹیو۔“ حنا بھائی کی پوری فیملی حنا بھائی کے ساتھ اس کو دوش کر رہی تھی سینٹرل ٹیبل پر ایک بڑا سا ٹیک رکھا تھا۔

”آؤ عشال! ایک کاٹو۔“ حنا بھائی نے کہا۔
عشال شکذ کی سی کیفیت میں آگے بڑھی اور ٹیک کاٹا، اسے اپنی ساعت پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ حیران نظروں سے شایان کو دیکھنے لگی جس کے چہرے پر دلچسپ مسکراہٹ تھی۔

”شایان! یہ سب کیا۔؟ اور آپ کو کیسے پتا چلا۔؟“ عشال نے حیرت سے پوچھا تو شایان نے ساری بات بتائی کہ کس طرح اس نے مشال آپ سے بات کی پھر حنا بھائی سے ملا اور اتفاق سے اس کے اگلے دن اس کا برتھ ڈے تھا۔

”سوری شایان! مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو اس لئے نہیں بتایا کیونکہ مجھے آپ سے منع کر رکھا تھا۔“ عشال نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں عشال! اب مجھے چھوڑو اب اپنے بھائی سے ملو جس کے لئے میڈم اکثر روٹی ہیں اور مجھ پر اور میری بہن پر نیت لگاتی ہیں۔“ شایان نے کہا۔

”دیکھا عشال! میں کیا کہتا تھا تا کہ تم مجھے مل جاؤ گی دوبارہ۔“ حنا بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا تو عشال ان کے گلے لگ کر رو پڑی، کافی ٹائم گلے گلے رہنے کے اور گلے شکوے کرنے کے بعد وہ شایان کی طرف بڑھی۔

”شایان! آپ نہایت اچھے ہیں واقعی مجھے آپ پر فخر ہے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔“ عشال نے شایان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ تو ہے ویسے لوگ دیر سے اعتراف کرتے

بات کا۔“ شایان نے کہا تو سب ہنس پڑے۔
”یہی ہو گریا تم۔؟“ حنا بھائی نے پوچھا۔

”یکدم فٹ آپ کو کیسی لگ رہی ہوں۔“ عشال مسکراتے ہوئے کہا اس کی آواز خوشی کے باعث نکلتی تھی۔

”ہاں حنا بھائی جیسا بھائی اور شایان جیسا شوہر پانے بعد عشال ناخوش رہے گی امپا سبل۔“ حنا بھائی نے کہا۔

”اف۔۔۔۔۔ لوگوں کو اپنی تعریف کرنے کا موقع ملنا ہے۔“ حنا بھائی نے حنا بھائی کی بیوی نے کہا۔

”اچھا تو آپ اپنی کر لیجئے آپ کو بھی حق حاصل ہے۔“ حنا بھائی نے حنا بھائی کی بیوی نے کہا۔
”ہاں! میں نے ہتے ہوئے عشال سے پوچھا تو عشال سمیت ہنس پڑے اور بھائی کا منہ دیکھنے والا تھا۔

”بس! بہت باتیں کر لیں سب نے عشال بیٹا! میں جو تم شادی شدہ زندگی کسی گزر رہی ہے۔“ حنا بھائی نے کہا۔

”وہ تو آپ کو شایان کو دیکھ کر اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔“ حنا بھائی نے کہنے پر حنا بھائی سعد نے کہا۔

”اب آپ سب مجھے شرمندہ کر رہے ہو اتنی بات کر کے۔“ شایان نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

”چلیں۔۔۔۔۔ اب نہیں کرتے آپ کی تعریف کیا رہا ہے کس سخی سے پالا پڑا ہے آپ کا۔“ حنا بھائی نے کہا اتنے میں بھابی ہال کمرے میں داخل ہوئی۔

”جیس سب کھانا کھالیں۔“ حنا بھائی نے کہا تو حنا بھائی نے ہوئے پھر ڈانٹنگ ٹیبل پر اسی طرح کی ٹیبل ٹوک جھونک کے ساتھ پر تکلف کھانے کا

”جیس اب ہمیں اجازت دیں۔“ شایان نے کہا۔
”کے گلے لگتے ہوئے کہا۔“ حنا بھائی نے کہا۔

”حنا بھائی! اس سو پر۔“ عشال نے خوشی سے کھلتے ہوئے لہجے میں کہا تو شایان نے پھر اسے گلے لگایا، آج شایان بہت خوش تھا کیونکہ اس کی جان سے پیاری بیوی خوش تھی اور عشال کو آج زندگی کی تمام خوشیاں مل گئی تھیں اس کی ساری خوشی دور ہو گئی تھی۔

چاند کی روشنی بھی آج چمک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”حنا بھائی! آپ ہمارے گھر کب آئیں گے۔۔۔۔۔؟“ عشال نے بھائی سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔

”انشاء اللہ جلدی میری جان جلدی آؤں گا۔“ حنا بھائی نے پیار سے کہا۔ سب سے ملنے کے بعد وہ دونوں نکل پڑے۔ گھر جب پہنچے تو 9 گئے تھے تو میہ نجانے کہاں بھی عشال نے دیکھا تو وہ سوچتی تھی۔

”عشال یار! آتے ہوئے میرے لئے 1 کپ کافی لے آنا۔“ شایان نے ٹائی کی ٹائٹ ڈھیل کرتے ہوئے کہا۔

”جی جناب ضرور۔“ عشال نے کہا۔ جب عشال کافی لے کر کمرے میں پہنچی تو شایان بیڈ پر لیٹا تھا۔

”شایان! یہ لیں۔“ عشال نے کہا۔

”شایان! آپ بہت اچھے ہیں آج آپ نے میری برتھ ڈے پر مجھے جو تحفہ دیا ہے اسے میں کبھی نہیں بھولوں گی۔“ عشال نے نم لہجے میں کہا۔

”وہ تو گفت نہیں ہوا ابھی تمہاری برتھ ڈے کا گفت تو ابھی ملے گا۔“ شایان نے سائڈ ٹیبل سے ایک گفت پیک نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

”پہلی برتھ ڈے ٹوٹیو پی میری جان۔“ شایان نے عشال کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو سوچ شایان۔“ عشال نے کہا۔

”لو گفت کھلو۔“ شایان نے کہا تو عشال نے پیک کھولا تو اس میں خوبصورت ٹیکٹوں سے مزین انگوٹھی تھی۔

”تھینک یو سوچ شایان! اس سو پر۔“ عشال نے خوشی سے کھلتے ہوئے لہجے میں کہا تو شایان نے پھر اسے گلے لگایا، آج شایان بہت خوش تھا کیونکہ اس کی جان سے پیاری بیوی خوش تھی اور عشال کو آج زندگی کی تمام خوشیاں مل گئی تھیں اس کی ساری خوشی دور ہو گئی تھی۔

چاند کی روشنی بھی آج چمک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

انعم خان

مکمل ناول

قسط نمبر 15

اس دن میں سے ہوئی

حسن گیلانی سے بات کے بعد وہ مطمئن ہوا تھا، انہوں نے امید دلائی تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ ساجدہ گیلانی راضی کر لیں گے سوریلیکس ساعر کے ساتھ ضروری شاپنگ کرنے مارکیٹ کی طرف گیا تھا۔

اتوار کا دن تھا، حسن گیلانی بھی گھر میں ہی تھے اور بیگم سے بیٹے کے متعلق بات کرنے کا سوچ رہے تھے مگر ان نے بیٹے میں ہی ساجدہ گیلانی متفکری ان کے سامنے بیٹھتے ناراضی سے بولیں تھیں۔
”جسمائیں آپ علی کو..... کیوں میری ممتا کا امتحان لیتا چاہ رہا ہے۔“
”ہوا کیا ہے؟“

”اب نیا شوشہ لے کر بیٹھا ہے ملک سے باہر جانا چاہتا ہے۔“ وہ علی پر غصہ تھیں، ان کی بات نے حسن گیلانی کو سب سے کی طرف آنے کے لئے ہموار راہ دی تو فوراً بولے۔
”بعض اوقات والدین خصوصاً ماں کو اپنی ممتا سے بڑھ کر اپنے بچوں کا سکون عزیز ہوتا ہے، اولاد کی خوشی اور سہمی والدین کی خواہش ہوتی ہے اور ساجدہ یہ سچ ہے کہ علی کے لیے تمہاری ممتا، تمہارا پیارا نمول ہے مگر ان سب بات تمہیں کم از کم اس وقت ایسی صورتحال میں اپنی ممتا کو کچھ عرصے کے لیے قربان کرنا چاہیے۔“
”حسن! آپ کیا کہہ رہے ہیں میں سمجھی نہیں۔“ وہ ناگہی کے سے انداز میں بولیں۔
”میں تمہاری فکر سے واقف ہوں ساجدہ! لیکن علی کا فیصلہ بھی شاید غلط نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولے۔

”اوہ..... تو علی نے آپ کو سفارش کرنا کر بھیجا ہے۔“ وہ ناراض ہوئیں۔

”نہیں.....!“ انہوں نے فی الفور فی میں سر ہلایا کہ مبادیات شروع ہونے اور انہیں قائل کرنے سے پہلے ختم نہ ہو جائے ساتھ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے مزید بولے کہ بیگم صاحبہ کو بیٹے پر غصہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

”بس اس نے مجھ سے اپنا مسئلہ پیش کیا تھا۔“

”ایک مرتبہ میں اسے منع کر چکی ہوں حسن! اور اب بھی میرا وہی جواب ہے۔ میں اسے خود سے دور نہیں بھی سکتی۔“ وہ دونوں قطعیت سے بولیں۔

”جن حالات سے وہ گزرا ہے جتنا ناراضی کے دکھ کو اس نے خود پر حاوی کیا ہے اس سے وہ میٹھی سیٹ نہیں پار باہیاں نہ لکھی سکون اسے یہاں مل سکتا ہے۔“ میں اسے ایک موقع ضرور دیتا چاہے کیا یہ بہت جلد وہ اپنی خوشی میں سرخرو ہو اور بالکل فریٹش پہلے جیسا بن کر لوٹ آئے۔ انہوں نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ مجھے بہلا رہے ہیں حسن! یا علی کے دھوکے میں آ رہے ہیں۔ علی کا فیصلہ سراسر غلط ہے، قریب ہی سمجھو آپ! اگر اسے سنبھالنا ہوتا تو اب تک سنبھیل چکا ہوتا! ایک معمولی سی لڑکی کے لیے جتنا اس نے خود کو روگ لگایا ہے جتنی تڑپا ہے ایسے میں کوئی باگل ہی ہوگا جو اس کے فیصلے کو سراہے گا! یہاں ہمارے ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو آگ پر جلاتا رہا وہاں ہم سے دور غیروں! انہیوں میں مستبشرہ کو سوچ کر پاگل ہو جائے گا! کچھوں کو تو حسن وہ مستبشرہ کو کبھی ہی نہیں چاہتا! غور کرکھا کر گرنے کا یہ مطلب تو ہرگز بھی نہیں کہ دوبارہ اٹھنا اور آگے بڑھنا ہی بھول جاؤ۔“ وہ بخشنے کے مود میں ہی نہ تھیں۔

”اس فیصلے سے وہ اٹھ کر آگے ہی بڑھنا چاہتا ہے۔“ وہ اتنا ہی بولے۔

”اپنوں کی اسے فکر نہیں غیروں میں کیسے آگے بڑھ سکتا ہے وہ۔“ ساجدہ گیلانی تلخ وطن رہ ہوئیں علی کا فیصلہ انہیں ہرگز منظور نہ تھا نہ وہ اسے خود سے دور بھیجنا چاہتی تھیں نہ انہیں موقع تھی کہ علی خود کو خود ساختہ روگ سے نکلنے کی کوشش کر سکتا ہے کیونکہ وہ کبھی جاتی تھیں کہ علی نے مستبشرہ جیسا ہے جنوں کی حد تک محبت کی تھی اور جس کی سزا وہ اب بھگت رہا تھا مگر اس کے خیال سے بچھا نہیں چڑایا تھا۔

”غیر غیروں میں نہیں وہ وہاںوں میں ہی رہے گا! میں نے اپنے اٹل جانے کا مشورہ دیا ہے۔“ حسن گیلانی نے بتایا۔

”تو آپ اس کے فیصلے میں برابر کے شریک ہیں۔“ ساجدہ گیلانی نے خفیف انداز میں انہیں دیکھا۔

”شاء..... لیکن میں شراکت میں نہیں نے تمہاری اپنی خواہش کو سرفہرست دیکھتے ہوئے علی کو یقین دہانی کہہ رہے کہ تم اپنے اجازت دے دو گی لیکن فی الحال میں نے اسے تمہاری خواہش کے حلقہ کچھ نہیں بتایا۔“ جیسی وہ پہلے سے فوراً بولے۔

”مگر وہ اپنی خواہش کے پھر سے جانے پر وہ مان سکتی ہیں۔“

”کون سی؟“ خواہش؟“ وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے ان سے استفسار کرنے لگیں۔

”جب تک علی نے مستبشرہ کا ذکر تم سے نہیں کیا تھا اس سے پہلے تم نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ افریشم کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہو۔“ انہوں نے بیوی کو یاد دلایا۔

”ہاں تو پھر.....؟“ یاد آنے پر وہ پوچھنے لگیں۔

”پھر یہ کہ اب مستبشرہ علی کی زندگی سے چلی گئی ہے تم اپنی خواہش پوری کرنا چاہو تو یہ نادار موقع ہے۔“ انہوں نے تیر نشانے پر پھینکا۔

”مطلب؟“ وہ دھیمی بڑیں حقیقتاً ان کی یہ خواہش اس وقت حسرت بن کر رہ گئی تھی جب علی نے ان سے مستبشرہ جمال کا ذکر کیا تھا تب وہ بیٹے کی خوشی کے لیے مان گئی تھیں مگر اب پھر سے ان کی حسرت خواہش میں یکدم ڈھل گئی۔

”اٹل میں علی جتنا بھی وقت گزرا ہے گا! افریشم اس کے ساتھ آکر رہی تو نہ صرف وہ مستبشرہ کو بھول جائے گا بلکہ خود سے افریشم سے رشتے کے لیے کہہ گا کہ تم دیکھ لینا۔“ انہوں نے بیگم کو زبردست آس دلائی۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ پُر امید اواز و نظروں سے انہوں نے شوہر کو دیکھا۔

”یقیناً۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مدھم سا مسکرائے۔

”اگر ایسا نہ ہوتا تو؟“ ساجدہ گیلانی نے دوسرا پہلو بھی ساتھ لیا۔

”ایسا ہی ہوگا! تم فکر نہ کرو! تو کیا اب تم علی کو جانے کی اجازت دو گی؟“ حسن گیلانی نے انہیں مطمئن کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں مجبوراً.....!“ اپنی خواہش کے ہاتھوں بالا خرائیں ماننا ہی پڑا وہ بولے۔

”سرد کے دونوں بیٹے بھی ابھی چھوٹے ہیں! علی وہاں کے آفس کو بھی جوائن کر لے گا اور سرد بتا رہا تھا کہ اسٹڈیز کمپلیٹ ہونے کے بعد افریشم بھی بزنس جوائن کر لے گی یوں دونوں مزید وقت ساتھ گزاریں گے اور عافیہ (بہن) بھی کتنے عرصے سے سب کو آنے کا کہہ رہی تھی وہ بھی خوش ہو جائے گی۔“

”ہاں اور کم از کم اسے خود سے دور بھیج کر مجھے اس کے کھانے پینے کی فکر تو نہیں ہوگی! وہاں سب اس کے اپنے ہوں گے اس کا خیال رکھیں گے۔“ ساجدہ گیلانی نے اپنی بات کی۔ علی کو خود سے دور بھیجنے کے ٹھن فیصلے کے بعد ان کا دل البتہ مطمئن تھا۔

حسن گیلانی بالا خرائیں راضی کرنے کے بعد بیٹے کا انتظار کرنے لگے شام کو جب وہ واپس آیا تو ماں کو کچن میں موجود پاکر سید حسن گیلانی سے پوچھنے ان کے کمرے کی طرف بڑھا وہ بید کراؤن سے ٹیک لگائے کسی فائل میں کھوئے۔

”آؤ برزوردار! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔“ وہ علی کو دیکھتے ہی فائل سائڈ پر رکھ کر سیدھے ہوئے۔

”ڈیڈ! آپ نے بات کی ماسے؟“ اس نے بے مبری سے پوچھا۔

”ہاں کی تھی!“ وہ اس کے انداز پر مسکرائے۔

”پھر.....؟“

”تمہاری ماں نے اپنی مستاکتمہاری خوشی کے لیے زبردستی سائڈ پر رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا ہے تم کچھ عرصے کے لیے اٹل جا سکتے ہو مگر اس شرط کے ساتھ کہ اپنے ارادے کی تکمیل کرو گے۔“ وہ تفصیل سے بولے۔

”انشاء اللہ ضرور!“ وہ غرور مڑا۔

”مگر وہ اتنی جلدی کیسے مانگیں مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔“

”بس ہے ایک وجہ۔“

”کیسی وجہ؟“ وہ حیران ہوا۔

”کچھ خاص نہیں اور وہ کہتے ہیں ناں کہ آم کھاؤ پیڑ نہ گنو! سو تم بھی تیاری کرو اب جانے کی وجہ تلاش نہ کرو۔“ وہ خوشگوار انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

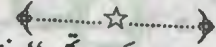
”اوکے ڈیڈ! جیسے آپ کہیں اینڈ تھینک یوسوج“۔ وہ بھی ان ہی کے انداز میں مسکراتا تھا اور ان کے گلے لگ کر تشکر سے کہتا جانے لگا۔

”کہاں چلے؟“

”مما کی طرف..... جانے تک کا سارا وقت ان کے ساتھ گزاروں گا اب وہ نہ ناراض ہوں گی۔“ ان کی طبیعت سے واقف وہ بولا۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ حسن گیلانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکل کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔



”مراد بھائی کی تو نگاہیں بس آپ کا ہی طواف کر رہی تھیں“۔ نفیسہ بیگم اور سعید احمد سے ملنے اور باتیں کرنے کے بعد پریش نے اس کو تصویریں دکھانے کے لیے کمرے میں لے آئی تھی اور ایک ایک تصویر اس کے سامنے کرتی جہاں اس کی خوبصورتی کی تعریف کر رہی تھی وہیں مراد کی دیوانگی اور محبت سے بھی اسے آگاہ کر رہی تھی۔ مہروش نے اس کی بات پر اس کے ہاتھ میں پکڑی ان تصویروں کو دیکھا جن میں مراد صرف اسے دیکھتا مسکرا رہا تھا۔

”ہوں..... اور اسی لیے ایک بھی پکچر ٹھیک نہیں آئی“۔ مظاہرہ شریر سے انداز میں کہتی پریش کے گھورنے پر مسکراتی تھی مگر دراصل مراد کے ذکر سے اندر تک کڑواہٹ پھیلی تھی۔

”دس ازناٹ گڈ! ایک سے ایک میٹ پکچر ہے۔“

”چلو تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں“۔ وہ ہنسی۔

”اچھا اب دیکھیں اس میں آپ دونوں کا پیکل ہنڈرڈ پرسنٹ پرنٹ لگ رہا ہے بالکل ایسے جیسے اللہ نے صرف ایک دوسرے کے لیے بنایا ہو آپ کو..... اور ساری خوشی محبت آپ پر نچھاور کر دی ہو“۔ پریش نے ایک اور تصویر اس کے سامنے کی جس میں وہ اور مراد بالکل ساتھ بیٹھے زندگی سے بھرپور انداز میں مسکراتے ہوئے ارد گرد سے بے نیاز لگ رہے تھے مامی نے پریش کے ہاتھ سے تصویر لے کر آنکھوں کے سامنے کی پریش نے باقی تصویروں کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مراد..... مراد..... مراد!“ اس کا دل پھٹ کر چیخا تھا اس شخص نے تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک نوچ کر کھرچ ڈالی تھی مگر شوخی قسمت پھر بھی اب اسے آگے بڑھنے اپنے نام کے ساتھ اسی شخص کا نام سننا اور لینا تھا اور اس قدر بے بس ہو کر لینا تھا جیسے سانسوں کی روانی اس نام کے بغیر ممکن نہ ہو۔

”کہاں کھو گئیں جناب!“ پریش نے اسے بری طرح محو پا کر ہوش کی دنیا میں واپس لانا چاہا وہ پریش کے لیے سنہیل کر مسکرائی۔

”کہیں نہیں..... بس!“

”بس یہاں آئے چند گھنٹے ہوئے اور مراد بھائی کی یاد آپ کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں“۔ وہ مامی کی بات اچک کر سوالیہ کھلکھلائی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”مراد کی یاد محض یاد نہیں بلکہ بھیا تک یاد ہے جو شاید ہی میرا پیچھا چھوڑے“۔ جواباً وہ ہر جتہ دل میں بولی۔

”کیوں ایسا ہی ہے ناں؟“ پریش مکمل اس کی طرف متوجہ تھی۔

”جہیں ایسا بھی نہیں ہے اب!“ مامی نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا وہ کسی کو بھی اپنے متعلق غلط فہمی کی اصلیت خود اپنی زبانی بتانا نہیں چاہتی تھی نہ کوئی بھی ایسا تاثر غلط بھول کر انہیں دینا چاہتی تھی جس سے شک کی کوئی محبت ناکش نکلتی۔

”اب آپ بن رہی ہیں مراد بھائی کو پیٹ چلے گا تو ناراض ہوں گے ان کی محبت کی قدر کریں گی تو ان کی محبت میں برکت ہوگی کچھ سمجھ آیا؟“ پریش نے بڑی بوڑھیوں کے سے شوخ انداز میں کہا۔

”جی آگیا سمجھ..... پر کیا ہم کوئی اور بات کر سکتے ہیں؟“ مامی نے بچوں کے سے انداز میں کہتے ہوئے بات بدلنے کی کوشش کی کم از کم وہ یہاں مراد کے ذکر سے آزاد رہنا چاہتی تھی۔

”ضرور کر سکتے ہیں۔“

”تو پھر کریں ناں۔“

”ہاں بالکل!“ پریش نے نفی اور تصویریں سمیٹ کر نئے سرے سے باتوں میں مصروف ہوئی کچھ دیر بعد پریش کام سے اٹھ کر گئی تو وہ بھی اٹھ کر باہر لان میں نکل آئی جہاں ہارن کی آواز پر چونکدار نے مین گیٹ کھولا اور وقار کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وقار فرنٹ ڈور کھول کر باہر نکلا۔ اس نے قدم اندر کی جانب حسب معمول بڑھانے چاہے مگر اس سے پہلے اس کی نظر مہروش پر پڑی جو اسی کی طرف متوجہ تھی تو اندر جانے کے بجائے خوشگوار انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

السلام و علیکم وقار بھائی!“

”علیکم السلام! کسی ہو مامی!“ وقار نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا۔

”ٹھیک ہوں!“ اس نے رساں سے بتایا۔ لب و لہجہ انداز اس نے نارمل رکھا تھا مگر وقار کو دیکھتے ہی گزرے ڈیڑھ ماہ کا تمام عرصہ مراد کے بہرہ واپ کی وجہ آج آنے سے پہلے پڑنے والا پتھر اور آئندہ کی تمام وہ متوقع بے قدری بے بسی بربادی کسی فلم کی طرح اس کے دماغ کے پروے پر رونما ہوئی تھیں جن کا ذمہ دار یا وجہ وقار سعید کی ذات تھی۔

”کس وقت آئی ہو تم؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”ابھی ایک گھنٹہ ہوا ہوگا۔“ اس نے مختصر کہا۔ وقار سے لمبی گفتگو فی الحال وہ کرنا نہیں چاہ رہی تھی اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا لہجہ وقار کے لیے تلخ نہ ہو جائے۔

”کچھ دن رہو گی تو سہی ناں؟“ جبکہ وقار اسے کافی عرصے بعد دیکھ کر خوش ہوا تھا۔

”جی تقریباً ایک ہفتہ۔“

”اوکے“ پچھو کیسی ہیں؟ اور مراد بھی آیا ہے؟“ وہ بہن کی اندرونی دیر و بیرونی کیفیت سے بے خبر اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔

”پچھو ٹھیک ہیں اور مراد تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلے گئے تھے۔“ وہ ہر سوال کا جواب سنجیدگی سے دے رہی تھی خود کو کمپوز کر رہی تھی بہن ہونے کے ناطے وہ اس سے نفرت تو نہیں کر سکتی تھی مگر دل اس کا کچھ بدل سا گیا تھا۔

”اوکے اور تم اندر آؤ ناں سب کے ساتھ بیٹھو یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو؟“ وقار نے اسے اندر لے کر کہا تو اثبات میں سر ہلاتی اس کے ساتھ اندر کی جانب بڑھی۔ باقی تمام افراد لاؤنج میں بیٹھے تھے پریش بھی کام سے فارغ ہو کر

”بھئی میں نے ریحانہ خالہ کے گھرنون کیا تھا، کل وہ اور سین وغیرہ آپ سے ملنے آئیں گی۔“ ماہی کے برابر بیٹھے ہوئے وہ اسے بتانے لگی۔
”اوکے“ تو وہ محض اتنا ہی بولی۔

رات کا کھانا کھانے سے پہلے تک اور کھانا کھانے کے دوران گھر کے تمام کینوں کے درمیان ان کے ساتھ ملکی پھینکی گفتگو کرتی مگر کھانا کھانے کے بعد پریشے کو گرین ٹی بنانے کا کہہ کر آہستہ سے کمرے میں چلی آئی اور بیڈ کی طرف بڑھی، سینڈلز اتار کر پاؤں اور پرکھنچ کر بیٹھ گئی، پھر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے دانستہ گردن سائیز ٹیبل کی طرف ڈالتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر فریم شدہ تصویر اٹھائی اور بغور سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

یہ وہی تصویر تھی جو پریشے نے اس کی انجنت کے دن لٹی تھی جب مراد اسے رنگ پہنار ہاتھ مہریش کو وہ لہجہ اب بھی یاد تھا جسے پریشے نے موبائل میں بچھ کر لیا تھا۔ اس وقت مراد منصور کی آنکھوں میں بے پناہ محبت تھی اور ماہی کے چہرے پر انبساط کے ہزاروں رنگ اور آنکھوں میں انوکھی سی چمک تھی مگر اب..... مراد کی اصلیت اس کے سامنے تھی مراد کی جھوٹی چاہتوں کا مقصد اس پر کھل گیا تھا تو اب نہ آنکھوں میں پہلی سی چمک ٹھہری تھی نہ اس لمحے کی یاد سے دل میں ترنگ پیدا ہوئی تھی، بس مراد کی ذات اس کی یاد سے ابھرنے لگی۔

ایک دھوکا کھا کر اس کی خواہشات و جذبات انتقام کی بیھٹ چڑھ گئے تھے اور دل تپتے انگاروں پر لچھ لچھ جھلس رہا تھا، پھل رہا تھا، تن من کو سکون تھا نہ روح کو، اور دل رہا تھا اپنی بے قدری پر طلال بھی اسے ناکافی لگتا تھا۔

”مگر یوں ہی آخر تک چلے گا؟“ وہ دل میں خود سے ہم کلام تھی۔

”مراد کا ہاتھ ایک بار اٹھ چکا ہے میں لاکھ ہمت دکھاؤں مگر ڈٹ کر مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ زخمی شیر بنا ہر صورت میرا شکار کرتا رہے گا، میری زندگی تو اجیرن کر چکا ہے مجھے سب کی نظروں میں بھی تصور وار ٹھہرا سکتا ہے مجھ سے جہاں تک ممکن ہو میں مراد کا مقابلہ کروں گی مجھے مراد با آسانی مات نہیں دے سکتا۔“ حواسوں پر مکمل اختیار رکھے وہ اپنی سوچ پر یقین کی مہر ثبت کرنا چاہ رہی تھی کی نگاہیں ہنوز ہاتھ میں پکڑی تصویر پر مرکوز تھیں۔

”وقت کی اس کروٹ میں میں بڑ بڑلاؤں گا شکار نہیں ہو سکتی۔“ دل میں چھپے گہرے رنج کو بظاہر وہ آنکھوں میں عیاں ہونے سے روکے ہوئے بھی مگر آنکھوں کی ایک لمبی قطار تار جاتے ہوئے بھی اندر ہی اندر گرے جا رہی تھی۔

”اپنے حق میں میں کسے گناہگار سمجھوں اور کسے بے قصور ٹھہراؤں۔ مراد منصور کو..... جسے اپنے آگے محض اپنے اور اپنی آٹا کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا یا وقار بھائی کو..... جو ایک طرف میری بربادی کا سبب بنے ہیں اور دوسری طرف پورے غلوں سے میری خوشنوی کی دعا کرتے ہیں مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔“ وہ گنگش کا شکار ہوئی۔ البتہ وقار سے سخت نالاں ہو کر بھی وہ انتہا تک اس سے متنفر نہیں ہو سکی تھی۔

”میرا جرم کوئی ایک ہو یا دونوں..... میں شاید ہی کسی ایک کو بھی معاف کر سکوں گی۔“ وہ گہری سوچ میں تھی وقار نے تقدیر کے اس بدلتے کھیل کا آغاز جانے انجانے میں اس کے لیے کیا کہا تھا اور مراد منصور نے اسی کھیل کو اپنے تئیں ایک دلچسپ موڑ دے کر اس کے لیے اسی کھیل کے اختتام کو والیہ بنا دیا تھا۔

وہ جانے کب سے کب تک یونی اپنی سوچوں خیالوں میں غور ہتی اگر پریشے کی آمد نہ ہوئی ہوتی۔ پریشے کمرے میں آتے ہی اسے تصویر پر نظریں گاڑے منہمک دیکھ کر مسکرائی اور آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے فریم شدہ تصویر اچک کر شریرانہ انداز میں بولی۔

”میں نے بالکل ٹھیک کہا تھا، لگتا ہے مراد بھائی نے آپ پر اپنی محبتوں کا جادو کر دیا ہے جو آپ سب سبھی ان

کے سحر سے نکل نہیں پا رہیں۔“
”ہاں..... اب تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ جس پر ماہی نے مصنوعی مگر دھیمہ قہقہہ لگا کر خود کو کمپوز کرنا چاہا تھا مگر ساتھ ہی سوچے بنانہ رہ گئی۔
”مگر محبتوں کا نہیں..... اپنی ذات کا ایسا کالا جادو کیا ہے جس کا اثر دل پر ہوا ہے اور تکلیف روح نے محسوس کی ہے۔“

”آپ کی چاہئے!“ پریشے نے گرین ٹی کا گنگ اس کی طرف بڑھایا۔
”تھیک یو۔“ اس نے چہرے پر خوشگواریت لات لائی اور گنگ ہونٹوں سے لگالیا۔

☆.....☆.....☆
سردی اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی مگر اس کے لیے اتنی بے اثر کہ سوچوں کی فرمائش کو جامد کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

”تم مجھے کمزور نہیں کر سکتے علی..... میرے اور تمہارے درمیان اب کچھ نہیں رہنا چاہیے نہ تمہاری یادیں نہ تمہاری محبت..... میرے دل کو کمزور کرنا چھوڑ دو پلیز!“ مستبشرہ جمال اس موڑ پر کھڑی تھی جہاں اسے اپنے ہر اس عزم و ارادے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس پر وہ علی آیان کو بھولنا چاہ رہی تھی اس کے غصے پر اسی ناکامی نے بے بسی کے آثار نمایاں کرنے شروع کیے تو وہ التجائیہ لہجے میں بڑبڑائی۔

”میں اپنے بابا کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتی علی! اپنی یادوں سے کہو کہ میری زندگی تباہ نہ کریں میں نے ابھی بہت آگے بڑھنا ہے میرے دل کو اپنے خیالات میں مت جکڑ دیں اپنے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہیں دیکھنا چاہتی۔“ مستبشرہ کو اس لمحے بھی اپنی ذات کی سالمیت کی فکر تھی۔ وہ اپنی لمبی پرواز کو قائم رکھنا چاہ رہی تھی۔ اپنے بابا کی نظروں میں ہر صورت سرخو رہنا چاہتی تھی ایسے میں علی کا اس کی سوچوں اور خیالات سے دور..... بہت دور رہنا لازم تھا۔

”چلو میں مان لیتی ہوں کہ مجھے تم سے پیار کا ناک کرنے کے بجائے پہلے ہی دن صاف لفظوں میں تمہیں جواب دینا چاہیے تھا لیکن مجھے سچ میں سمجھتا و انہیں ہے اپنے کیے پر..... میں نے سب کچھ تمہاری بھلائی کے لیے کیا تھا سچ میں، میرا مقصد تمہارا دل دکھانا ہر گز بھی نہیں تھا۔“ جانے مستبشرہ اس کے سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی اسے سمجھا رہی تھی یا خود کو تسلی دے کر اپنی بڑ سوچ و حشمت زدہ کیفیت سے چھٹکارا چاہ رہی تھی کیونکہ وہ جان کر بھی انجان بننا چاہ رہی تھی کہ علی کی یادوں سے محض وہ وہی طور پر فرسٹریشن کا شکار ہو رہی تھی اس کا دل شات تھا دھڑکنوں کی روانی برقرار تھی۔

”یہ تمہارے خط کا وقتی اثر ہے بس اور کچھ نہیں..... اگر میرے دل میں واقعی تمہارا خیال یا ذرا برابر بھی جگہ ہوتی تو مجھے اسی لمحے احساس ہو جاتا مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو دل سے دماغ سے مجھے تمہاری طرف مائل کرتا آئی ہوپ میں جلد از جلد اس تمام اثر سے خود کو نکال لوں گی تم زبردستی مجھ پر اپنی یادوں سمیت حاوی نہیں ہو سکتے۔“

وہ ہر سیرگی پر ثابت قدم رہ کر اپنے فیصلے پر اٹل ہونے کی مہر ثبت کرنا چاہ رہی تھی۔
”اصل میں محبت کچھ نہیں ہوتی علی! یہ نہ زندگی بن سکتی ہے کسی کی نہ کسی کی زندگی بنا سکتی ہے محض الجھن پیدا کرتی ہے محبت، تم خود دیکھو؟ تمہیں کیا بتا دیا محبت نے؟ اور مجھے دیکھو! میں نے محبت کو اہمیت نہ دی تو اپنے بابا کا اعتبار جیتا، جس سے میری وہ خواہش پوری ہونے جا رہی ہے جو اگر میں محبت کے چکر میں پڑتی تو ہمیشہ نشہ رہتی۔“

مستبشرہ نے محبت کے پاٹ میں اسے اور خود کو گھسیٹ کر موازنہ کیا اس کے تصور کو سمجھنا چاہا ایک مرتبہ پھر قرار کے حصول کے لیے حتیٰ لوجہ اپنایا۔

”محبت پاگل پن کے علاوہ کچھ نہیں ہے علی! یہ صرف بے وقوفی کا دوسرا نام ہے اور نہ میں پاگل ہوں نہ بے وقوف..... میں تم سے محبت نہیں کر سکتی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اگر تم زبردستی مجھے یاد آتے بھی رہے تو میں اسے محبت برگر نہیں کہوں گی میں ایک لمحے کی قید میں تمام عمر نہیں گزار سکتی..... میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔“ اس کے الفاظ مضبوط اور لوجہ پائیداری لیے تھا۔

مگر یہ بات تو اس کے علم میں بھی تھی۔

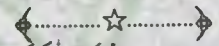
محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی نہ کسی ارادے سے محبت کو توڑ لگا یا جاتا ہے محبت پاگل پن ہو یا بے وقوفی یہ پھر بھی محبت ہی رہتی ہے دھیرے دھیرے رفتہ رفتہ اپنی جڑیں پھیلاتی ہے۔ چاہے کوئی خفا ہو یا خوش جس دل میں ہیرا کرنا چاہے اس دل میں بس جاتی ہے ایک خوبصورت نئے معصوم جذبے کی طرح جس کا احساس پہلے جلد ہو یا دیر مگر اس احساس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

محبت کا ایک لمحہ کافی ہوتا ہے عمر قید کے لیے.....!

اور جو احساس محبت ہو جائے تو محبت کا جذبہ فرار کی انکار کی تمام راہیں مفقود کر کے اپنی من مرضی کرتا ہے پھر کسی کی نہیں سنتا۔

مستبشرہ جمال فی الحال تو اس اصلیت سے نظریں چرا رہی تھی اپنے دل کی بھر پور فنی کر رہی تھی دماغ کے ہر فیصلے کو مستحکم کرنا چاہ رہی تھی اور جتنی جلدی کرنا چاہ رہی تھی اتنی شدت سے ناکامی کا سامنا کر رہی تھی جسے وہ فی الحال تو علی کے خط کا دھنی اثر گردان رہی تھی لیکن.....!

دل اور دماغ کی جنگ میں فیصلہ آنا ابھی باقی تھا۔



”مائی! تم سے ایک بات کا کہا تھا میں نے۔“ مد روش کو تنہا دیکھ کر وقار اس کے پاس آیا تھا اور اب اس کے سامنے کھڑا اس سے مخاطب سوالیہ ہو کر اسے دیکھ رہا تھا دوسری جانب اُس نے وقار کے سامنے ایک مرتبہ پھر اپنے اندر موجود سختی کو چھپانے کی سعی میں کچھ نہ یاد آنے پر آہستگی سے استفساد کیا۔

”کون سی بات؟“

”مجھے لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی مراد تو ڈا بہت اب بھی خفا ہے مجھ سے۔“ وقار قدر نے سنجیدہ ناظمہرے ہوئے انداز میں گویا ہوا مائی نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”سب ٹھیک ہی تو نہیں ہوا بھائی!“ اور نہایت شکوہ کنال لوجہ میں اندر ہی اندر گلوگیر انداز اپنایا اس کے سامنے ماہر ناٹل رہی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے مراد کا دل بالکل صاف ہے آپ پلیز ایسا نہ سوچیں۔“

”ہاں مگر مجھے کلٹی فیل ہوتا ہے۔“ وہ اب بھی پشیمان تھا۔

”تو وقار بھائی! آپ اس وقت سوچتے ناں..... اب کیا فائدہ جب زندگی کی ہر سانس داؤ پر لگ گئی ہو۔“ جس سے مائی باوجود کوشش کے کھوں میں سخت ہوئی۔

”مائی.....؟“ اس کی بات پر وقار کی آنکھیں گویا پھٹی تھیں۔

”جب آپ نے اُس وقت کسی کی فکر نہیں کی تھی تو اب کیوں کر رہے ہیں۔“ مائی کا انداز تلخ و طنزیہ ہوا اندر ہی اندر خود سے سوال جواب نے جیسے اسے تھکا دیا تھا۔

”تب اور بات تھی مائی!“ وقار کی آواز البتہ دھیمی و قدرے کمزور تھی۔

”کیا فرق ہے تب اور اب میں..... یہی کہ پہلے کسی اور کی بہن تھی اور اب بات آپ کی بہن کی ہے اس لیے آپ شکر ہیں؟“ وہ خود کو بولنے سے روکنے میں ناکام ہو گئی تھی آواز کی گونج کم تھی مگر وقار کے لیے حیران کن تھی۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔“ اس نے شکست خوردہ ہو کر فنی میں سر ہلایا۔

”پھر کسی بات ہے بھائی؟“ وہ سخت نالاں نظر آئی۔

”میں مانتا ہوں کہ میری وجہ سے بہت پہلے دلوں میں رنجشوں نے جنم لیا تھا لیکن میں ساری عمر کی عداوت نہیں چاہتا۔ تھک گیا ہوں میں بھی ہر ایک کو خود سے متنفر دیکھ کر میرا بھی دل چاہتا ہے کہ.....“ ماسف زدہ آواز میں وہ جذباتی سا ہوا تھا لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے مائی بول پڑی۔

”اب سب ٹھیک ہو گیا وقار بھائی!“ وہ بات یہیں سینٹا چاہ رہی تھی۔

”تو پھر مائی! تمہاری باتیں؟“

”میں صرف اس لیے یہ سب کہہ رہی ہوں کہ آپ کو پہلے بھی فکر کرنی چاہیے تھی اب میری فکر سے صرف اچھا بھائی بن رہے ہیں ایک اچھا انسان نہیں اذینہ کا بھی آپ سے رشتہ تھا جس کا پاس آپ نہیں نبھائے تھے۔ آپ نے کیوں شادی سے انکار کیا یہ آپ کسی کو اب بھی بتانا نہیں چاہتے لیکن اذینہ کی زندگی تو داؤ پر لگ گئی تھی تب آپ نے نہ اس کے بارے میں سوچا تھا نہ آنے والے وقت کے بارے میں پھر اب کیوں؟“ مائی نے اس مرتبہ خود کو سیٹ کر لیا تھا۔

”کیا میں بھائی ہونے کے ناطے تمہاری فکر نہیں کر سکتا تمہارے لیے سوچنا نہیں چاہیے مجھے؟ کیا میں بے حس بن کر بیٹھ جاؤں؟ سب سے قطع تعلق کر لوں؟“ وہ دلبرداشتہ سا ہوا تھا دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔

”بات قطع تعلق کی نہیں ہے وقار بھائی!“

”تم مجھے اب جھن میں ڈال رہی ہو مائی!“

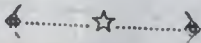
”میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا ہرگز بھی نہیں تھا آپ پلیز ریلیکس ہو جائیں۔“ وقار کو مایوس دیکھ کر وہ ناوم سی ہوئی۔

”میں تمہیں واقعی خوش دیکھنا چاہتا ہوں مائی!“ وہ خلوص سے بولا۔

”آپ کو نہیں لگتا کہ میں خوش ہوں؟“ وہ بولی پھر اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

”میں بہت خوش ہوں وقار بھائی! آپ میرے دل میں بہت معتبر مقام رکھتے ہیں مجھے آپ کے خلوص آپ کی فکر کی قدر ہے اور مراد کو بھی آپ سے اب کوئی گلہ کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں نے ان سے بات کی تھی اور اگر ان کے دل میں ذرا سی بھی خشک ہوتی تو وہ کیوں مجھ سے شادی کر کے ابواور پھینچو کو پھر سے ایک کرتے مراد بہت اچھے ہیں میں ان کے ساتھ بہت خوش ہوں آپ پلیز زیادہ نہ سوچا کریں۔“

”ہوں..... مگر تم زندگی داؤ پر لگنے کی بات.....“



”اچھا ٹھیک ہے بیٹا! تم آرام کرو، میں عربہ کو بتا دیتی ہوں۔“ عالیہ نیگم اس پر کھل درست کرتے

”عروہ یار! تم ہی بتاؤ میں کیا کروں.....؟ مجھے
تینشن ہو رہی ہے یار! خروہ کون شخص ہے جو ایک
ل سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے“ میں جو نمبر بدلوں

اسے چہ چل جاتا ہے میری ہر سرگرمی پر اس کی کڑی نظر ہوتی ہے اور..... اب..... اب تو وہ ہوگئی ہے یار وہ مجھے یہ بھی بتانا شروع ہو گیا ہے کہ میں نے کب کس کلر کا ڈریس پہنا ہوتا ہے دس از نوچ۔“ فلک غصے سے بولی۔

”پھر تم نے کیا سوچا ہے.....؟ اس سب کا کیا حل ہے تمہارے پاس.....؟“ عروہ بنے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”یہ نہیں یار..... اگر میں امی سے شیر کروں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ خوفزدہ ہو جائیں گی تم جانتی ہو وہ میرے لئے کتنی پوزیسیو ہیں اور رہی بات ابو کی تو..... انہیں تو بتانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔“ فلک بے بسی سے بولی تھی۔

”اچھا پھر سنو! تم ایسا کرو کہ اسے میسج کرو اس سے صاف صاف پوچھو کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے.....؟“

”ایسا ہی کروں گی اب۔“ فلک نے آہستگی سے کہہ کر کال کاٹ دی۔

”ہمارے کالج میں تو کوا بوجیکشن ہے ہی نہیں اور اکیڈمی بھی گراڑ اکیڈمی ہے ان دو جگہوں کے علاوہ تو میں کہیں آتی جاتی بھی نہیں پھر یقیناً یہ شخص میری اکیڈمی کے راستے میں ہی کہیں ہوتا ہوگا۔“ فلک خود کو کمانی کے سے انداز میں بول رہی تھی کہ اسی راگ نمبر سے میسج آ گیا۔

”آج اکیڈمی نہیں جانا کیا.....؟“

”کون ہو تم.....؟“ فلک نے فوراً رپائی کی۔

”اوہ..... کیا واقعی تم نے مجھے دہلائی کیا اوہ میرے خدا..... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا میں تو سمجھا تھا شاید اپنی قسمت میں صرف انتظار ہی لکھا ہے شکر ہے یہ خاموشی کا جمود تو سہمی آئی ایم وی پی۔“ اس ابسی شخص نے پلک جھپٹتے ہی دہلائی دیا تھا لیکن فلک کے سوال کا جواب نہ دیا تھا جس پر فلک مزید پتئی تھی اور

غصے سے میسج ٹائپ کرنے لگی۔

”دیکھیں مسٹر ایکس..... وائے..... زی..... اچ اور میرا قیمتی وقت ضائع مت کریں سیدھے سے دیں کہ کون ہیں آپ اور کیا چاہتے ہیں مجھ سے.....؟ کیوں مسلسل مجھے اری ٹیٹ کر رہے ہیں میں خاصی برا اخلاق اور بد لحاظ ہوں اس سے پہلے کے میں اس کا مظاہرہ کروں شرافت سے بتا دیں کہ یہ چیپ حرکت کرنے کا کیا مقصد ہے.....؟“

”دیکھیں میڈم! میں نے کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی میں ایک پڑھا لکھا شریف انسان ہوں مجھے عام کر کے ہیں عام رضا میں نے آپ کو کچھ عرصہ قبل ایک ٹاڈی کے فنکشن میں دیکھا تھا آپ مجھے بے حد اچھی لگیں بہت مشکل سے آپ کا نمبر ٹریس کیا لیکن آپ نے مجھے کوئی رسپانس نہیں دیا جس پر مجبوراً مجھے آپ کا پیچھا کرنا پڑا میرا جرم صرف یہ ہے کہ..... مجھے آپ سے محبت ہے۔“ میسج کا آخری جملہ پڑھ کر فلک کے ہاتھ لہجہ ہر کو لرزے تھے اپنی انیس سالہ زندگی میں پہلی بار اس نے صنف مخالف سے اپنے لئے ایسا جملہ سنا تھا اس نے خاموشی سے سیل فون ایک طرف رکھ دیا تھا بنا کوئی جواب دیئے۔

☆.....☆.....☆.....

”اس منہول نے بھی ابھی ہی باہر نکلتا تھا سارا ہموڈ خراب کر دیا۔“ دل ہی دل میں کڑھتی وہ اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا چاہتی تھی مگر وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”یہ کیا بد تیزی ہے.....؟“ فلک کو اس کی اس حرکت پر بے پناہ غصہ آیا تھا۔

”میں نہیں چھوڑ آؤں اکیڈمی تک.....؟“ وہ ڈھیٹ بنے بولا تھا۔

”جی نہیں ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ میں تم جیسے گھٹیا شخص کے ساتھ سفر کروں۔“ فلک نے ہلّا خرابانہ غصہ نکال ہی دیا تھا۔

”ارے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی کے ساتھ وقت گزارہ ہے میں نے تم خود کو کیا چیز سمجھتی ہو مس فلک.....؟“ وہ اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا تھا۔

”اگر تم میری پیچھو کے بیٹے نہ ہوتے تو اس وقت میں تمہارا منہ نوح لیتی میں صرف اور صرف اپنے ابو کی طرف سے تمہارا لحاظ کر رہی ہوں مسٹر خادری علی۔“ وہ ایک ہلکے سے اپنا بازو چھڑوا کر آگے بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆.....

”فیروز کی طرح بہت چٹا ہے۔“ فلک جیسے ہی اکیڈمی سے گھر کوئی بھی عام رضا کا میسج اسے رسید ہوا تھا۔

”آخر تم ہوتے کہاں ہو میری اکیڈمی کے آس پاس تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔“ فلک نے سمجھلائے ہوئے انداز میں میسج ٹائپ کیا تھا۔

”ارے جناب! میں تو تمہیں دل کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہوں ویسے بھی محبت دل کا رشتہ ہے اور میرے دل کے تار تمہارے دل سے جڑے ہوئے ہیں تم کب کیا کرتی ہو کیا پہنتی ہو کہاں جاتی ہو سب کچھ مجھے محسوس ہو جاتا ہے۔“ میسج پڑھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی فلک کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی تھی بہت سی دوسری عام لڑکیوں کی طرح اسے بھی یہ سب اچھا لگنے لگا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ عام رضا کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

”بھلا چاہے جانا کسے برا لگتا ہے۔“

”اچھا جی..... تو اتنا یقین ہے تمہیں اپنی اہمیت پر۔“ اس نے مسکراتے ہوئے عام رضا کو دہلائی دیا تھا۔

”ہاں..... اس سے بھی زیادہ چاہو تو آ زماؤ۔“ فوراً جواب آیا تھا۔

”لیکن میں نے تو سنا تھا کہ پیار میں آزمایا نہیں جاتا۔“ فلک نے سرشاری سی کیفیت میں جواب دیا تھا۔

”بالکل درست سنا ہے آپ نے جناب! لیکن میرا

یہ خیال ہے کہ جن سے پیار ہوا نہیں نہیں آ زمانہ چاہئے مگر جو آپ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہوں انہیں آزمائے میں لے کوئی مضائقہ نہیں اور پیار تو مجھے ہے ناں تم سے تمہیں تو نہیں..... آئی ایم رائٹ.....؟“ فلک کا دل بری طرح دھڑکا تھا اس نے ریتلائی دیئے بنا ہی موبائل سوچ آف کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆.....

”فلک! یہ سب ٹھیک نہیں ہے ایک راگ نمبر کے ساتھ اس قدر انچٹ کہاں کی عقلمندی ہے یا ز اگر تمہارے والدین کو خبر ہوگی تو کتنا برا ہوگا ان کا اعتماد اٹھ جائے گا تم پر سے تمہارا اچھ خراب ہو جائے گا۔“ عروہ نے اسے حتی الامکان سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”ارے عروہ! وہ کوئی ایسا دیا شخص نہیں ہے وہ ایک شریف اور با وقار انسان ہے جانتی ہو اس نے کتنی مجھے باہر ملنے پر فورس نہیں کیا ورنہ آج کل تو دوستی کے بعد پہلا مطالبہ ہی ملاقات ہوتی ہے وہ باقی مردوں سے بہت مختلف ہے۔“ فلک نے پوری طرح دفاع کیا تھا۔

”بہت بڑی بھول ہے تمہاری فلک شہزاد کے وہ باقی مردوں سے مختلف ہے مرد صرف وہی مختلف ہوتا ہے جس سے آپ کا خونئی رشتہ ہو یا پھر شرعی اور قانونی طور پر جو آپ کی زندگی میں آتا ہے باقی سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں اور بہت جلد تمہیں اس بات کا ادراک ہو جائے گا۔“ عروہ بات مکمل کر کے رکھی تھی۔

☆.....☆.....☆.....

”امی! ابو کب آرہے ہیں.....؟“ فلک نے چائے کپ میں انڈیلے ہوئے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔

”بیٹا! دو چار دن مزید لگ جائیں گے انہیں کہہ رہے تھے بزنس ذیل کچھ لمبی ہوگئی ہے۔“ عالیہ بیگم

چائے کاسپ لیتے ہوئے بولیں۔
 ”ابو کے بچے گھر بہت دیران ویران سا لگتا ہے۔“
 فلک اداسی سے بولی تھی۔

”وہ تو بے بیٹا! لیکن اب کام بھی تو ضروری ہے ناں! چھاتم ایسا کرو چائے پینے کے بعد یہ رقم اپنی پھیپھو کو دے آؤ تمہارے ابو نے مجھے فون پر بار بار تاکید کی تھی کہ میں یہ رقم آج ہی ان تک پہنچا دوں۔“ عالیہ بیگم نے کچھ رقم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ای! میرا بالکل بھی دل نہیں کرتا ان کے گھر کا رخ کرنے کو۔“

”بری بات بیٹا! ایسا نہیں بولتے، وہ پھیپھو ہیں تمہاری۔“ عالیہ بیگم نے پیار سے اسے سمجھایا تھا۔

”ای! کیسی بہن ہیں وہ! جنہیں صرف ابو کی دولت سے پیار ہے نہ وہ آپ کی عزت کرتی ہیں نہ ابو کی قدر کرتی ہیں! پھر آپ اور ابو کو بھلا کیا پڑی ہے ان کی اتنی فکر کرنے کی؟“ وہ جرح کر رہی تھی۔

”فلک بیٹا! ہر شخص کا اپنا کردار ہوتا ہے اپنی سوچ ہوتی ہے اپنا عمل ہوتا ہے ہم صرف اپنی سوچ اور اپنے عمل کے ذمہ دار اور جوابدہ ہیں کسی دوسرے کے نہیں! اٹھو شاباش۔“ وہ پیار سے اس کا گال سہلاتے ہوئے بولیں۔

☆.....☆

فلک شہزاد اپنے ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی اسے زندگی میں ہر آسائش اور راحت میسر تھی، کوئی گلہ کوئی شکوہ نہ تھا اسے زندگی سے ہاں مگر اپنے والدین سے اسے ایک اختلاف ہمہ وقت رہتا اپنی پھیپھو کی لاچ اور ان کے اکلوتے سپوتے خاور علی کی سرگرمیاں اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں، لیکن اس سب کے باوجود شہزاد صاحب اور عالیہ بیگم کا ان کے لئے فکر مند رہنا اسے بری طرح کھولاتا تھا خاور علی کا باپ اشرف علی عالیہ بیگم کا خالہ زاد تھا عالیہ بیگم اور شہزاد صاحب کے توسط سے ہی اشرف علی کی شادی

شہزاد صاحب کی سوتیلی بہن ساجدہ بیگم سے ہوئی تھی عالیہ بیگم اور شہزاد صاحب کی شادی کے چند ماہ بعد ساجدہ بیگم اشرف علی کے سنگ رخصت ہوئی تھیں عالیہ بیگم اور شہزاد صاحب اس بات سے قطعی واقف تھے کہ اشرف علی کا اٹھنا بیٹھنا غلط سوسائٹی میں تھا وہ ڈرنک کا عادی اور بری صحبت کا شکار تھا اس سب کا الزام ساجدہ بیگم سراسر اپنی بھانج اور سوتیلی بھائی شہزاد تو قیصر کو دیتی تھیں شادی کے ایک سال بعد خاور علی کی پیدائش نے ساجدہ بیگم کو قدرے چپ کر دیا تھا جبکہ عالیہ بیگم تا حال اس نعمت سے محروم تھیں اور اس محرومی کو ساجدہ بیگم اپنی بد عاقراردیتی تھیں، لیکن ان کے تمام تر خدشات اس وقت غلط ثابت ہوئے

جب 5 سال کے طویل عرصے کے بعد فلک نے آخر عالیہ بیگم کی گود بھر دی شہزاد صاحب اور عالیہ بیگم کی جان بھی کبھی پری میں تھی زندگی اپنے معمول کے مطابق رواں دواں تھی مگر اشرف علی کی اچانک ڈیوٹی نے ایک جو بچہ پال چادیا اشرف علی نشے کی حالت میں ایک پارٹی سے واپس آ رہے تھے کہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ کی نظر ہو گئے ساجدہ بیگم اپنی زندگی کی تباہی کا تصور داتا حال شہزاد صاحب اور عالیہ بیگم کو ہی سمجھتی تھیں شہزاد صاحب اس تقدیر کے لکھ کو اپنے سر ڈالتے ہوئے ساجدہ بیگم اور ان کے 15 سالہ بیٹے خاور علی کو اپنے گھر کے ساتھ والے پورشن میں لے آئے تھے وہ دن اور آج کا دن وہ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے خاور علی کو انہوں نے علاقے کی نامور یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی بہن کی کڑوی کسلی باتیں وہ کمال ضبط سے برداشت کر جاتے تھے اور عالیہ بیگم کو بھی اسی صبر کی تلقین کرتے ساجدہ بیگم کا واحد چشم و چراغ خاور علی اپنے باپ کا ہی پرتو نکلا۔

☆.....☆

”فلک! میں کب سے تمہیں کال کر رہا تھا تم میری کال کیوں نہیں یک کر رہی تھیں۔“

”بس یوں ہی دل نہیں کر رہا تھا۔“ فلک نے عامر رضا کی بے قراری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا جبکہ دوسری طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

”ہیلو.....عامر! ہیلو..... میں..... میں مذاق کر رہی تھی جب تمہاری کال آرہی تھی اس وقت امی کمرے میں تھیں میرے پاس ایسے میں میں کیسے پک کر سکتی تھی تمہاری کال! پلیز ناراض مت ہوں۔“ فلک اس کی خاموشی سے بری طرح بوکھلائی تھی۔

”مجھے ایک بات سچ سچ بتاؤ فلک۔“ عامر رضا قدرے توقف کے بعد بولا تھا۔

”ہاں..... ہاں پوچھو۔“ فلک ہمدن گوش ہوئی۔

”تمہیں مجھ سے محبت ہے.....؟“ وہ بہت آس سے پوچھ رہا تھا جبکہ فلک سانس لینا تک بھول گئی تھی باپ کے بعد وہ پہلا شخص تھا جسے فلک چپکے چپکے جانے لگی تھی اسے اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا محسوس ہوتا تھا فلک شہزاد نے ان دو سالوں میں صدیوں کے فاصلے طے کر ڈالے تھے گو کہ اس نے آج تک عامر رضا کو دیکھا نہ تھا نہ کبھی ملتی تھی، دل لاکھنتیں کرتا ملاقات کے لئے پروہ اسے ایک ہی دلیل دیتی کہ محبت روح کا رشتہ ہے جسم کا نہیں۔ وہ عامر رضا کو بنا دیکھے بنا لے ٹوٹ کر چاہنا چاہتی تھی محبت کی منطق انوکھی تھی اس کے نزدیک لیکن آج عامر رضا کے یوں صاف صاف پوچھنے پر وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔

”جتنا تجھے چاہا ہے جتنا تجھے سوچا ہے اس کے لئے ایک لفظ ”محبت“ کچھ بھی تو نہیں ہے۔“

”عامر! میں نہیں جانتی۔“ ایک طویل سانس خارج کر کے اس نے شہرے شہرے انداز میں کہہ کر کال ڈسکریٹ کر دی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ عامر رضا ڈس ہارٹ ہوا ہوگا۔

☆.....☆

عالیہ بیگم کے کہنے پر فلک شام کا کھانا ساجدہ بیگم کو

دینے چلی آئی تھی دو دن سے ساجدہ بیگم کی طبیعت خاصی خراب تھی عالیہ بیگم خود ہی باقاعدگی سے کھانا اور دوا دے آتی تھیں آج چونکہ شہزاد صاحب کے کچھ دوست کھانے پر آ رہے تھے تو انہوں نے فلک کو کھانا دے کر بھیج دیا تھا۔

”پھیپھو کہاں ہیں.....؟“ وہ اپنے سامنے خاور علی کو دیکھ کر سخت بد مزہ ہو گئی تھی۔

”دوائی لے کر سوری ہیں..... بائے دادے تم نے آج کس طرح ہمارے غریب خانے کو رونق بخش ڈالی.....؟“ خاور علی اس پر نظریں گاڑے بولا تھا۔

”امی نے کھانا بھیجا ہے پھیپھو جا گئیں تو یاد سے انہیں بتا دینا میں کچن میں رکھ رہی ہوں۔“ وہ بمشکل اپنے لکھ کو نرم بناتے ہوئے بولی تھی۔ کھانا شلف پر رکھ کر فلک پلٹی ہی تھی کہ خاور علی سے بری طرح ٹکرائی۔

”اندھے ہو کیا راستہ دو مجھے۔“ وہ تمل گئی تھی۔

”جانے والے اپنا راستہ خود بناتے ہیں فلک بی بی۔“ وہ بے حد قریب ہوتے ہوئے بولا تھا۔ فلک نے پوری قوت سے اس کے منہ پر چھین مارا۔

☆.....☆

”فلک شہزاد! میں اچھی طرح جانتا ہوں تم میرے جذباتوں سے قطعی انجان نہیں ہو جو میں محسوس کرتا ہوں ہونئیں سکا کہ وہ تم تک نہ پہنچتا ہو میرا دل اگر تمہارے نام کے ساتھ دھڑکتا ہے تو تمہاری سائیں بھی میرے ہی نام کی ملا جلتی ہیں تمہیں دیکھنے کو اگر میں بے قرار رہتا ہوں تو تمہاری کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں

ہے میں نے تم سے محبت کی ہے اور..... اب شادی کرنا چاہتا ہوں صرف تمہارا عا م ر ض ا..... فلک کی سانس بے ترتیب ہو رہی تھیں وہ بار بار عا م ر ض ا کا سیتج پڑھ رہی تھی اسے اس کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ سے محبت محسوس ہو رہی تھی۔

”تکتا تخلص ہے یہ شخص کس قدر سچائی ہے اس کے الفاظ میں“۔ اسے وہ ر ہ کرا پنی قسمت پر رشک آ رہا تھا وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی قرار دے رہی تھی جسے بنانا تکتے ہی محبت مل گئی تھی آنسو در در ہجر..... کچھ بھی تو نہ آیا تھا اس کے حصے میں پھر وہ خود کو کیونکر خوش قسمت نہ سمجھتی۔

”عامر! آئی رہی لو“۔ فلک شہزاد کے لبوں نے آہستگی سے جھنجھکی تھی۔

☆.....☆.....☆.....

”امی..... یہ..... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ.....؟“ ایسا کبھی نہیں ہو سکا میں مروت سکتی ہوں پر خاور علی سے شادی نہیں کر سکتی“۔ فلک بے حد مشتعل ہو رہی تھی وہ کالج سے لوٹی تو عالیہ بیگم نے ہی اسے ساجدہ بیگم کے متعلق بتایا جو کہ شہزاد صاحب سے فلک کو خاور کے لئے مانگنے آئی تھیں۔

”بیٹا! ہم نے آج تک تمہاری ہر خواہش کو پورا کیا ہے خواہ اس کے لئے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑا لیکن اس معاملے میں تمہارے ابو بہت مجبور ہیں وہ بھی اپنی بہن کو انکار نہیں کر سکیں گے میں جانتی ہوں خاور کی حرکتیں ٹھیک نہیں ہیں لیکن بیٹا شادی کے بعد وہ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا اور دوسری بات یہ کہ تم ہمارے قریب ہماری نظروں کے سامنے ہی رہو گی“۔ عالیہ بیگم نے چاہتے ہوئے بھی اسے خاور علی کے لئے رضامند کر رہی تھیں اور ایسا وہ صرف اور صرف شہزاد صاحب کی خوشی کے لئے کر رہی تھیں۔

”امی! میں کچھ نہیں جانتی ایک اوباش شخص کے حوالے کر کے آپ میری بہتری کی امید رکھ رہی ہیں

نہیں..... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی ابو چاہیں تو میرا گلا گھونٹ دیں لیکن میں خاور علی کو ہرگز قبول نہیں کروں گی“۔ وہ آنکھوں میں آنی نمی کو بری طرح رگڑتی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی اس خیال سے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ عا م ر ض ا کو قبولیت کی سند دے دے دوسری تیل پر ہی عا م ر ض ا نے کال پک کر لی تھی۔

”ع..... عا..... عا م ر ض ا.....“ فلک بری طرح رو دی تھی۔

”فلک..... فلک کیا ہوا.....؟ سب ٹھیک تو ہے ناں.....؟ تم رو کیوں رہی ہو.....؟“ عا م ر بے چینی سے بولا تھا۔

”عامر! تم نے کل رات جو مجھے کہا تھا مجھے منظور ہے..... میں کورٹ میرج کرنے کو تیار ہوں میں صرف تمہاری ہوں پلیز.....“ وہ سیل فون ایک طرف پھینک کر چہرہ دونوں ہاتھوں میں لئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی عا م ر نے فاتحانہ نظر موبائل پر ڈالی دو سال کی محنت بلا خر تک نہ ہی آئی تھی۔

”ہر لڑکی محبت کی پیاسی ہوتی ہے کوئی دو بول اس کے ساتھ پیار کے کیا بول دے وہ دل و جان سے اس کی ہو جاتی ہے ماں باپ عزیز رشتے دار ہر ایک کی عزت کو داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہو جاتی ہے لیکن فلک شہزاد..... تم تو میری.....“ عا م ر بھی زیادہ بے وقوف نکلیں مجھے دیکھئے بنا مجھ سے بے نیاز رہنے اس قدر پاگل ہو گئیں تف نے بار تم پر..... عا م ر رضامند کارانہ مسکراہٹ کے ساتھ مسلسل..... گم تھا۔

☆.....☆.....☆.....

”خاور علی! تم ایک گھٹیا اور کینے شخص ہو یہ تو میں روز اول سے جانتی ہوں لیکن تم اس قدر ڈھیٹ اور ڈھیل ہو گے اس بات کا اندازہ نہیں تھا مجھے تم جیسے لوز کرکیتز کے ساتھ ”فلک شہزاد“ ایک پل بھی گزارنا اپنی توہین سمجھتی ہے اور تم پوری زندگی بتانے کے خواب دیکھ رہے ہو۔“ فلک کی زبان آگ برسا رہی تھی وہ کالج سے واپسی

پر سیدھی خاور علی کے گھر گئی تھی اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور اسے آئینہ دکھانے۔

”میں لوز کرکیتز ہوں ایک گھٹیا ذلیل کینہہ شخص ہوں چلو ٹھیک ہے فلک بی بی! مان لیا اب ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم خود کو کس کیکٹری میں رکھتی ہو.....؟“ خاور علی اس کے بالکل سامنے آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

”میرے پاس تمہاری کسی بھی فضول بکواس کا جواب نہیں ہے میں صرف یہ کہنے کے لئے یہاں آئی ہوں کہ آئندہ بچھو کو اس مقصد سے مت بھیجتا، ویش فائل“۔ وہ بے حد خطرہ ہو رہی تھی۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے ٹھیک ہے میں ای کو اب نہیں سمجھوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم خود آؤ گی مجھ سے شادی کرنے“۔ خاور علی اس کے بے حد قریب ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تھا۔

”یہ کیا بے ہودہ پن ہے.....؟“ فلک چند قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”یہ کوئی بے ہودہ پن نہیں ہے یہ تو تمہاری حقیقت ہے فلک بی بی“۔ وہ عجیب سے انداز سے مسکرایا تھا۔

”کسی حقیقت..... آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟“ فلک شہزاد کو اس کی آنکھوں سے عجیب وحشت ہو رہی تھی نہ جانے کیوں اسے آواز کچھ شناسا جی لگ رہی تھی خطرے کے سائرن اس کے ذہن میں بجنا شروع ہو گئے تھے۔

”جانتا چاہتی ہو اپنی اصلیت.....؟“ خاور علی نے پل بھر میں اپنا موبائل اٹھایا تھا۔

”یہ رہے تمہارے سب میسجز..... ایک ایک میج تمہارا Save ہے یہ ہیں تمہاری ریکارڈ فون کالز جو تم اپنے ماں باپ سے چھپ کر رات رات بھر مجھے کرتی تھیں اور یہ..... یہ ہر تمہاری نظروں کے سامنے تمہارا عا م ر ض ا میں ہی ہوں میری بے وقوف سی فلک..... اب بیٹو اپنی شرافت کا ڈھنڈورا“۔ خاور علی نے ایک بلند قبضہ لگایا تھا فلک شہزاد کو آج صبح معنوں

میں پتہ چلا تھا کہ پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک جاتا ہے کہتے ہیں موت سے پہلے موت کا آنا کیا ہوتا ہے وہی لہجہ تھا وہی آواز..... مگر یہ عا م ر ض ا نہیں..... یہ تو..... یہ تو خاور علی ہے..... خاور علی تم نہیں.....“ فلک ہذیانی کیفیت میں چلائی گئی۔

”عا م ر ض ا نہیں ہو سکتے خاور خدا کے لئے“ میرا سب کچھ لئے لؤ مجھے جو جی میں آئے کہہ لو لیکن خدا کے لئے ایسا مت کہو کہ تم عا م ر ض ا ہو۔“ فلک گھٹنوں کے بل اس کے پیروں میں بیٹھ گئی تھی۔

”سب کچھ ہی تو لوٹ گیا تھا مان..... بھروسہ..... اتنا..... خواب..... بری طرح توڑ پھوڑ ہو رہی تھی اس کے اندر..... محبت جیجی رہی تھی چلا رہی تھی دل دھانڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

”میرا خیال ہے فلک شہزاد! کہ اب کچھ بھی کہنے سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی اٹھو..... گھر جاؤ..... اور جا کر اپنے والدین کو بتاؤ کہ تم اس رشتے پر راضی ہو۔“ وہ بے حد سفاکی سے کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اس کے صبح چہرے سے آنسو سترا تر بہہ رہے تھے لمبی گھنیری پلکوں کے نیچے کالی سیاہ آنکھیں ماتم کناں تھیں گلابی خوبصورت تراشیدہ لب ہولے ہولے کانپ رہے تھے اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا وہ اپنے والدین کے اعتبار کا خون کرنے جا رہی تھی لیکن زندگی نے اسے ایسا دھوکہ دیا تھا کہ وہ ریزم زیرہ ہو گئی تھی قرآن پاک کی ایک آیت مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔

”بریں عورتوں کے لئے برے مرد ہیں اور پاکیزہ عورتوں کے لئے پاکیزہ مرد“۔

بے شک خدا بہترین فیصلہ کرتا ہے اس کی آنکھوں سے محبت اشکوں کی مانند بہہ رہی تھی مگر کے کی ہر چیز اس کے ساتھ ماتم کناں تھی وہ جی داماں گھر کی طرف لوٹی تھی۔

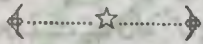
فہار زندگی

”پلیز چپ ہو جاؤ دیکھو کیا حالت بنا رکھی ہے لوٹ کر نہیں آسکتے ناں اگر تم خود روتی رہو گی تو اپنی قسمت کو جو منظور تھا وہ ہو گیا ہے جانے والے تو بڑے پامی کو کون سنبھالے گا انہوں نے اپنے



تو وہ کیسے نبھائیں اپنا وعدہ۔“

”زندگی میں ایسا ہی کیوں ہوتا ہے جسے ہم سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں جنہیں کھونے سے ڈرتے ہیں وہ ہی ہم سے دور چلے جاتے ہیں کیوں زندگی ان سے بے وفا کی کر جاتی ہے زندگی بے وفا کیوں ہوتی ہے زمین.....؟“ نگین زمین سے سوال کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی زمین اسے بے بسی سے روتے ہوئے دیکھتی رہی کہ اس کے سوا وہ کبھی کچھ نہیں سکتی تھی کہ قسمت کا لکھا کوئی بدل نہیں سکتا۔



اکھوتے بیٹے کو کھو یا ہے اب تم ہی انہیں سنبھال سکتی ہو اور کیا تم طلحہ بھائی سے کیا ہوا وعدہ بھول گئی ہو جو ان سے تم نے کیا تھا کہ تم طلحہ بھائی کے مٹی پیا کا خیال رکھو گی، کیا تم طلحہ بھائی سے کیا ہوا وعدہ نہیں بھلاؤ گی بتاؤ توڑ دو گی اپنا وعدہ؟“ زمین نے روتی ہوئی نگین کو چپ کرانے کی کوشش کی۔

”کیوں مانو میں اس کا وعدہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے کیا وہی تو کہتا تھا کہ وہ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا بتاؤ زمین کیوں توڑ اپنا وعدہ اس نے۔“

”دیکھو! جب زندگی نے ہی اسے مہلت نہیں دی“



”السلام علیکم! ایسا کیا سوچا جا رہا ہے کہ آپ کو میرے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی کیا میرے بارے میں سوچ رہی تھیں.....؟“ طلحہ نے مسکراتے ہوئے نگین کو پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ خلاف توقع طلحہ کو سامنے دیکھ کر نگین کھل اٹھی۔

”نہیں وہ تو میں بس۔“

”اچھا تو یہ تھی آپ کی اداسی کی وجہ جن کے آنے کے فوراً بعد ہی آپ کے چہرے کی رونق لوٹ آئی ہے۔“ زمین نے اچانک انٹری دیتے ہوئے نگین کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا جس پر طلحہ نگین کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”اچھا جی! تو آپ اس لئے ہی اتنی گم ہوئی تھیں اپنے خیالوں میں۔“ طلحہ نے نگین سے پوچھا۔

”اور تم ہمیشہ غلط وقت پر ہی انٹریوں ہوتی ہو کبھی تو ہمیں اکیلے میں بات کرنے کا موقع دے دیا کرو۔“

طلحہ نے اسے مصنوعی غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”ذرا صبر کیجئے طلحہ بھائی! بھتے بھری بات ہے پھر جتنی دل چاہے اکیلے میں بات کر لیجئے گا شادی کے بعد ادا کرے۔“

”تم لوگ بیٹھو میں پاپا کو بلا کر لاتی ہوں۔“ اس نے دیکھا کہ ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں تو وہاں سے جانے میں ہی عافیت جانی۔

”او کے! جاؤ پروا بس آ جانا۔“ زمین نے کہا۔

”بھائی کیا ہو رہا ہے آپ کو! آپ ٹھیک تو ہیں.....؟“ نگین نے جب زمین کی گھبراہٹ ہوئی تو آواز سنی تو فوراً پلٹ کر دیکھا اور اپنی جگہ سے بھاگ کر فوراً طلحہ کے پاس آئی۔

”طلحہ..... طلحہ کیا ہوا آپ کو.....؟“ نگین نے سخت مضطرب ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے پوچھا جو شدت درد سے اپنے سر کو پکڑ رہا تھا۔

”طلحہ! پلیز! بتائیے ہمت کیجئے طلحہ۔“ نگین نے روتے ہوئے طلحہ کو دیکھ کر کہا۔

”کچھ نہیں..... وہ.....“ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا ہے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا نگین تو اپنی جگہ ساکت ہو گئی اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”زمین! تم رو کیوں ابھی پاپا کو بلا کر لاتی ہوں۔“

نگین کہتے ہوئے جلدی جلدی پاپا کے کمرے کی سائیڈ جانے لگی اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی طلحہ اور زمین کے ہنسنے کی آواز سن کر پلٹ کر دونوں کے مسکراتے چہروں کو بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ جو ہنستے ہوئے اس کے سامنے آ کر رک گئے۔

”اؤں.....! تم تو واقعی میں ڈر گئیں! میں تو مذاق کر رہا تھا یہ دیکھنے کے لئے کہ تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو اور مجھے اس حالت میں دیکھ کر کیساری ایکٹ کرتی ہو اگر واقعی میں مجھے علم ہوتا کہ تم اتنا گھبرا جاؤ گی.....“ اس سے پہلے کہ طلحہ اپنی بات مکمل کرنا نگین روتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی یہ دیکھ کر دونوں کے مسکراتے ہوئے لب ایکدم ختم گئے۔

دن کے دس بجے اس کی آنکھ کھلی تو سر درد کی وجہ سے پھٹ رہا تھا رات بھر رونے کی وجہ سے آنکھیں بھی سوج گئی تھیں طلحہ نے جو اس کے ساتھ مذاق کیا تھا اس کی وجہ سے دل بہت دکھا تھا زمین نے بھی سو رنی کہنے کے لئے بار بار دروازے کو ٹاک کیا تھا پر اس نے دروازہ نہ کھولا تو وہ مایوس واپس پلٹ گئی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے ممی چٹا گھر پر نہیں ہیں ورنہ میری سوچی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر وجہ ضرور پوچھتے۔“ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور شاد رہنے چلی گئی۔

”ناراض ہو مجھ سے.....؟“ نگین جو شاد رہنے کے بعد اپنے بالوں کو سکھانے میں مگن تھی طلحہ کی آواز پر پلٹ کر دیکھا تو وہ اسے اپنی آنکھوں کے حصار میں لئے پوچھ رہا تھا، نگین نے خفگی سے اپنا

رخ موڑ لیا اور کمرے سے باہر آ کر ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔

”پلیزنگی! جو مرضی سزا دو منظور ہوگی! لیکن پلیز ناراض مت ہو مجھ سے.....؟“ طلحہ نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے پتلی لہجے میں کہا۔

”میری ناراضی سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے کیا لگتی ہوں میں آپ کی.....؟“ آنسوؤں پر اختیار نہیں رہا تھا بہت شدت سے روتے ہوئے وہ بولی تو طلحہ کو بھی دکھی کر گئی۔

”سب کچھ..... میری سب کچھ تم ہی ہو تمہاری ناراضی سے مجھے اتنا سروکار ہے کہ میں اسے سہہ نہیں پاؤں گا بالکل بھی نہیں۔“ وہ اسے شانوں سے تھام کر احساس بے بسی سے بولا تھا۔

”ہاتھ مت لگائیے مجھے..... نہیں..... چھوڑیں۔“ اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر وہ آگے بڑھنے کو بھی کہ طلحہ نے سامنے آ کر جانے سے اسے روک لیا۔

”بس کرونگی! بس کرو جان نہیں سہہ پاؤں گا تمہاری یہ ناراضی مرا جاؤں گا قسم سے مرا جاؤں گا۔“ اس کے سامنے کھڑے ہو کر سرگوشی نما الفاظ نکلتی تھیں ڈبو کر کہنے لگا اس کے ہر لفظ سے نگین عیاں ہو رہی تھی نگین کے رونے میں اور تیزی آ گئی۔

”انتہا سے زیادہ برے ہیں آپ! پہلے تکلیف دیتے ہیں پھر خود ہی مرنے کی بات کرتے ہیں۔“ نگین نے روتے ہوئے کہا۔

”کیا سزا دو گی.....؟“ طلحہ نے اس کے مان جانے پر سکون کا سانس لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”سزا کوئی نہیں پر اگر آج کے بعد ایسا مذاق کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا، کبھی بات نہیں کروں گی میں آپ سے اپنی جان ہی ختم کر لوں گی۔“ اس کو دیکھتے ہوئے نگین نے وارن کیا تھا۔ اس کی بات پر طلحہ سنجیدہ ہو گیا۔

”ذرا سا روٹھ جانے پر اتنی خوشامد

وہی تم بگاڑو گے عادت ان کی“

زمین جو کب سے دروازے پر کھڑی دونوں کی باتیں ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی مبرنہ ہوا تو آخر کار انٹری دے ہی دی دونوں زمین کے شعر کو سن کر مسکرانے لگے۔

☆.....☆.....☆.....

احمد آفس کا فیئر جو کسی کام سے آفس میں آیا تھا طلحہ کو کراہتے ہوئے اور درد کی وجہ سے سر کو تھامتے دیکھ کر جلدی سے طلحہ کے پاس آیا۔

”کیا ہوسرا! آپ ٹھیک تو ہیں.....؟“ احمد نے فکر مندی سے پوچھا طلحہ کوئی جواب دیتا کہ اس سے پہلے وہ اپنے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے زمین پر گر کر دنیا سے بے گانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆.....

”مما آپ رو کیوں رہی ہیں اور میں یہاں کیسے آیا.....؟“ طلحہ نے ہوش میں آتے ہی سب کو اپنے سامنے پا کر اور ماما کو روتے ہوئے دیکھ کر کہا، طلحہ اگلوں بیٹا تھا اس لئے سب ہی اس سے بہت پیار کرتے تھے اس کے سوال پر اس کی ماں نے سارا واقع اسے بتا دیا جو آفس کے فیئر نے ہسپتال سے فون کر کے انہیں بتایا تھا۔

”اوہ ہومما! آپ سب لوگ تو دیسے ہی پریشان ہو رہے ہیں معمولی سسر درد تھا جواب بالکل ٹھیک ہو چکا ہے دیکھئے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ طلحہ نے ماں کو چپ کرواتے ہوئے کہا۔

”حد ہوتی ہے طلحہ! لاپرواہی کی بھی نہ دن کی فکر نہ رات کی کھانے پینے کی بھی فکر کرنا چھوڑ دیجئے ہو اور نہ ہی آرام کرتے ہو پیسے کمانے کے لئے کم از کم انسان کو اپنی صحت کا تو خیال رکھنا چاہئے یہ کیا کام ہی کرتے رہو طبیعت خراب نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا۔“ طلحہ کے مطمئن چہرے کو دیکھتے ہوئے آمنہ بیگم (طلحہ کی ماں) اس پر برس پڑیں۔

”بابا پلیز! آپ ہی ماما کو سمجھائیے میں بالکل ٹھیک ہوں معمولی سا درد تھا جو ٹھیک ہو چکا ہے۔“ طلحہ نے اپنے والد کو مدد کے لئے پکارا۔

”سوری بیٹا! میں اس معاملے میں کچھ نہیں بول سکتا! آپ کی ماما ٹھیک بول رہی ہیں آپ کی شادی کو بھی صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے اور آپ پھر بھی آفس میں لگے ہوئے ہو۔“ ولید حسن (طلحہ کے والد) نے بھی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا، طلحہ ان کی آخری بات سن کر سانسے کھڑی نگین کو دیکھ کر مسکراتے لگا، نگین نے جب دیکھا کہ طلحہ کی نگاہیں اس پر مرکوز ہیں تو اس نے رخ موز لیا یہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ بھی آمنہ بیگم کے ساتھ ہے۔

☆.....☆.....☆.....

ولید حسن اور نوید حسن دو ہی بھائی تھے یاں باپ کے انتقال کے بعد ولید حسن نے نوید حسن کو کبھی ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور باپ کا فرض پورا کیا ادھر آمنہ بیگم نے بھی نوید کا ماں جیسا پیار دیا! آمنہ بیگم نے اچھی سی لڑکی دیکھ کر نوید کی شادی کر دی! نفیسہ بیگم (نوید کی بیوی) نے گھر کی ذمہ داریوں کو بہت اچھے طریقے سے سنبھال لیا، ایک سال بعد جب ولید حسن کے لڑکا پیدا ہوا اور نوید کے یہاں بیٹی ہوئی تو دونوں بھائیوں نے اور ان کی بیگم نے مل کر دونوں بچوں کو خوشی خوشی ایک بندھن میں باندھنے کا فیصلہ کر لیا جس پر سب ہی خوش تھے، تینوں بچوں میں بہت محبت تھی کہنے کو دونوں بھائی الگ الگ رہتے تھے مگر تینوں بچے ایک ہی جگہ پائے جاتے تھے، ولید کے صرف ایک ہی بیٹا طلحہ جبکہ نوید کے صرف دو بیٹیاں تھیں نگین اور زین، تینوں بچے جیسے جیسے شعور کی زندگی میں قدم رکھتے گئے ان میں محبت بھی بڑھتی گئی جب نگین اور طلحہ کو بڑوں کے فیصلے کی خبر ہوئی تو دونوں بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ ان کے دل کی بھی خواہش تھی، جب زین کو پتہ چلا تو وہ تو

چبائے لگی کیونکہ وہ طلحہ کو اپنا بھائی مانتی تھی اور یہ ہی سوچتی رہتی تھی کہ پتا نہیں اس کی بھائی کسی آئے گی وہ طلحہ کو بدل نہ دے لیکن اس کا یہ وہم بھی ختم ہو گیا، سب کی زندگی بہت خوشگوار طریقے سے چل رہی تھی مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ کبھی بھی انسان کو ایسے حالات کا اچانک سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

☆.....☆.....☆.....

”کیا ہوا گئی! میں کب سے تم سے بات کرنا چاہ رہا ہوں لیکن تم بات ہی نہیں کر رہی ہو کیا ناراض ہو مجھ سے؟“ نگین جو کچن میں کچھ رکھنے آئی تھی طلحہ نے اکیلے دیکھ کر اسے روک کر پوچھا تو وہ رو نہ سکی۔

”کیا ہوا گئی! تم رویوں رہی ہو.....؟“ طلحہ نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

”طلحہ! مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ زندگی ہم سے وفا نہیں کرے گی! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی طوفان آنے والا ہے جو سب کچھ بہا کر لے جائے گا ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گا۔“ نگین نے اپنے دل میں چھلے ہوئے وہم طلحہ کو بتاتے ہوئے مسکراتے لگا۔

”سب تمہارا وہم ہے کچھ نہیں ہوگا دیکھنا ہم سب بہت خوش رہیں گے، تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم سارے وہم بھول جاؤ گی۔“ طلحہ نے کہا۔

”یاد سے لے لینا۔“

”اوکے باس لے لوں گا۔“ طلحہ مسکراتے ہوئے کمرہ کر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆.....

دونوں کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی، نگین ولید بنی بہت پیاری لگ رہی تھی ہر کوئی دونوں کی جوڑی کو دیکھ کر سراپے بغیر نہیں رہ پا رہا تھا، نگین کی رخصتی بہت دھوم دھام سے ہوئی، نگین ولید بنی طلحہ کے بیڈروم میں بیٹھی طلحہ کا انتظار کر رہی تھی آج پتا نہیں کیوں اسے بے چینی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

”اب ہو گئے تمہارے سارے وہم ختم.....؟“ نگین اپنی ہی سوچوں میں گن گئی کہ طلحہ کی بات پر سامنے کھڑے مسکراتے ہوئے طلحہ کو دیکھنے لگی۔

”گئی! آج تمہارے سارے وہم ختم ہوئے کہ نہیں بتاؤ مجھے.....؟“ طلحہ نے نگین سے پوچھا۔ تو وہ خاموش رہی کہ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے تب ہی طلحہ بولا۔

”میں تمہیں کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑوں گا گئی! تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا، میں تمہیں زندگی کی.....“ طلحہ کچھ اور بھی کہتا کہ بڑھتے ہوئے سر کے وردنے اسے کچھ بولنے ہی نہ دیا اور وہ سر کو بری طرح تھام کر کرانے لگا۔

نگین نے جب دیکھا کہ طلحہ کو بہت زیادہ درد ہو رہا ہے تو بڑے می پیسا کو آواز دینے لگی سب کو بلانے کے لئے باہر جانے لگی تھی کہ طلحہ کے گرنے کی آواز سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو طلحہ کو بے ہوش دیکھ کر اپنی جگہ ساکت ہو گئی، طلحہ کو اس حال میں دیکھ کر زور زور سے سب کو آواز دے کر بلانے لگی اور طلحہ کو بلانے لگی کہ شاید وہ ہوش میں آجائے لیکن طلحہ کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی اتنے میں سب ہی کمرے میں آ گئے اور فوراً طلحہ کو ہسپتال لے کر جانے لگے۔ لیکن ہسپتال میں ڈاکٹر نے انہیں یہ خبر سنائی کہ طلحہ کو برین ٹیومر تھا

جس کا اسٹائج تھا۔

”ہم اپنی کوششوں کے باوجود اسے نہیں بچا سکے آئی ایم سوری۔“ یہ خبر سن کر سب کو ایسے لگا جیسے ان سب کے پاؤں کے نیچے سے کسی نے زمین چھین لی ہو اور روٹی ہوئی نگین یہ خبر سن کر بے ہوش ہو کر نیچے گر گئی اس کے بعد اس کو کوئی ہوش نہ رہا اس کے بعد اسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ طلحہ کو گھر کیسے لے جایا گیا کیسے اسے اس کے آخری سفر پر رخصت کیا گیا، پورے دس دن بعد اسے ہوش آیا تھا لیکن ہوش آنے کے بعد بھی نہ وہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں سب نے اسے رلائے کی کوشش کی پر اس کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلا۔

☆.....☆.....☆.....

”تم نے تو وعدہ کیا تھا ناں کہ میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑو گے پھر تم نے اپنا وعدہ کیسے پورا نہیں کیا تم تو میری آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے آج دیکھو میرے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے پلیز طلحہ واپس آ جاؤ اپنی گئی کی خاطر۔“ زین جو نگین کو کھانا کھلانے کے لئے کمرے میں آ رہی تھی نگین کو روتے اور شکوہ کرتے دیکھا تو اس کی بھی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے زین جو طلحہ کو اپنا بھائی سمجھتی تھی ایک طرف بھائی کا غم تو دوسری طرف بہن کی حالت کو دیکھ کر بالکل ہی نڈھال ہو گئی۔

”کاش..... طلحہ بھائی آپ نے اپنی بیماری کو معمولی نہ سمجھا ہوتا تو آج آپ ہمارے ساتھ ہوتے۔“ اکثر ہم اپنی بیماری کو معمولی سمجھ کر فراموش کر دیتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے ہماری موت کا سبب تو بنتی ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ ہمارے پیاروں کو بھی دکھی کر جاتی ہے اگر لوگ اپنی بیماریوں کو معمولی سمجھ کر فراموش نہ کریں تو یہ ان کے فائدے کا سبب ہی بنتی ہے نہ کہ نقصان کا۔

☆.....☆.....☆.....

عابدہ سلیم

مکمل ناول

قہار بن نہیں رہنا

آج پھر جب وہ مہمان سے ملنے آیا تو اسے وہاں موجود دیکھ کر اس کے ماتھے پر کتنی ہی شکنیں در آئیں تھیں، اس کے وجود کو قطعی اکتور کرتا وہ مہمان کے سر ہانے آکھڑا ہوا۔



”گنڈا اینٹک مہمان! اب کیسا فیل کر رہی ہیں؟ حالانکہ اس کا مسکرانے کا موڈ بگڑ گیا تھا، مگر پھر بھی مہمان کے خیال سے اس نے زبردستی مسکراہٹ لبوں پر بچائی۔

”بہت بہتر فیل کر رہی ہوں مائی سن!“ مہمان نے بھی اسے اسکل کے ساتھ جواب دیا تھا۔

”اوکے آئی! میں چلوں، آپ کو ضرورت ہو تو پلیز ضرور بلوا لیجئے گا، میں پھپھو کے پاس ہوں۔“ صاحب نے اپنے انہی نرم لہجے میں کہا تھا اور پھر آنکھ کر دم سے نکل گئی۔

”صحنیکس!“ از میر نے شکریہ ادا کیا پھر مہمان سے مخاطب ہوا۔

”مہمان! یہ کیا مصیبت گلے میں ڈال لی ہے آپ نے، جب بھی آؤ اس کی شکل دیکھو، کیا ضرورت ہے آپ کو اس طرح کے لوگوں کو منہ لگانے کی؟“

”از میر! بڑی بات ہے! کیسی بات کر رہے ہیں آپ، وہ تو اتنی معصوم اور پیاری بچی ہے، سارا دن تم نہیں ہوتے تو وہ میری کیئر کرتی ہے، حالانکہ کیا رشتہ ہے اس کا اور میرا، صرف انسانیت کا ناں اور وہ اپنی پھپھو کی کیئر کے لیے



ہاسپٹل میں ہے، مگر مجھے ہر منٹ کے بعد پوچھنے آتی ہے۔

”ارے ممّا! آپ نہیں جانتیں لوگوں کو، محض آپ کی نرم مزاجی اور سادہ طبیعت کا فائدہ اٹھا رہی ہے وہ، پلیز آپ احتیاط برتا کر، آج کل کے حالات سے واقف ہیں ناں آپ، کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے ہم۔“

”یہاں ہاسپٹل میں میرے ساتھ پر نہیں لکھا تھا کہ میں ”حیدر ایڈکوانٹر پرائز“ کے اوپر کی ماں ہوں از میرا اور میں نے اتنی زندگی گزار دی ہے، اچھے بُرے انسان کی پہچان رکھتی ہوں میں بھی، میں کسی کے خلوص کو تمہاری طرح دھتکار نہیں سکتی۔ ممّا! امان گئیں تھیں، وہ مزید بحث کے بجائے خاموش ہو گیا۔

”اوکے، جیسے آپ کی مرضی۔“

”اچھا یہ بتاؤ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں، کب جاؤں گی میں گھر؟ میں تنگ آگئی ہوں بیٹا!“

”ممّا! ایک دو دن مزید لگ جائیں گے، بہت کمزوری ہے آپ میں، پلیز آپ میری خاطر برداشت کر لیں۔“

”چندا! مجھے لگتا ہے کہ ہاسپٹل میں رہ کر میری طبیعت مزید خراب ہی ہوگی، مجھے یہاں کے ماحول میں لحد بھرکا سکون نہیں آتا، اگر صاحب نہ ہوتی تو شاید میں کب کی مر جاتی یہاں۔“

”ممّا! پلیز! اس طرح مت کہا کریں، آپ جانتی ہیں ناں کہ میں!...“ وہ سمجھ سکتی تھیں کہ ان کو لے کر وہ کس قدر حساس ہے، اتنی بھری دنیا میں وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے سب کچھ تھے۔

”اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے ممّا! ایسی باتیں مت کیا کریں، آپ کے سوا ہے کون میرا؟“

”اسی لیے تو کہتی ہوں کہ شادی کرلو، بیوی بچے ہو جائیں گے تو تمہاری اور میری دونوں کی تنہائی دور ہو جائے گی۔“

”ہاں، جیسے سیر بھی کی ہوئی تھی، ممّا! پلیز آئی ہیٹ ڈس ٹا پک، ایک تجربہ کافی نہیں تھا آپ کے لیے؟“ اس کے لیے میں کئی اتر آئی تھی۔

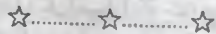
”ضروری تو نہیں کہ ہر لڑکی ویسی ہو، اچھی بُری ہر طرح کی لڑکیاں ہیں، بس سیر کے ساتھ جو ہوا، وہ شاید ہمارا نصیب تھا۔“

”مگر میں محض نصیب کا لکھا سمجھ کر سب فراموش نہیں کر سکتا، مجھے نفرت ہے لڑکیوں سے اور یہ بات آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں۔“

”از میرا! تم ساری عمر تنہا کیسے گزارو گے؟“

”اوہ گاڈ! ممّا! پلیز! یہ باتیں کرنے کے لیے ہم انتظار کر سکتے ہیں، ایک عمر بڑی ہے، آپ کم از کم ہاسپٹل میں تو اس ٹاپک کو کھڑو کر دیں۔“ وہ مسکرا دیں، سچ ہی تو کہہ رہا تھا، گھر پر بھی جب وہ میسر آتا اپنی بے جا مصروفیت سے اگر کبھی وقت نکال لیتا، تو وہ اس بحث کو لے کر بیٹھ جاتا اور از میرا کتا کرموڈ خراب کر کے اٹھ جاتا، وہ اتنا روڈ تھا نہیں، مگر اس کے ساتھ حادثہ ہی ایسا پیش آیا تھا کہ وہ ہر انسان سے اپنا اعتبار کھو بیٹھا تھا، یہ بات وہ سمجھ سکتی تھیں، صدمہ تو ان کے لیے بھی چھوٹا نہیں تھا، از میرا نے اگر اپنا بھائی کھویا تھا تو انہوں نے اپنے جوان بیٹے کی موت کا درد اپنے دل کے اندر کہیں چھپا رکھا تھا، از میرا کے خیال سے وہ بظاہر سب بھول چکی تھیں، مگر کیا ایک ماں کے لیے جوان اولاد کی موت بھول جانا ممکن ہے؟ وہ بھی حادثاتی موت نہیں، سوچی سمجھی پوری پلاننگ کے ساتھ دی جانے والی موت۔

آج وہ ڈسچارج ہو رہی تھیں، صاحب ان سے ملتے ہوئے رو پڑی تھی۔



”میں نے بہت کم لوگ دیکھے ہیں آپ جیسے، بے غرض اور پُر خلوص، اور انہی میں آپ کو عمر بھر نہیں بھول پاؤں گی، آپ بہت اچھی ہیں، پلیز! اپنا خیال رکھا کریں۔“

”یاد تو تم بھی مجھے بہت آؤ گی، اس زمانے میں اتنی سادگی اور اتنے اچھے اخلاق کی مالک بیٹی لی ہو تم مجھے، ورنہ اس نئی نسل پر سے میرا اعتماد ختم ہو چکا ہے صاحب! مگر ان چند دنوں میں تم سے مل کر مجھے لگا کہ ابھی اچھے لوگ باقی ہیں، تمہارے ماں باپ جیسے، جنہوں نے تمہیں اتنے اچھے اقدار دیئے، تمہاری اعلیٰ تربیت کی۔“

”تھنک یو سوچ آئی! مگر وہ ماں باپ مجھے اس بُرے زمانے کے سپرد کر گئے، تنہا چھوڑ گئے، اپنی وے، آپ مجھے اپنا کونٹیکٹ نمبر دیں؟ کبھی دل چاہا تو آپ سے لمحے دو لمحے کے لیے بات کر لیا کروں گی، آئی نو، آپ کے بیٹے کو یہ اچھا نہیں لگے گا، مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر آنے والی نفرت اور غصہ میں دیکھ چکی ہوں، مگر پھر بھی۔“

”ارے تم از میرا کے روڈ بی بیویز کو پلیز دل پر مت لینا، وہ اپنی عادت سے مجبور ہے اور بس۔“ انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپاتے تھے پھر اسے اپنا سیل فون نمبر دے دیا، وہ از میرا کے خیال سے جلدی سے آئی سے نمبر لے کر انہیں اللہ حافظ کہہ کر فہاں سے پیچھو کے پاس آگئی، مگر راستے میں ہی وہ بد اخلاق انسان اسے ٹکرا گیا، جسے قطعی اگور کرتی وہ آگے بڑھتی تھی، اس شخص کی آنکھوں میں جو نفرت اسے اپنے لیے نظر آئی تھی وہ صاحب کو جانے کیوں خوفزدہ کرتی تھی، حالانکہ اس نے تو از میرا کا لگاؤ ابھی کچھ نہیں تھا، صرف آئی کے ساتھ وہ کچھ وقت گزار چکی تھی۔ ہاسپٹل کے اس ماحول میں اس کی گھٹن کم ہو جاتی تھی، اپنی طرف سے تو وہ آئی کے ساتھ اچھا ہی کرتی تھی، ان کا خیال رکھتی تھی، جانے ان کے بیٹے کو یہ بات کیوں پسند نہیں تھی؟ خیر! اب تو قصہ ہی ختم ہو گیا تھا، آئی اسے گھر جا رہی تھیں اور کل پیچھو کو بھی چھٹی مل جانی تھی، وہ پیچھو کے بیڈ کے پاس بیٹھی ان کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی کہ ان کی آواز نے چونکا دیا۔

”صاحب! تم خاموش ہو؟“

”نہیں پیچھو! بس وہ....“

”مجھے پتہ ہے تم آگیا جاتی ہو، دل چاہ رہا ہے تو گھر ہواؤ، میں رہ لوں گی کچھ دن تنہا۔“

”ارے نہیں پیچھو! صبح تو آپ ڈسچارج ہو جائیں گی، بس آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔“ وہ مسکرا دی، پیچھو اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور خلوص خاموشی سے دیکھنے لگیں، اپنی گوی بہت بڑی تھیں، مگر اپنے خاوند کے روکے رویے کی وجہ سے جب وہ صاحب کو اُداس دیکھتی تھیں، تو بہت دلی دکھتا تھا، اگر صاحب کا کوئی اور آسرا ہوتا تو وہ اپنے گھر کے گھٹن زدہ ماحول میں نہ رہتیں، مگر ان کے ساتھ ساتھ شتاب کی وجہ سے مجبور بھی ان کے ساتھ رہنا پڑا۔ اب تو اس بے چارے نے پورے روز کی اس بحث سے ہار کر پرائیویٹ اسکول میں لٹری کر لی تھی، تین ہزار میں غنا تو کچھ نہیں تھا مگر اس کا کوشش ہوتی تھی کہ وہ پیچھو کو مزید پریشان نہ کرے، اس کی وجہ سے جو ہر وقت پیچھو کو باتیں سننا پڑتی تھیں وہ کچھ کم تو ہوں، وہ ساری نیلری پیچھو کو دے دیتی تھی، اور شام میں بھی کوئی پڑھانے سے جو غم ملتی وہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے رکھتی تھی، یوں کم از کم گھر میں قدرے سکون ہو گیا تھا، لیکن پیچھو اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھیں۔

”ایسا کب تک چلے گا از میرا! تم میری وجہ سے ذرا بھی ریسٹ نہیں کر سکتے، یہ بات مجھے بہت تکلیف دیتی ہے۔“

”ممّا! میں فل ٹائم لیڈی آپ کے لیے رکھنا چاہتا ہوں، مگر مجھے کوئی بھی قابل اعتبار نہیں مل رہی، میں رسک نہیں

لے سکتا۔

”تم اپنے دوست ڈاکٹر حماد سے بات کرو، وہ کوئی نرس....“

”مما! نرس صرف آپ کو میڈیکل ٹریٹمنٹ دے گی، تھراپی وغیرہ کرے گی، مگر میں ایسی کوئی لیڈی چاہتا ہوں جو دن رات آپ کا خیال رکھے۔“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، وہ تو مغلوب ہی ہو رہی تھی، بنا سہارے کے چلنے سے بھی نتائج اور کھانے سے بھی، ایسے میں واقعی انہیں ہمہ وقت کے لیے ایسے انسان کی ضرورت تھی جو مکمل طور پر ان کا دھیان رکھے، ساتھ ہی ان کی ایکسرسائز میں بھی ہیلپ کرے، از میرا کیلا کیا کیا کر سکتا تھا، وہ بھی انسان تھا، صبح وہ اکثر ان کی وجہ سے لیٹ ہو جاتا اور پھر رات بھر ان کے پاس رہتا کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے۔

”از میرا! ایسی ایک لڑکی ہے میری نظر میں، جو نہ صرف میرا پورا خیال رکھ سکتی ہے بلکہ مجھے اس پر مکمل بھروسہ بھی ہے۔“

”کون ہے ممما! وہ؟“

”سحاب! ان کے منہ سے نکلا نام سن کر از میر کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”مما! مجھے پہلے ہی شک تھا، وہ معصومہ بی بی آپ کو اپنی سادگی کے جال میں جکڑ چکی ہے، ممما! کیوں ایک بار پھر آپ دھوکہ کھانا چاہتی ہیں؟“

”نور از میر! اس بار دھوکہ تم کھا رہے ہو، وہ ایسی نہیں ہے، بہت بے غرض اور خلوص سے بھرا دل ہے اس کا، یقین کرو وہ بچی اتنی نیک فطرت ہے، بھلا ہسپتال میں اسے میری ذات سے کیا لالچ تھا جو وہ میری اتنی کیڑ کرتی تھی؟“

”یہ لالچ کم تھا کہ اس نے اپنی اس جالا کی سے آپ کے گھر راستہ استوار کر لیا؟“

”فصو رہتا رہا انہیں ہے میرے بچے! مگر پلیز! ہر انسان کو ایک نظر سے دیکھنا چھوڑ دو، جو ہمارے ساتھ ہو چکا وہ بھولنا میرے لیے بھی آسان نہیں، مگر اگر ہم انسانیت سے اپنا اعتبار کھودیں گے تو دنیا میں رہنا مشکل ہو جائے گا، اگر بڑے لوگ ہیں یہاں تو اچھے بھی ہیں، جن کی اچھائی اور نیکی کی وجہ سے انسانیت قائم ہے، فارگاہ سیک از میر! خود کو یوں تنہا مت کرو میرے بچے!“

”اگر آپ کو اس پر اتنا بھروسہ ہے تو بولا لیجئے اسے، مگر کل کو اگر کچھ ہوا تو....“

”میں اس کی گارنٹی لیتی ہوں، تم بس ایک بار مجھے اس کے گھر لے چلو۔“

”مما! میں کیا جانوں کہ....“

”اوکے۔“ انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا تھا، انہیں یاد آ گیا کہ جب سحاب نے ان سے فون نمبر لیا تھا تو اپنا نمبر بھی دیا تھا، انہوں نے اپنے موبائل کو ٹیکٹ نمبرز چیک کے لیے اور اگلے بل وہ سحاب کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔

”السلام علیکم! ان کی کال ریسپونڈ کرتے ہی خوبصورت آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

”علیکم السلام! تم سحاب ہونا؟“

”جی ہاں! آپ....؟“

”ارے اتنی جلدی بھول گئیں، تم تو کہتی تھیں آئی میں عمر بھر آپ کو یاد رکھوں گی۔“ اتنا تھکا ہوا تھا، وہ فوراً پہچان گئی۔

”آئی جی! کیسی ہیں آپ؟ آئی ایم سوری، میں آپ کی آواز سے آپ کو پہچان نہیں پائی۔“

”اٹس اوکے میری جان! اچھا میرا! اسن کر رہا ہے تم سے ملنے کو، مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتاؤ گی؟“

”رہنمائی! آپ میرے گھر آئیں گی؟“ وہ بہت اکیسا لڑھی، اس نے انہیں اپنا ایڈریس دیا اور وہ شام میں ہی

ان کے گھر تھیں، از میر حیدر کے ساتھ، آف کورس اس کا آنا ضروری تھا، بی کو زدہ اکیس نہیں آ سکتی تھیں، انہوں نے جب اس کی پھپھو اور پھپھا سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو، پھپھا اتنے خوش ہوئے کہ ان کے سر سے بوجھ ہٹ رہا ہے، مگر پھپھو تذبذب کا شکار تھیں، بالکل غیر انجینی لوگوں کے حوالے وہ اپنی جوان بیٹی نہیں کر سکتی تھیں، یہ کون سا اعتبار کا زمانہ تھا، ان کی نظر بس بار بار از میر تک جا کر پلٹ جاتیں، وہ شاید ان کی نگاہوں کا مطلب پڑھ چکی تھیں۔

”بے فکر رہیں بہن! سحاب میری بیٹی کی طرح رہے گی، اس کی عزت آبرو ہماری عزت آبرو ہے، میرا یقین کریں، آپ کی بیٹی میرے گھر میں بالکل محفوظ رہے گی، میری مجبوری سمجھ لیں، میں کسی غیر پر اعتبار کر کے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی، سحاب پر میرا بھروسہ ہے۔“

”ہم غریب ہیں آپ جی! مگر اس طرح کی نوکری کی اجازت.... وہ بھی جوان بچی کو؟“

”اوہو..... وہ کہہ تو رہی ہیں کہ وہ خیال رکھیں گی سحاب کا۔“

”مگر میرا دل نہیں مانتا، میں اپنے مرحوم بھائی کو کیا جواب دوں گی کہ میں ان کی ایک آخری نشانی کی بھی حفاظت نہ کر سکی، اپنے گھر میں جگہ نہ دے سکی۔“

”ارے، اس گھر میں جگہ ہے کب؟ اب تیرے بھائی بھادج خزانے چھوڑ نہیں مرے، جو ہم نے ان کی بیٹی کا ٹھیکہ لے لیا ہے، اپنے بچے پالنا مشکل ہیں اس دور میں، اوپر سے یہ مفت کا خرچہ۔“

”کب جو بھو جی ہے وہ تجھ پر؟ نوکری کرتی ہے، ساری تنخواہ تیرے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے، شام میں بچوں کو پڑھا کر اپنا خرچ نکالتی ہے، مفت میں وہ وقت کی روٹی تک نہیں کھاتی وہ تیری۔“

”پلیز پھپھو! بحث نہ کریں، میرے فیصلے نہیں بدلیں گے، آپ کے بحث کرنے سے۔“ اس نے پھپھو کے کندھے پر ہاتھ دھرا، پھر مشکل آنے والے آنسو اندر لیے تھے۔

”آئی جی! میں جانتی ہوں آپ کے ساتھ۔“

”سحاب....!“ پھپھو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں آپ سے ملنے آتی رہوں گی، پلیز پھپھو!“ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا، آئی اور از میر کے سامنے یہ حقیقت لانا وہ کبھی نہیں چاہتی تھی، مگر اب تو وہ سب جان چکے تھے، تو وہ نظریں اٹھانے کے قابل بھی نہ رہی، اس نے اپنا ضروری سامان بیگ میں ڈالا اور چند منٹ بعد وہ ان کے ساتھ جانے کو تیار تھی، گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے آخری نظر اس بوسیدہ دو

کمرے کے مکان پر ڈالی تھی، جس مکان نے بڑے وقت میں اسے آسرا دیا تھا، پھر چہرے پر پھیلنے والے آنسو دوپٹے میں جذب کر لیے، وہ جس احساس اور کیفیت سے گزر رہی تھی اس کے پیش نظر اس وقت گاڑی میں صرف خاموش تھی، اور اس کے خاموش آنسو جو روکنے کے باوجود بھی جانے کیوں اٹھانے کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

کئی دن لگے تھے دل کا بوجھ ہلکا ہونے میں، بھلا کب سوچا تھا اس نے کہ زندگی اسے یہ وقت بھی دکھائے گی کہ دنیا میں وہ بے آسرا ہو کر رہ جائے گی، مگر پھپھو کے ہوتے ہوئے وہ غیروں کے سہارے تھی، آئی نے اسے محبت سے سمجھایا، بہت مان دیا، اپنے ہونے کا احساس دلایا، مگر یہ حقیقت تو نہیں بدل سکتی تھی ناں کہ وہ کچھ بھی کرتے اس کے کبھی اپنے نہیں کہنا سکتے تھے اور نہ ہی وہ ان کو اپنا کہہ سکتی تھی، سحاب نے وقت اور زندگی دونوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا، مقتدر کا لکھا سمجھ کر ہر حقیقت قبول کرنے کی کوشش کر ڈالی تھی، اس نے اپنے لیے اپنے آنے والے وقت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اور خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ از میر حیدر کی سردنگ میں جن میں سوائے متفرقہ اور کچھ نہ تھا، اسے شاید یہاں بھی

زندگی کو پہل نہیں سمجھنے دیں گی، وہ اب بھی کہتا کچھ نہ تھا مگر وہ جب بھی سامنے آتا تو صرف پل بھر کے لیے ہی سہی حساب کو اپنا وجود پستی میں اترتا محسوس ہوتا، جانے وہ کیا سمجھتا تھا اسے، جانے کون سی غلطی ہوئی تھی اس سے، وہ بے خبر تھی، مگر از میر کا رویہ ایسے بہت شرمندہ کر جاتا تھا کہ وہ اب ان پر بوجھ بن گئی ہے، اس سب کے باوجود وہ آنٹی کی دیکھ بھال دل دجان سے کرتی تھی، دن رات ایک کر کے حتیٰ کہ آنٹی خود کہہ کہہ کر تھک جاتیں ”حساب! کچھ دیر آرام کرو“۔ مگر وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں کس مقصد کے لیے آئی ہے، ہو پوری ایمانداری سے وہ ڈیوٹی انجام دیتی، آنٹی کی ہر ضرورت کے علاوہ کچن بھی اب اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھا، اس گھر میں ملازم کے نام پر صرف رحیم بھائی تھے، جو گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے، حتیٰ کہ بچن بھی، مگر حساب کے آنے سے انہیں بھی بہت ریلیف ملا تھا، وہ بہت قدر کرتے تھے اس بچی کی، دعائیں دیتے نہ تھکتے، صرف ایک ماہ میں از میر حیدر کے علاوہ ہر چیز، ہر شخص اس کا عادی ہو چکا تھا، اور آنٹی میں آنے والی امیر و ونٹ بھی قابل ستائش تھی۔ بے شک از میر نہ ماننا مگر یہ سچ تھا کہ وہ بہت اپنے پن اور خلوص سے مہمان کی خدمت کرتی تھی، ان کا دھیان رکھتی تھی، یہی وجہ تو تھی آج وہ ماما کو خود اپنے ہاتھ سے کھانا کھاتے دیکھ رہا تھا، جن کا دایاں ہاتھ ہلنا نہیں تھا، یہ حساب کی محنت اور توجہ کا کمال تھا، مہمان کی تھراپی، میڈیسن انہیں ہر چیز نام پر ملتی تھی کہ وہ صرف ماما کو دیکھنے جاتا تھا، ان کی فکر نہیں ہوتی تھی اب اسے، پھر ماما کے چہرے پر اب ہر لمحہ مسکراہٹ نظر آتی، اُداسی، مایوسی، دکھ نہیں، ان کی صحت بھی بہت بہتر ہو گئی تھی۔

”آئی ایم سو پی ما! آج آپ کو کھانا خود سے کھاتے دیکھا تو بلیوسی، بہت اچھا لگا، جیسے مجھے نئی زندگی ملی ہو۔“
 ”دیکھا نا حساب کی محبت اور توجہ کا رزلٹ؟“ اس کے سکر اتے لب سکڑ گئے، کچھ کہنے کو لب ہلے تھے، مگر ممانے پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

”تم اس کی اچھائی اور محنت کو سراہ نہیں سکتے تو فارگا ڈسک! کچھ ایسا دیا بھی مت کہنا کہ مجھے دکھ ہو۔“
 ”سے بی، یہ ان کا کریڈٹ کیا ہو کوئی ڈرامہ ہو؟“
 ”مجھ سے وعدہ کرو از میر! کہ تم حساب کے لیے اچھے الفاظ نہیں کہہ سکتے تو نہ سے بھی مت کہا کرو، میری تم سے ریکوینٹ ہے کہ پلیز! اس بچی کو کبھی ایسے لفظ مت کہنا کہ وہ ہرٹ ہو جائے، ورنہ تمہاری ماما کو اس کے دل سے زیادہ اپنا دل ٹوٹا محسوس ہوگا۔“

”آپ اتنا فرسٹ کرنے لگی ہیں اس پر؟“
 ”ہاں، بالکل اتنا ہی اعتبار کرتی ہوں میں اس پر، جتنا کہ مجھے تم پر ہے۔“ ان کے مضبوط اور ٹھوس لہجے نے اسے خاموش کر دیا۔

”لیجے آنٹی! دو دھ اور آپ کی میڈیسن جلدی....“ وہ جس تیزی اور جوش سے اندر آئی تھی، اتنی ہی جلدی سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، سامنے از میر حیدر کو دیکھ کر، از میر نے حسب عادت ایک کڑی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔
 ”چہرے سے جس قدر معصوم و سادہ نظر آتی ہے اتنی بے نہیں، ماما کو ایک دن ضرور یقین آئے گا میری بات پر۔“ اس کی سوچ زہرا لودھی، پل بھر کو ٹھہرا وہ حساب کی موجودگی میں، پھر باہر نکل گیا۔

”حساب! ادھر آؤ میرے پاس۔“ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ گئی، دو دھ کا گلاس ٹیبل پر دھرا انہیں میڈیسن دیں، پانی کا گلاس پکڑا، یہ تمام امور بہت چپ چاپ انجام دیے تھے اس نے، پھر وہ اٹھ گئی، بچن کا کام سینا اور باہر کے تمام کام ختم کر کے جب وہ زہرہ حیدر کے پاس پہنچی تو اس کی آنکھوں میں ڈھیروں پانی ٹھہرا تھا، ان کا ہاتھ دھیرے سے اس کے سر پر ٹھہرا تھا، پھر وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں جلائے لگیں۔

”میں سمجھتی ہوں بچے! از میر کی جیتی نظرس، ہر داور دکھا انداز تمہیں اندر ہی اندر کا فتا ہے، تم بنا کسی غلطی کے اس کے سامنے مجرم بن کر کھڑی ہو جاتی ہو، وہ ایسا ارادہ نہیں کرتا، بس وہ مجبور ہے، اس کا عورت ذات سے اعتبار بہت بُری طرح ٹوٹا ہے، اور جوان بھائی کی موت نے اسے توڑ دیا ہے، وہ جو تمہیں اسٹون مین دکھائی دیتا ہے ناں صاحب! ایسا ہے نہیں، وہ بہت سکھرا ہوا ہے، اندر سے خوفزدہ ہے، یہی خوف تو ہے جو اسے تم پر اعتبار نہیں کرنے دیتا، تمہاری ہر اچھائی و دُور کھا جاتا ہے۔ ان کی انجھی باتیں اسے بھی ابھائی گئی تھیں، اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تو ان کا چہرہ درو کی داستان بنا ہوا تھا۔

”از میر میرا اکلوتا بیٹا نہیں ہے بلکہ جھوٹا بیٹا ہے، میرا بڑا بیٹا میر حیدر تھا، باپ کے انتقال کے بعد تمام بزنس وہ بہت احسن طریقے سے چلا رہا تھا، از میر ان دنوں ملک سے باہر تھا، اپنی اسٹڈی کے سلسلے میں، میر بہت زندہ دل بچہ تھا، وہ بہت نرم طبیعت اور نرم دل رکھتا تھا اور اسی وجہ سے وہ مار کھا گیا، اس کے آفس میں ایک ٹی ٹی ٹی، سیکریٹری بھی اس کی، بس دھیرے دھیرے وہ اسے چاہنے لگا، اور جب اسے لگا کہ اسے تانیہ کو اپنا لینا چاہیے تو اس نے مجھے اپنی پسند سے آگاہ کیا، میں کوئی پرانے خیالات کی مالک نہ تھی، یوں بھی میری لائف ان دنوں بہت سوشل ہوا کرتی تھی، مجھے اعتراض نہ تھا، تانیہ بھی تمہاری طرح تہمتی تھی، وہ بہت خوبصورت تھی، ساتھ ہی اس کا لہجہ بہت دھما اور نرم تھا، مجھے یہ وہ اچھی لگی، یوں جلد ہی وہ میرے گھر میں میری بڑی بیوی بن کر آ گئی، اس کے آنے سے گھر میں وہ رفتی بڑی کہ ہم خوشی سے پاگل ہونے لگے، از میر بھی بہت خوش تھا، وہ بھائی کی شادی پر آیا تھا، کچھ دن بھائی اور بھائی کے ساتھ گزار کر پھر واپس چلا گیا، تانیہ کو ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے میں قطعی دقت نہ ہوئی تھی، کہ وہ بھی ماڈرن خیالات کی مالک تھی اور سوشل لائف گزارنا اسے پسند تھا، میرا اسے پا کر بہت زیادہ خوش تھا اور میں انہیں دیکھ کر خوش رہتی تھی، تین ماہ سکون سے گزر گئے، پھر دھیرے دھیرے میری طبیعت ڈھیلی رہنے لگی، وہ بہت ست رہنے لگا، میں بہت فکر مند تھی، تانیہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی، میڈیسن وغیرہ، ڈاکٹر کے پاس لے جانا، اس کی ذمہ داری بھی، ظاہر ہے وہ بیوی تھی میری، اور بیوی کا فرض ہوتا ہے یہ تمام ذمہ داریاں سنبھالنا، پھر جیسے جیسے میری طبیعت خراب رہنے لگی، دھیرے دھیرے بزنس بھی تانیہ سنبھالنے لگی، میں اور از میر یہ سب اس کی نیکی اور محبت ہی سمجھتے رہے، میر بستر سے لگ گیا، مجھے از میر کو بتانا پڑا، اور از میر صرف پندرہ دن کے اندر پاکستان آ گیا، اور جب از میر، میر کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو انہیں جو حقیقت معلوم ہوئی، اس نے ہمارے پاؤں کے نیچے سے گویا دھری ہی کھینچ لی تھی، میر کو رگڑی رگڑی سلویو ایزن دیا جا رہا تھا، یہ ہمارے لیے شاکنگ تھا، کون کر سکتا تھا ایسا؟ سوائے تانیہ کے، از میر کی چھٹی حس فوراً بیدار ہوئی تھی، اس نے جہاں اپنے بھائی کو اچھے ہسپتال میں ایڈمٹ کر لیا، ساتھ ہی وہ بزنس کے معاملات دیکھنے آفس پہنچا، مجھے اس دن علم ہوا کہ مجھے تانیہ پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ مجھے کہہ دیتی کہ ماما میں نے میر کو چیک کر دیا ہے، میڈیسن دے دیں، میں مان لیتی، مجھے کیا علم تھا کہ وہ میرے بچے کو میڈیسن کے نام پر زہر دے رہی تھی، تانیہ از میر کے آفس پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل گئی، وہ سارا بزنس اپنے نام کرنے کے چکر میں تھی، صرف میر کے سائن باقی تھے اور اگر ٹھیک وقت پر از میر نہ آتا تو وہ شاید یہ بھی کر لیتی، پھر بھی وہ پچاس لاکھ تک کا نقصان دے گئی تھی، مگر ہمارے نزدیک اس وقت وہ دولت اہم نہ تھی، میر کی جان اہم تھی، ہم نے ہر اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیا، مگر دیر بہت ہو چکی تھی، تین ماہ سے مسلسل اسے زہر دیا جا رہا تھا، وہ تو اس کے خون میں رچ گیا تھا، ہم کوشش کرتے رہے، مگر میر نہیں چھوڑ گیا، میرے لیے حیدر داؤد کی موت کے بعد یہ صدمہ سہنا بہت مشکل تھا، مجھے ہارٹ ایک ہوا، مگر میری ابھی زندگی تھی، سو میں اپنے از میر کے لیے فحش گئی، مگر اس کے بعد میں سنبھل نہیں، ایک دن بلڈ پریشر بہت ہائی ہو گیا، از میر فوراً مجھے ہسپتال بھی لے گیا، مگر میرے جسم کا دایاں حصہ مفلوج ہو گیا، بس جب سے میں

بیویوں، ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ توجہ اور کوشش مجھے پھر سے چلا سکتی ہے، مگر از میر تباہ کیا کیا کرتا، سو مجھے لگا تم یہ کر سکتی ہو، تم پردہ مجھ دے جو مجھے اپنے از میر پر ہے، بچے! تم اس کے رویے کو دل سے نہ لگنا میری جان، وہ مجبور ہے اپنی بات سے، اس کا بھائی اسی اعتبار اور محبت نے چھین لیا ہے، اور اب وہ محبت اور عورت دونوں سے نفرت کرتا ہے، لیکن یہ یقین ہے وہ دن جلد آئے گا، جب وہ خود تمہاری اچھائی کا تمہارے خلوص، تمہاری نیک نیتی اور ایمانداری کا اعتراف کرے گا۔“ آنٹی نے جوچ اسے بتا دیا تھا اس کے بعد تو اس کے دل میں از میر حیدر کے لیے ہمدردی ہی ہمدردی تھی، وہ جگہ ٹھیک تھا، جو کر رہا تھا جائز تھا، اب اسے اس کے رویے اور نظروں کی سرد مہری سے گلہ نہ تھا، اور نہ ہی دکھ تھا کہ وہ نرم نہ ہوتے ہوئے بھی کیوں مجرم بنی ہوئی ہے، وہ مجرم نہیں تھی، مگر اس جیسی عی ایک لڑکی نے ان نیک دل لوگوں کا اعتبار دیا تھا، پھر بھلا کیوں کر وہ کسی پر مجبور نہ کر سکتے تھے؟

☆.....☆.....☆

ساب کو یہاں آئے تین ماہ ہو چکے تھے، وہ کبھی کبھار پھپھو سے ملنے چلی جاتی تھی اور کس قدر حیرت کی بات تھی ناں اس کو پھپھو کے گھر لے جانے کی ڈیوٹی خود از میر حیدر انجام دیتا تھا، یہ کام وہ خوشی سے نہیں کرتا تھا، بلکہ صرف اس بنیاد پر کہ ساب کی اصلیت کھلے اور وہ ماما کو دکھائے، مگر وہ اب تک اپنی کسی بھی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا، ہاں ساب نے اپنا کام بہت کامیابی سے انجام دیا تھا، وہ اب جب ماما کو دھیرے دھیرے اسٹیپ اٹھاتے دیکھتا تو ناقابل فراموش بات ہوتی تھی اسے، ماما اب خود سے چلنے لگی تھیں، بہت زیادہ نہیں مگر یہ کیا کم تھا ان کے وجود کا وہ حصہ جسے ڈاکٹر نے بے اثر قرار دے دیا تھا اب حرکت کر سکتا تھا، پہلے ہاتھ اور اب پاؤں، ماما دھیرے دھیرے ٹھیک ہو رہی تھیں اور اس نے اسی بات میں گید رنگ رکھی تھی، جس میں اس کے چند فرینڈز اور کچھ خاص خاص رشتہ دار شامل تھے، سب کے لیے ساب کا بدحیرت کا باعث تھا، کچھ لوگوں کے لیے خوشی کا سبب بھی دکھائی دیا، جیسے فیضی لڑکیاں (خوبصورت لڑکیاں) دیکھتے ہی پاگل ہو جاتا تھا، اسے حیرت اور ناگواری کا احساس شدت سے ہوا تھا، جب ماما نے ساب کو اپنی قریبی عزیزہ کہہ کر تعارف کر دیا اور اس بات پر وہ ان سے تھا بھی ہوا تھا۔

”یہ رانگ ہے ماما! میں آپ کی وجہ سے اسے برداشت کر رہا ہوں، مگر یہ جھوٹ....“

”جھوٹ کیا ہے؟ وہ میرے قریب بھی ہے اور مجھے عزیز بھی بہت ہے۔ ان کی لالچ اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”مگر میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

”تو میں کب بنا رہی ہوں؟“

”ماما! اگر آپ اسے اپنی بھانجی بتائیں گی تو میری کیا لگے گی وہ؟“ اس کا غصہ عروج پر تھا، ماما کا چہرہ بھی سنجیدہ تر کیا۔

”از میر پلیز! یہ گھر اس کا بھی ہے۔“

”واٹ!؟“ وہ اُچھل گیا، بھی صاحب اندر آئی تھی۔

”ڈونٹ وری از میر حیدر! میرا یہاں کچھ نہیں ہے، آنٹی پراس، کل بھی سب آپ کا تھا، آج بھی آپ کا ہے اور نے والے ہر دن میں بھی صرف آپ کا ہوگا، آنو، میں یہاں جسٹ اسے سروینٹ ہوں، جس کی مجھے پے تھی ہے، اس سالاہ اور مجھے کچھ درکار بھی نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں غصہ نہیں تھا، مگر بھی نہیں تھا، صرف اعتماد تھا۔

”تمہارے آنے سے میری ماما تو میری رہیں نہیں۔“

”وہ آپ کی عی ہیں، ہاں یہ ان کا بڑا بچہ ہے کہ ان کے دل میں مجھ تہمت کے لیے اتنی چاہت ہے، آنٹی نے جو میرے

لے کیا وہ میں عمر بھر یاد رکھوں گی، اور احسان تو میں آپ کا بھی نہیں اُتار سکتی کہنا چاہتے ہوئے بھی آپ مجھے اپنے گھر میں رکھنے پر مجبور ہیں۔“

”جسٹ شٹ اپ، تمہارے یہ ڈائلاگز صرف ماکاؤ ٹریک کرتے ہیں مس صاحب! بہتر ہوگا ان پر ہی ٹرائی کرو؟۔“ وہ اسی تنفر بھرے لہجے میں کہتا کرے سے نکلا تھا اور صاحب گہری سانس خارج کرنے لگی۔

”صاحب بچے!“

”پلیز آئی! ایل او کے، اب میں سب جانتی ہوں پلیز۔“ اس نے انہیں ریلیکس کیا اور پھر ان کے برابر میں بی لیٹ گئی۔ از میر حیدر کے روئے کو جھیلنے کی وہ عادی ہو چکی تھی، سو اس کی اتنی زہر میں بھی باتیں سن کر بھی اس نے صبح روٹین کے مطابق کام کا آغاز کیا تھا، صبح خلاف معمول جب از میر دس بجے اٹھ کر آیا اور ناشتے کے لیے رحیم بھائی کو پکارا تو اسے یاد آیا تھا کہ آج سنڈے ہے، اور اس سنڈے اس نے پھپھو سے ملنے جانا ہے، اس نے فوراً سے پہلے ناشتہ تیار کر کے رحیم بھائی کو دیا تھا، اور خود کچن میں برتن سینے لگی۔

”صاحب بیٹا! از میر بیٹے کا کہنا ہے کہ لسٹ بنا دیں سامان کی، کچن میں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، اور ہاں اس بار سامان کی کوئٹی ڈبل لکھئے گا۔“

”کیوں رحیم بھائی؟“

”بھیا کا آرڈر ہے؟“ انہوں نے مسکرا کے کہا، ظاہر ہے از میر کے سامنے جواب سوال صرف زہرہ آئی ہی کر سکتی تھیں، اس نے کچن سینیا، پھر لسٹ بنانے بیٹھ گئی اور دس منٹ بعد وہ لسٹ اس کے سامنے رکھ رہی تھی۔

”سامان زیادہ لکھنا۔“

”جی لکھ دیا ہے۔“ وہ اسی کے انداز میں مختصر جواب دے کر آئی کے پاس آ گئی، یہ ٹائم ان کی ایکسرسائز کا ہوتا تھا، ان کا ہاتھ بہت بہتر تھا، بے ٹنک صاحب کی محنت تھی مگر ان کی ول پاور نہ ہوتی تو شاید اس کی محنت بھی رنگ نہ لاتی، مستقل آدھے گھنٹے ان کو گھر اُپنی دغیرہ کے بعد اس نے ریٹ کے لیے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔

”آپ کے لیے جوس لانی ہوں۔“

”صاحب! ابھی کچھ دیر رہنے دو، میرے پاس بیٹھو۔“ ان کے کہنے پر وہ ان کے پاس آ گئی، دو تین دن سے صاحب کی خاموشی وہ نوٹ کر رہی تھیں۔

”مجھے لگتا ہے تم پھپھو کو مس کر رہی ہو؟“

”نہیں مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے، جو میرے ابو نے بہت محنت اور محبت سے بنایا تھا مگر آج وہ ویران پڑا ہے۔“

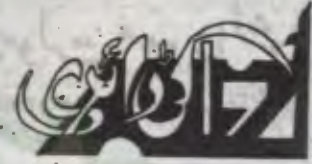
”صاحب! تم اپنی پھپھو سے کہہ دو ناں کہ وہ اس گھر میں شفٹ ہو جائیں، کرائے کے مکان سے تو اچھا ہے ناں، پھر تمہارا گھر بند بھی نہیں ہوگا اور تم جب پھپھو سے ملنے اس گھر میں جاؤ گی تو تمہیں اچھا لگے گا۔“

”جی آئی! مگر پھپھو اپنے شوہر کی لالچی فطرت کی وجہ سے وہاں شفٹ نہیں ہوتیں، ان کے بقول وہ امانت ہے میری، کہیں ان کے شوہر کی نیت خراب ہوگی تو وہ اپنے مرحوم بھائی کو کیا جواب دیں گی؟“ اس نے پھپھو کا فلسفہ بیان کیا، آئی نہیں دیں۔

”ہاں ان کے شوہر ہیں تو لالچی ہے۔“

”بٹ آئی! مجھے کرنا کیا ہے اس گھر کا؟ پھپھو میرے ساتھ رہیں گی تو گھر آباد تو رہے گا اور پھر وہ گھر ان کا بھی تو ہے، آخراں کے بھائی کے گھر پر ان کا حق بنتا ہے ناں؟“

جاری ہے



فرزانہ عمر دراز کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی نظم

میرے نقش گر میرے کوزہ گر
مجھے توڑ دے مجھے توڑ دے
میں خزاں رسیدہ شجر ہوں اک
مجھے پھر سے اذن بہار دے
میری زندگی کو نگار دے
مجھے بخش پھر سے حیات نو
مجھے گوندھ طیبہ کی خاک میں
میرا گھر مدینے میں ہو کہیں
میرے دل میں گنبد سبز میں
میرے سر میں طیبہ کی دھول ہو
میرے نقش گر میرے کوزہ گر
میرے نقش پھر سے بنانے
میرے خیال و خد کو سنوار دے
جو میرے نصیب میں یہ نہیں
مجھے خاک پر سے اتار دے!

روشنی فاطمہ کی ڈائری سے

افتخار عارف کی غزل

ہو گئے جواں بچے بوڑھی ہو رہی ہے ماں
بے خواب آنکھوں میں چراغِ لودھی ہے ماں
روٹی اپنے حصے کی دے اپنے بچوں کو
صبر کی ردا اوڑھے بھوکے سو رہی ہے ماں
سانس کی مرہض ہے پھر بھی شغفے پانی سے
اتنی سخت سردی میں کپڑے سو رہی ہے ماں
غیر کی شکایت پر کبھی کسی شرارت پر
مجھ کو مار کر عارف خود بھی رو رہی ہے ماں
روکتی تھی مجھ کو کھیلنے سے جس مٹی میں
آج اسی مٹی کو اوڑھے سو رہی ہے ماں

ملیجہ بیگ کی ڈائری سے

زبیر راج کی غزل

زمانے بیت جاتے ہیں

کبھی نظریں ملانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی نظریں چرانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کسی کی آنکھ بھی کھلتی ہے تو سونے کی نگری میں
کسی کو گھر بنانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی گھر سے نکلتے ہی نظر آ جاتی ہے منزل
کبھی رستوں کو پانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی صدیوں کی راتیں ہیں پل بھر کی گنتی ہیں

کبھی سورج کو آنے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کوئی سجدے میں گر جاتا ہے تو پالیتا ہے رب کو
کسی کو لو لگانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
وہ بھی سب چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ جاتے ہیں
جنہیں دنیا کمانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی اک پل بھر بن کے صدیاں بیت جاتی ہیں
کبھی اک بل بٹانے میں زمانے بیت جاتے ہیں

سحر انجم کی ڈائری سے

مرقعی برلاس کی غزل

جب لوگ ہی جذبوں کی تو قیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
دل چیر جاتا ہے لہجے کا یہ روکھا پن
کرتی ہے زباں وہ کچھ جو تیر نہیں کرتے
لکھتے ہیں وہ کچھ جو ہر اک پہ گزرتی ہے
پریوں کی کہانی ہم تحریر نہیں کرتے
دو گزی زمین سب کا جب آخری مسکن ہے
ہم کوئی مکاں اپنا تعمیر نہیں کرتے

سعدیہ عابد کی ڈائری سے

ارشاد ملک کی نظم

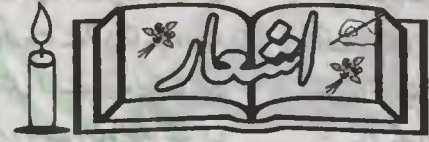
کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں
جو دورِ افق پر رہتے ہیں
وہ لوگ جو میرے اپنے تھے
کیوں جتنے جتنے روٹھ گئے
وہ جاتے ہیں مسکاتے ہیں

کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں
اک روز میں یونہی شام ڈھلے
بس تنہا تنہا بیٹھا تھا
تب چاند مجھے الجھا سا لگا
مجھ سے آخر یہ کہنے لگا
معلوم ہے کچھ تم کو ارشد
وہ لوگ جو میرے اپنے تھے
کیوں مجھ سے آخر روٹھ گئے
میں ہر شب ڈھونڈتا رہتا ہوں
پر مشکل ہے تڑپاتے ہیں مسکاتے ہیں
کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں

مسز ایمانور رضوان کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی نظم

اپنی محبت کا کچھ حق ادا کر دو
ہمارے نام اپنی کچھ وفا کر دو
اگر یہ ممکن نہیں تیرے لیے تو
اپنی یادوں کو مجھ سے جدا کر دو
دو بول محبت کے بول کر
میری محبت کی آساں راہ کر دو
رفتہ رفتہ جا رہا ہوں موت کی طرف
مجھے بچانے کے لیے زندگی کی دعا کر دو
ایسا نہیں کر سکتے اگر تم تو
ہمیشہ کیلئے مجھے الوداع کر دو



سیدہ امیر ہاشمی کراچی رابعہ منیر سرگودھا
اے آسمان والے زمین پر اتر کے دیکھ
ہوتی ہے کیا جادائی تو بھی پھڑکے دیکھ
سحر انجم کراچی
چاند کی تلاش میں پھرتی تھی ہر نظر
کوئی دیکھتا ادھر کوئی دیکھتا ادھر
میری چاہ نے اُس کے دل پر کچھ ایسا کیا
تو ہی چاند ہے میری عید کا کہہ گئی اُس کی نظر
نور بانو..... کوئٹہ
تیرے لبوں سے محبت کے قصے سنتے ہیں تو بہت روتے ہیں
اپنے ہاتھوں پہ تیرا ہاتھ دیکھتے ہیں تو بہت روتے ہیں
نجانے تو اجنبی ہو گیا ہے یا ہمارے ہاتھ کی انگلیاں
کہ گیلی ریت پہ تیرا نام لکھتے ہیں تو بہت روتے ہیں
صباحر..... ہارون آباد
کبھی ادھورے چہروں میں
اک تیرا چہرہ پورا ہے
میرے جیون کا ہر لمحہ
تیرے بغیر ادھورا ہے
عاصمہ رشید فیصل آباد
کبھی میری جگہ خود کو رکھو پھر جان جاؤ گے
کہ دنیا بھر کے دکھ دل میں سونا کس کو کہتے ہیں
نہ خواب آورد وائیں کھا کے بھی نیند آ سکے تم کو
کچھ لوگے کہ کانٹوں کا پھوٹا کس کو کہتے ہیں

شاملہ قیصر کراچی
ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے
رنگ و خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے جتنے استعارے تھے
ثمینہ عمران گجرات
گزر گئے ہیں جو خوشبوئے رایگاں کی طرح
وہ چند روز میری زندگی کا حاصل تھے
اب ان سے دور کا واسطہ بھی نہیں ناصر
وہ ہم نوا جو میرے رنجوں میں شامل تھے
ارم قیوم پشاور
جسے مانگا تھا میں نے ہر دعا میں
وہ بن مانگے کسی کو مل گیا ہے
حتا بخاری گجرات
اپنی افسردہ مزاجی کا بُرا ہو قاتل
واقعہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر جانا ہے
سعدیہ حیدر ملتان
لطف تو جب ہے سفر کا کہ میرے ہمسفر و
اپنے سائے کو بھی رستے میں نہ چھوڑا جائے
دل تجھے بھولنا چاہے بھی تو مشکل یہ ہے
کس طرح سانس کی زنجیر کو توڑا جائے
حتا جہانزیب سیالکوٹ
وہ اور ہیں جو تجھے چھو کے دیکھنا چاہیں
مجھ کو تو تیرے خواب کی دنیا بہت ہے
رانیہ حسن شیخوپورہ
تمہاری آنکھ سے دل تک سفر کرنا ہے بس ہم کو
یہ کتنی خوبصورت منزلوں کا راستہ ہو گا
صدف سحر ملتان
پریم کٹھا کا آنت نہ کوئی

کتنی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی سا جن
کچھ نہیں مانگیں سب کچھ پائیں
صائمہ کراچی
تم آ کے بڑے شوق سے لوجا تڑہ دل
جو چیز جہاں چھوڑ گئے تھے وہ وہیں ہے
ریما نور چمن کراچی
جس شام دل میں میری یاد نہ آئے
خدا کرے کہ ایسی کوئی شام نہ آئے
اے دوست یہ تو ممکن ہی نہیں ہے
افسانہ لکھا ہو دوستی کا اس میں تیرا نام نہ آئے
سعدیہ عابد کراچی
نئے موسم کی خوشبو سے پُر آ کر آنکھ مل دو بل
مئے موسم کی باتیں سوچتا رہتا ہوں بارش میں
نہ سونا میرے بس میں نہ شب بھر جاگنا خالد
میں آنکھیں کھولتا اور میچتا رہتا ہوں بارش میں
مدیحہ گل حاصل پور
ہے اختیار میں تیرے تو یہ معجزہ کر دے
وہ میرا نہیں ہے اے میرا کر دے
خولہ عابد لاہور
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا
وہ میرے ہو کے بھی میرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا
شبنم شاہد اوکاڑہ
دل میں اک کک سی ہے معلوم تو ہو
چھوڑ کر مجھ کو کس حال میں ہو گا وہ
☆☆☆

اس کا قصہ

اس ماہ کا اقتباس

ہم لڑکیاں:

ہم کیا جانیں ہم کون ہیں؟ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ ہماری گردنوں میں تو نظر نہ آنے والے دھاگے بندھے ہیں اور پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہاتھ کبھی ان دھاگوں کو اوپر کھینچتے ہیں اور کبھی گرا دیتے ہیں ہم تو آٹے کے چراغ ہیں جنہیں کسی نہ کسی کی خوراک بنتا ہے۔
(قرۃ العین حیدر)

مرحوم خصوصی

برصغیر کے بعض پسماندہ علاقوں میں اب تک یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ برادری کی تمام بوڑھیاں کسی کے ہاں ٹکی میں شریک ہوتی ہیں تو لبا لبا کھونٹ کھاڑھ کے بیٹھ جاتی ہیں اور اپنے اپنے پیاروں کے نام لے کر بین کرتی ہیں دھاڑتی ہیں سب اپنے اپنے مردوں اور مردوں کی خوبیاں بیان کر کے خشک آنسوؤں سے روئی ہیں اگر کوئی ناواقف حال پہنچ جائے تو وہ ایک گھنٹے میں بن بن کر بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس مجلس میں آہ و بکا میں دو دھاتی سومردوں میں آج کا مرحوم خصوصی کون ہے۔

(مشاق احمد یوسفی کی تحریر سے انتخاب)

انتخاب: غانیہ نازی۔ ربوہ

دل کی نیں ناں۔

○ گھر کب آؤ گے؟

☆ جب تمہارے ابا گھر نہیں ہوں گے۔

○ اپریل فول بتایا تو ان کو غصہ آیا۔

☆ فول کو فول بتاؤ گے تو غصہ تو آئے گا۔

○ میں زندگی میں ہر پل روتا رہا ہوں۔

☆ کس نے کہا تھا کہ شادی کرو۔

○ دیکھا ہے پہلی بار۔

☆ ساجن کے منہ میں نسوار۔

حتا علی..... گجرات

اس ماہ کی خوبصورت بات

☆ وقت اچھا ضرور آتا ہے کبھی وقت نہیں آتا۔

☆ ہر کسی کو اتنی نصیحت دینی وہ آپ کو دیتا ہے اگر کم

دے گے تو مغرور کہلاؤ گے اگر زیادہ دے گے تو خود گر جاؤ گے۔

ثناء ملک..... کراچی

اس ماہ کی غزل

جس دن تم سے ملاقات کی امید ہوگی

قسم سے میرے چائے میں ملا میری عین ہوگی

ہو گا۔ کب حقیقت یہ افسانہ میرا

جو تجھے نصیب تیری دید ہوگی

رکس کر کے تنگ میرے صبر کا امتحان نہ لو

یوں طلب میری آنکھوں میں مزید ہوگی

گر ہو گئی تیری تقدیر میرے نام

تو میری محبت تیری مرید ہوگی

شاعر: رئیس امیر بہادر

انتخاب: کرن امیر بہادر..... کراچی

اس ماہ کا لطیفہ

رداؤ انجسٹ [221] ستمبر 2012ء

اسٹنٹ: ”سر! آپ آفس میں ہمیشہ شادی شدہ اسٹاف ہی کیوں رکھتے ہیں؟“
باس: ”کیونکہ انہیں بے عزتی سہنے کی عادت ہو جاتی ہے۔“

نور بانو..... کوئٹہ

اس ماہ کا فلسفہ

”انسان پیار کرنے کے لیے ہوتے ہیں اور چیزیں استعمال کرنے کے لیے لیکن بات تب بگڑتی ہے جب چیزوں سے پیار کیا جائے اور انسانوں کو استعمال۔“
دریاشا خان..... حیدر آباد

اس ماہ کا قطعہ

کل جب ہم آزاد ہوئے تھے
خون میں ڈوبی ارض وطن تھی
65 سال کے بعد بھی حالت
وہی ہی ہے ارض وطن کی

کلام: راء تہذیب حسین تہذیب

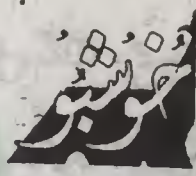
انتخاب: مریم افروز..... رحیم یار خان

اس ماہ کے اقوال

اقوال حضرت علیؓ

☆ جب تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آ جاؤ رزق کوئی راستہ نہ نکلے تو صدقہ دے کر اللہ سے تجارت کرو۔
☆ دوست اور بھائی میں فرق۔ دوست ہیرا ہے تو بھائی سونا۔

☆ انسان بھی بڑی عجیب چیز ہے جب کسی سے ڈرتا ہے تو اس سے دور بھاگتا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو اس کے اوپر بھی قریب آ جاتا ہے۔



☆ اگر تمہارا کوئی اچھا دوست روٹھ جائے تو اسے بار بار منالو کیونکہ اگر تسبیح کے دانے ٹوٹ جائیں تو چن لیے جاتے ہیں۔
☆ اللہ تعالیٰ کی رضا کی علامت ہے کہ بندہ اس کی تقدیر پر راضی ہو۔

☆ کبھی اپنے دوست کی سچائی کا امتحان نہ لو کیا پتہ اُس وقت وہ مجبور ہو اور تم (غلط فہمی) میں ایک اچھا دوست کھو بیٹھو۔

☆ خاموش رہو یا ایسی بات کرو جو خاموشی سے بہتر ہے۔

☆ زندگی استاد سے زیادہ سخت ہوتی ہے استاد سبق دے کر امتحان لیتا ہے اور زندگی امتحان دے کر سبق دیتی ہے۔

روشنی قاطعہ..... کراچی

اس ماہ کی نظم

آخری شام

نئی رُتوں کے نئے سفر میں
تمہیں اجازت ہے بھول جانا
ہزاروں سالوں پہ ثبت چاہت کی
پوری تاریخ بھول جانا
مگر مری جاں

سیراب ماضی کے خواب آلود روز و شب کی
وہ آخری شام یاد رکھنا
وہ آخری شام

جب تمہاری مری نگاہوں نے
ایک دو بجے کے دل کے اندر اتر کے
شفاف آنکھوں میں

خود اپنے چہروں کے عکس دیکھے
تو رو پڑے تھے
وہ آخری شام
جب مجھے تم نے یہ کہا تھا
کہ چاند عید کا دیکھو
تو سرسراتی ہوا کے دل پہ
مری تمنا کے نام
کوئی پیام لکھنا
وہ آخری شام یاد رکھنا

ناصر عباس..... کراچی

اس ماہ کا فلسفہ

کامیاب لوگ اپنے ہونٹوں پر دو چیزیں رکھتے
ہیں خاموشی اور مسکراہٹ۔ مسکراہٹ مسئلے کو حل کرنے
کے لئے اور خاموشی مسئلے سے دور رہنے کے لئے۔

مدیر سلطان..... لاہور

اس ماہ کی دعا

وقت دعا میں اک دعا کروں
میں رب سے اک التجا کروں
تو خوش رہے تو شاد رہے
تیرے دل کا آئین سدا آباد رہے
تو ہر پل ہی بے ہنگام رہے
تو پھول کی مانند کھلا رہے
تیری زندگی میں کوئی غم نہ ہو تیری آنکھ کبھی غم نہ ہو
تجھے کسی گلہ نہ ہو کوئی دکھ تجھے ملانہ ہو
تجھے بن مانگے وہ عطا کرے
تیری معاف ہر اک خطا کرے

بشریٰ توقیر..... جہلم

☆☆☆☆☆

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک کھجور کے پاس سے گزرے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ کھجور کا یہ دانہ صدقے والی کھجوروں میں سے ہے تو میں اسے کھا لیتا۔“

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس گھر تشریف لائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ روٹی کا ایک ٹکڑا زمین پر پڑا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اٹھایا صاف کیا پھر کھا لیا اور فرمایا ”عائشہ! اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں تمہاری پڑوسی بن جائیں ان کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آؤ (حسن سلوک سے پیش نہ آؤ گے تو بھاگ جائیں گی) اور جس قوم سے یہ بھاگ جاتی ہیں ان کی طرف واپس لوٹ کر نہیں آئیں۔“

(مسلم)

روشنی قاطعہ..... کراچی

اعمالِ ہیرے

☆ اخلاق اچھا ہونا اللہ سے محبت کی دلیل ہے۔

☆ نایاب تحفہ ہے۔

☆ دل کا سکون چاہتے ہو تو حسد سے دور رہو۔
☆ مصیبت کی شکایت مت کرو اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور دشمن خوش ہوتا ہے۔
☆ خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھو۔
☆ علم ایسا بادل ہے جس سے رحمت برسی ہے۔
☆ نیک بننے کی کوشش ایسے کرو جیسے حسین بننے کی کوشش کرتے ہو۔
☆ کسی سے ملو اس طرح کہ وہ دوبارہ آپ سے ملنے کی تمنا کرے۔

ماں باپ

ماں باپ کے لئے سب کو چھوڑ دینا لیکن کسی کے لئے ماں باپ کو مت چھوڑنا کیونکہ جب ماں باپ روتے ہیں تو فرشتوں کو بھی رونا آ جاتا ہے۔

دوزخ نے کہا:

ماں وہ ہستی ہے جو گنہگار کو بھی دوزخ سے بچا لیتی ہے۔

جنت نے کہا:

ماں وہ ہستی ہے جس کے قدموں کے نیچے میں ہوں۔

رب نے کہا:

ماں میری طرف سے انسان کے لئے قیمتی اور

رواۃ المجتہد [222] ستمبر 2012ء

رواۃ المجتہد [222] ستمبر 2012ء

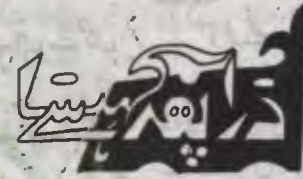
رشتے دار اور ہمسائے ہیں کیونکہ وہ عوام کی نسبت

☆ میں بس میں اس لئے نہیں سوتا کہ کہیں

”اے ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ وکیل نے اطمینان سے کہا۔

ایس امتیاز احمد..... لراپو

☆☆☆☆☆.....



غزل

جب بہار آئی تو ہر شے پر جوانی آگئی
میرے لب پر بھی کوئی جب رنگین کہانی آگئی
اختلافِ فکر گھر گھر رویہ کار آتا رہا
یوں ہوا پھر نویتِ نقل مکانی آگئی
آندھیاں بے اعتباری کی چلیں انجام کار
دل کے آئینوں پر گردِ بدگمانی آگئی
تھا بہت پُر خار یوں بھی جادہ صدق وفا
راستے میں ہر بلائے ناگہانی آگئی
اس کے گرد پیش دیکھا ہم خیالوں کا ہجوم
بزمِ یاراں میں جیسے جادو بیانی آگئی
دامنِ حدود کو چھوڑ تو میری فکر میں
رفتہ رفتہ ایک وسعتِ لامکانی آگئی
سعیِ اغلاصِ عمل سے واجدِ حق ربِ الہرگ تھے
کے ان فتنوں پر آبِ نوجوانی آگئی
پروفیسر ڈاکٹر واجد گیلانی

نظم

ایک نازک سی پیاری سی لڑکی
جو ہر وقت ہنسی مسکراتی
اپنی باتوں سے دوسروں کا دل لہجاتی
جو ہر کسی کو پیاری

اوپنی ننھی پگڈنڈیوں پر

جب وہ چڑھتی

تو اس کے خوبصورت سے چہرے پر

روشنی نکھرتی

ایک دن اسے کوئی ملا

جو اسے زندگی سے بھی پیارا ملا

جسے دیکھ کے ایک کول سا احساس

اس کے دل میں جاگتا

جو اس کے خوابوں میں آنے لگا

اس کی نیندوں پر چھانے لگا

اس کے ہر وقت ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی

وہ خلاؤں میں اسی کی شبیہ تلاش کرتی

بس

اس ایک دن نے اس کی مسکراہٹ

اس کی خوشیاں چھین لیں

جب اس نے جانا وہ اس کا نہیں

اس کی تو دنیا اندھیر ہو گئی

مسکراتے لب تھم گئے

دل کی مسند پر اداسی ڈیرے ڈال گئی

ایک نازک سی پیاری سی لڑکی

سیدہ ارم

غزل

جسے اپنا سمجھا وہ مجھے بھلا دیتے ہیں
کیوں مجھے اپنی نظروں سے گرا دیتے ہیں
سدا خوش رہے جہاں میں میرے دوست تو
ہم ہر لمحہ تجھے جینے کی دعا دیتے ہیں
جلاتے ہیں ہم اپنی ناکام آرزوؤں کے چراغ
ن چراغوں کو بھونکے بھونکے بجھاویے ہیں
کیوں تڑپاتے ہو تم نظروں سے دور ہو کے
ٹھیس ٹھٹسی ہے دل سے مگر ہم مسکرا دیتے ہیں
ہم نے جسے دل دیا وہاں سے عزیز سمجھا جاوید
ہماری دفاؤں کی وہ ہمیں سزا دیتے ہیں

محمد اسلم جاوید

غزل

بے چینی میں کٹا دن تو رات کانٹوں پر
گزار دی ہے کسی نے حیات کانٹوں پر
تغیرات سے افزوں ہے ارقاء کا مزاج
ملا ہے گل کو چمن میں ثبات کانٹوں پر
بلا سے دامن ہستی جو تار تار ہوا!
مرے جنوں نے لگلی ہے گھلت کانٹوں پر
چمکے ہیں شگوفے تہماہی یلاؤں کے
جی ہے شبنم دگل کی برات کانٹوں پر
یہ اور بات ہے پھولوں کا ذکر تھا اتنا ساز
کہ اتفاق سے پہنچی ہے بات کانٹوں پر

ایس اقبال احمد

غزل

سنا ہے تیرے دل میں میری چاہ سائی ہے
یہ تو جرمِ محبت ہے اس میں تو رسوائی ہے
لمحہ بھر کے لئے جو تیری چاہ میں مسکرائی تھی
اس خوشی کی قیمت میں نے اشکوں سے چکاائی ہے
یہ جو میرے اپنے ہیں یہ ہے ان کا اپنا پن
میری چٹاکے لئے آگ خود انہوں نے سلگائی ہے
میری خوشی کے لئے کیا کیا نہ مہا تو نے اسے دوست
تیری تصویر میں نے بھی اپنے من میں سجائی ہے
اب جدا کیسے کریں گے ہمیں یہ زمانے والے
جہاں تیرا نام آیا دیں میں نے جیں جھکاائی ہے

سحر انجم

غزل

کوئی منزل کوئی ساحل تو ہو
بھٹکتی کشتیوں کی جانب کوئی مائل تو ہو
خدا تو بیٹھا ہے رحمت بانٹنے کو
سوال یہ ہے کہ کوئی سائل تو ہو
تمام مذاہب پہ ہے حاوی انسانیت
مگر یہاں کوئی قائل تو ہو.....
مانا کہ تم تیر نظر رکھتے ہو.....
بات تب ہے کہ محفل میں کوئی گھال تو ہو
نالہ مئے شبنم شب ہے اور ہم تنہا.....
مگر عمارتِ نالہ مئے شبنم کا حاصل تو ہو

عامر عزیز

نا سور

اتفاق گزر گیا ہے

غزل

اس نے نظریں اٹھائیں دیکھ کر پھر جھکا لیں آنکھیں
میں دیکھتی رہ گئی کیا عذاب ہیں آنکھیں
نگاہوں سے کہیں دل کا عہد نہ کھل جائے
دل کے رازوں کی کیا کتاب ہیں آنکھیں
جب بھی اٹھتی ہے نظر اس کی اک نیا سوال ہوتا ہے
میں حیران رہ جاتی ہوں کیا نصاب ہیں آنکھیں
جب تک منہ کھولے پیاسی رہتی ہیں میری آنکھیں
مشکیزہ تھامے کھڑی رہتی ہوں کیا آب ہیں آنکھیں
کشید کرتی رہتی ہوں اس کی آنکھوں سے عرق
اکثر سوچتی ہوں کیا گلاب ہیں آنکھیں
رکھتی تھی ہر وقت اپنی آنکھوں میں روشنی کی طرح
پھر بھی اوجھل ہو گئیں کیا نایاب ہیں آنکھیں
جگہ جگہ ڈھونڈتی رہتی ہوں ان آنکھوں کو
لوگ پوچھتے ہیں کیا نایاب ہیں آنکھیں
اب بھی ڈوبی رہتی ہوں ان آنکھوں کے سمندر میں
ترتیر ہو جاتی ہوں شانزے کیا سیراب ہیں آنکھیں
بسمہ شانزے پارس نواب

نظم

کچھ بیٹے بل
کچھ بیتی یادیں
کچھ اُن کہی باتیں
جو کہنا چاہوں
پر کہہ نہ سکوں

اپنی جدائی کو.....
ہجر کو بے رخی کو.....
ضبط کرتے کرتے.....
دلِ نادان پتھر سا ہو گیا ہے.....
تمام جذبوں کی موت ہو چکی ہے.....
زیستِ یادوں میں کھو چکی ہے.....
اور ہجر.....
ناسور بن گیا ہے.....!

سیرا غزل

نظم

یونہی چپ چاپ رہتے ہو
کبھی ہنس کر تو دیکھو تم
کہ.....
چپ رہنے کی نسبت
بول دینے سے
اکثر.....
ہمارا دل.....
شانت رہتا ہے
خاموشی ہمیں اندر سے
چاٹ لیتی ہے
اور.....
دکھوں میں مزید
اضافہ کرتی ہے
سنو.....
تم بولنا سیکھو
اداسی دور بھاگے گی

ان یادوں میں بسنا
کتنا اچھا لگتا ہے
وہ خواہش وہ ارمان
وہ جذبات وہ پیار
میری مسکراہٹ پہ
تیرا قربان جانا
وہ سب یاد آتا ہے
دل ہر بل روٹتا ہے
زخمی دل فریاد کرتا ہے
لے آؤ وہ سب
وہی بیٹے بل
وہی بیتی یادیں
ماضی کو حال بنا دو میرا

حمیرا سلمان سومرو

دعا

تمہیں خوشیاں نصیب ہوں
راجس نصیب ہوں
اس عید پہ بھی.....
تمہارا چہرہ یونہی دے
روشنیوں سے مہکے.....
کہ.....
کوئی غم.....
تمہارے پاس نہ بھٹکے.....!

سیرا غزل

چاند رات

آج رات ہے چاند کی
اور میں سوچ رہی ہوں
یہ چاند رات!
کس ڈگر پر لے جائے گی
زندگی کی راہوں میں.....
وہی ہر چاند رات کی طرح
ناخوشگوار ہوگی.....
یا کسی حسین بل کی طرف لے جائے گی
اے زندگی!
چاند کی مانند نہ چھپ جا
کہ ہمیں زندگی کی راہیں
ہر طرف سے اداس لگیں.....

مدیحہ اعجاز حسین

سندیہ

میں ہواؤں کے رنگ کتنے سندیے بھیجوں
کہ تم لوٹ آؤ.....
تمہاری جان
لچلچو
پکھلتی جا رہی ہے
خیزتی جا رہی ہے
اور تم بے خبر
دور دلیں میں
نجانے کیوں خوش پھرتے ہو
کبھی تو اپنی جان کی خبر لیا کرو

کبھی اپنے اندر جھانک لیا کرو
کبھی بھولے سے ہی سہی
میرے نام کا کوئی خواب بن لیا کرو
کبھی میری پلکوں پہ نکلے آنسو
آ کر چن لیا کرو
کبھی تم بھی ہواؤں کے سنگ
اپنے جلد آنے کی نوید بھجواؤ
کبھی چاند میں لپیٹ کر
اپنی نیند بھجو میری عید بھجو

صائمہ ناز

”انا“

سنو.....!

تم جو کہتے تھے کہ
تم مجھ سے پیار نہیں، محبت نہیں، عشق کرتے ہو
صرف مجھ پر مرتے ہو
تمہارا دل تمہاری روح اور تمہارے جذبات
صرف میری امانت ہیں
تو جاناں!
امانت میں خیانت نہیں کیا کرتے
ورنہ گر جذبے مرجائیں تو
دوبارہ زندہ نہیں ہوا کرتے
اس سے پہلے کہ میں ٹوٹ جاؤں
اور خود سے بھی روٹھ جاؤں

صوبیہ ملک

نظم

بہت برسوں بعد!

عید کے چاند کے پہلو میں تمہیں دیکھا
ابھی دید کی پیاس ابھی بھی نہ تھی
اور تم نے جانے کی بات کر دی
دل کو سمجھا رہی تھی کہ
تم نے الوداع کہہ دیا مجھے
ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا جو
چودھویں کے چاند میں جگمگایا
اور!
عید کے چاند سنگ ڈھل گیا

سعدیہ عابد

نظم

ان ہی موسموں میں
ہم ملے تھے
کڑی دھوپ میں چھاؤں جیسے
ہم ملے تھے
وہ روٹھنا منانا
وہ بات ایک دوسرے کی
سمجھنا اور سمجھانا
وہ چاہتوں کے جو سلسلے تھے
ہم ایک دو جے کے ہو گئے تھے
فاصلے بھی سمٹ گئے تھے
تو!
اب یہ وقت کی دیوار تلے
کیوں آ گئے ہم

شنا ہے

محبت کو تجدید کی ضرورت ہوتی ہے
تو!

آؤ میرے ہمد
تجدید محبت کریں
ایسے مل جائیں کہ
پچھڑنے سے نفرت کر لیں
شنا ہے
محبت پاس و فار کھتی ہے
اپنی اور اپنے ہمد کی
حیاء کھتی ہے
سچا پیار کرنے والوں کو
ساتھ سدا رکھتی ہے
تو!

آؤ میرے ساتھی
ان ہی موسموں میں لوٹ آؤ
ان ہی موسموں میں

ہم ملے تھے
سیماسحر
نظم

عشق جنت ہے جنت کا نظارہ کیجیے
عشق خطا ہے یہ خطا کر کے دیکھئے
عشق عبادت ہے اسے محسوس کر کے دیکھئے
کیوں نہیں سمجھتے تم جاناں
عشق چاہت ہے برس کے دیکھئے
عشق اک حسین خواب ہے کبھی آ کر تو دیکھئے
فتا ہوئے ہزاروں اس عشق میں صنم

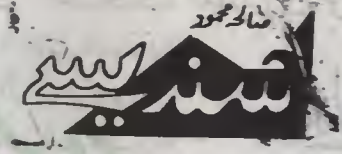
ہم امر کریں گے عشق کو کبھی سوچ کر تو دیکھئے
سارہ ناز محمد شفیق

حوری آئی

چمک چمک چمک چمک ٹرین چلی
دیکھو حوری آئی
رنگوں کے پُر پھیلائے
خوشیوں سے ناز رہا ہے مور نیا
چڑیا گانا گائے
دیکھو حوری آئی
میاؤں میاؤں کرتی موٹی ملی آئی
چمک چمک چمک چمک ٹرین چلی
دیکھو حوری آئی
کوک کوک کوک مرغی نے شور مچایا دیکھو حوری آئی
چمچ چمچ کرتی لومڑی نکلی
شیر بھی نکل کر خوشی سے غرایا
دیکھو حوری آئی
پیاری پیاری نینوں جب گھر آئی
دیکھو حوری آئی
پیاری پیاری سونے جیسی مسکان ہے اس کی
پھولوں جیسا چہرہ ہے
تتلی بن کر دوڑ رہی ہے آنگن میں
رنگوں کی پھوار گری
دیکھو حوری آئی

صالیہ محمود

☆☆☆



سیدہ ارم کراچی
بیاری آپ! السلام وعلیکم! امید ہے اللہ عزوجل کے کرم کی بدولت آپ خیریت سے ہوں گی۔ دل ہر وقت آپ کو دعاؤں میں یاد کرتا ہے اور آپ کی سلامتی کے لئے ڈھیروں دعائیں کرتا ہے۔ بیاری آپ! مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہوں مگر بھیجنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایک بار اپنی قلم بھیجی تھی جو شائع بھی ہوئی جس کے لئے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ ردا ڈائجسٹ میرا فوٹو ڈائجسٹ ہے اس کی کامیابی کے لئے بھی دعا گو ہوں۔ دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

فرخندہ اعظم جہلم
السلام وعلیکم! مجھے پوری امید ہے کہ آپ اور ہمارے ردا کی پوری ٹیم خیریت سے اور شاد و آباد ہو گی۔ آپ! یہ میرا پہلا خط ہے اسے ضرور شامل کیجیے گا آپ! نہایت مصروف ہونے کے باوجود خط لکھنے کا نام نکال ہی لیا ہے۔ آپ! مجھے ردا ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے تقریباً 7 سال ہو گئے ہیں۔ آپ! مجھے ڈائجسٹ سب ڈائجسٹوں سے زیادہ پسند ہے۔ بے آپ کے ناول بہت پسند ہیں آپ کا ناول ”کچی کلیاں آنگن کی“ اور ”تم میرے ہو کے رہو“

بہت پسند آئے ہیں۔ میں نے آپ کے ان ناول کو تقریباً آٹھ سے دس بار پڑھا ہے اور میرا دل کرتا ہے کہ پڑھتی رہوں۔ آپ! آپ! سب رائٹرز سے زیادہ اچھا لکھتی ہیں آپ میری فوٹو رائٹرز ہیں اور آپ کے بعد شازیہ مصطفیٰ ہیں۔ ان کے ناول بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ آپ! میرے پاس آپ کی تعریف کے لئے الفاظ ہی نہیں ہیں آپ بہت اچھی رائٹر اور اچھی انسان ہیں۔ میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ کو اور کامیابی عطا فرمائے اور صحت و تندرستی عطا کرے (آمین) اب اجازت چاہتی ہوں۔

نوبیہ ملک کراچی
بیاری آپ! السلام وعلیکم! صالحہ آپ! کیسی ہیں آپ؟ ردا کے تمام اسٹاف کو میرا سلام اور بہت سی دعائیں۔ ردا ہر بار کی طرح اس بار بھی بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے اگر بات کی جائے ”رگہ جاں سے جو قریب تھے“ کی تو اس ناول کا نام ہی بہت عمدہ اور خوبصورت ہے۔ اس کے کرداروں میں مجھے رومی اور اشعل بہت پسند ہیں۔ آپ کا انداز تحریر کیا عمدہ ہے۔ آپ کا ہر ناول ہی بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ آپ کا ناول ”تم میرے ہو

کے رہو“ میں کتنی بار پڑھ چکی ہوں لیکن ہر بار پہلے سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ امید ہے کہ اس ناول کا اینڈ بھی بہت دلچسپ اور منفرد ہوگا۔ ”کبھی عشق ہو تو پتہ چلے“ ناول بھی زبردست چل رہا ہے۔ شازیہ مصطفیٰ عمران کو سب سے پہلے تو ان کی شادی کی بہت مبارکباد اور شازیہ جی ویلڈن۔ اس بار بھی آپ بہت خوبصورت ناول لائی ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ ردا میں صالحہ آپ! اور شازیہ مصطفیٰ کا انداز تحریر پسند ہے۔ امید ہے کہ آپ میرا یہ خط لازمی شائع کریں گی نہ کے رومی کی ٹو کری کی نذر کریں گی۔ اس کے علاوہ ردا کی تمام رائٹرز بہت خوبصورت لکھ رہی ہیں کسی ایک کی تعریف کرنا نا انصافی ہوگی۔ باقی ردا کے تمام سلسلے ہی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ردا کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔

سیرا غزل کراچی
ڈیر آپ! السلام وعلیکم! کیسی ہیں آپ؟ میں بالکل خیریت سے ہوں اور تمام اسٹاف کو ڈھیروں دعائیں اور سلام۔ اگست کا ردا بہت اچھا لگا تمام کہانیاں اچھی لگیں۔ رمضان کی آمد بہت مبارک ہو۔ امید ہے ماہ رمضان رحمتیں اور برکتیں لے کر آئے ہم سب کے لئے۔ آخر میں ردا کے لئے ڈھیروں دعائیں۔ اللہ ردا کو یونہی ترقی سے نوازتا رہے آمین۔

امبر آنگن شاکل کراچی
السلام وعلیکم! صالحہ آپ! کیسی ہیں آپ؟ مجھے پانا یا بھول گئیں؟ میں امبر آنگن شاکل ہوں۔ ہاں

وہی امبر آنگن جو اکتوبر 2004ء سے مئی 2007ء تک مسلسل ردا کے لئے لکھتی رہی ردا سے ہی قلم کی چٹکی کا احساس ہوا ردا نے ہی لکھاری کا اعزاز بخشا ردا جو مجھ سے کبھی الگ نہیں رہا۔ پھر آپ لوگ مجھے کیسے بھول گئے میرے قارئین مجھے کیسے بھول گئے مجھے اپنے قارئین سے بہت گدہ ہے اگر میں اتنے عرصے غیر حاضری تو کسی نے مجھے یاد بھی نہیں کیا۔ کیا ہی رسم دینا ہے؟

صالحہ آپ! بہت عرصے کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ ردا کے لئے لکھو اور جب قلم اٹھایا تو ایک ہی نشست میں پوری کہانی لکھ ڈالی۔ ردا سے دل کا رشتہ ہے اور کوشش کی ہے کہ اچھوتی کہانی لکھوں اب آپ اور قارئین بتائیں گے کہ کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں۔ میں باقاعدگی سے ردا میں لکھنے کی کوشش کروں گی۔ اب اجازت دیجیے دوبارہ حاضری دوں گی بشرط زندگی اللہ حافظ۔

فرح ناز رفیق کراچی
محترمہ صالحہ محمود صلیبہ السلام وعلیکم! میڈم کچھ روز قبل آپ سے فون پر گفتگو ہوئی جب آپ نے کہا کہ میں صالحہ محمود ہوں تو یقیناً جانیں اپنی خوش قسمتی کا یقین نہ آیا میں تو سمجھتی تھی کہ کوئی دفتری ملازم فون اٹینڈ کرے گا بہر حال میں نے آپ سے ردا میں اپنی اسٹوری بھیجنے کے لئے ایڈریس اور اجازت چاہی تھی آپ نے جس محبت اور اپنائیت سے بات کی اور میری حوصلہ افزائی کی دل کو یقین سا ہو گیا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں جائے گی آپ سے بات کرتے وقت

میری ای میرے ساتھ تھیں، انہیں بھی بہت خوش ہوئی۔ میری تحریر میں بہت سی غلطیاں ہوں گی مگر آپ سے گزارش ہے انہیں نظر انداز کر کے ردا میں شائع کریں تاکہ جو قلم میں نے اٹھایا ہے وہ واپس نہ رکھ دوں۔ آپ کے ادارے کے علاوہ کوئی ڈائجسٹ ایسا نہیں جو نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ میرے علاقہ میں کوئی بڑا بک اسٹال یا لائبریری نہیں ہے جہاں سے ہر ماہ وقت پر ردا حاصل کر سکوں، دو سے تین ماہ بعد بڑی مشکل سے ردا ملتا ہے اس لئے اپنے خط کے ساتھ آپ کی مطلوبہ رقم بھی بھیجنے کا طریقہ معلوم کرنا چاہتی ہوں تاکہ ردا کی فراہمی آسان ہو سکے۔ میری تحریر کو ڈائجسٹ میں جگہ ملے یا نہ ملے مگر آپ کی آواز میرے کانوں میں سدا رہے گی جب آپ نے میرا نام لیا تھا کہ فرح آپ بھیجیں کچھ بھی پونٹری یا افسانہ ہم شائع کریں گے آپ سے بات آپ کی آواز ہر اعزاز سے بڑھ کر ہے کیونکہ آپ جیسے لوگ مجھ جیسے لوگوں کے لئے شیرازے، فہد مصطفیٰ جیسے آن سنے بن دیکھے مگر دلوں میں رہنے والے نایاب احساسات کی طرح ہوتے ہیں زیادہ وقت نہیں لوں گی بس اپنا خیال رکھیں آپ اور میری کوشش کو دوام بخشیں شکریہ۔ ای کی جانب سے سلام۔

عانہ نیازی ربوہ
السلام وعلیکم آپ کی اور تمام پڑھنے لکھنے والوں کو میرا خلوص بھر اسلام پیا قبول ہو۔ رمضان کی رحمتوں کے بعد عید سعید کی مسرتیں اور خوشیاں آپ سب کو مبارک ہوں۔ اب آتی ہوں اگست کے ردا کی جانب۔ آپ کی! آپ کا وعدہ ہوتا ہے کہ ردا کا عید نمبر سب سے منفرد

اور دلکش ہوگا اور آپ یقین جانیں ہر بار کی طرح اس بار کا عید نمبر بھی سیدھا دل میں اتر گیا۔ ہر تحریر عید کے حوالے سے مکمل جامع اور دلچسپ تھی میں اتنے کامیاب عید نمبر پر آپ کو ڈھیروں مبارکباد پیش کرتی ہوں ساتھ ہی ردا کی سالگرہ بھی آپ کو بے حد مبارک ہو۔ میری دعا ہے کہ ردا یونہی ہمارے دلوں کو مہکا رہے آمین۔

بسمہ علی سکھر
پیاری سی صالحہ آپ! السلام وعلیکم۔ مزاج بخیر امید ہے کہ معہ اہلخانہ اور اشاف بخیر ہوں گی۔ سب سے پہلے ردا کی سالگرہ کی بے حد مبارکباد قبول کریں! ماشاء اللہ سے ردا دن بدن خوبصورت اور نکھرتا ہی جا رہا ہے یہ ایک مکمل اور فیملی ڈائجسٹ ہے جسے پڑھ کر یقین جانتے بے حد اپنے پن کا احساس ہوتا ہے اور یہ یقیناً آپ کی محنت اور آپ کی رائٹرز کے مہر ہون منت ہے۔ اس بار کا عید نمبر بے حد خوبصورت اور دل کو بھاتا لگا، ہر رائٹر نے بہت خوبصورت اور دل سے لکھا تبھی میں یہاں کسی ایک کی تعریف نہیں کروں گی سب نے بہت بہت اچھا لکھا اور کمال لکھا سلسلے دار ناول پڑھے ہمیشہ کی طرح پسند آئے۔

منابل علی لاہور
السلام وعلیکم آپ! کیسی ہیں آپ اور باقی سب اشاف۔ امید کرتی ہوں کہ سب ٹھیک ہوں گے۔ آپ! میں تقریباً دو سال سے ردا پڑھ رہی ہوں ردا میرا فیورٹ ڈائجسٹ ہے تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں کوئی اندازہ نہیں لکھنے کا، پلیز مایوس مت کیجئے گا اور پلیز میرے خط کو

ردا میں جگہ ضرور دیجیے گا۔ اس بار کا ردا کا عید نمبر مجھے بے حد اچھا لگا، عید کے حوالے سے سب سے میری فیورٹ تحریر ”میری عید تم ہو“ انعم زبیری کی پسند آئی اور پھر روشنی فاطمہ اور ثناء خان صنعانے بہت متاثر کیا۔ مگر آپ! اس بار انعم خان اور نائلہ طارق کو ہم نے بے حد مدح کیا۔ خوشبو سنگھار اس ماہ میں میرے فیورٹ سلسلے ہیں جن میں ہمیشہ تمام موضوعات بہت اچھے اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

مبا سحر ہارون آباد
سلام آپ! تمام ردا اشاف اور تمام پڑھنے والوں کو رمضان کی برکتیں اور فضیلتیں بہت مبارک ہوں۔ ٹائل گرل اس بار سوسوگی۔ ردا کی سالگرہ پر آپ! آپ کو بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ خدا کرے کہ ردا یونہی ہزاروں سالگرہ منا رہے اور ہمارے لئے یونہی جتنا سنو رہے۔ ردا نے جنت اس بار رمضان اور عید کے حوالے سے بے حد خوبصورت اور ایمان افروز تھا۔ اب آتی ہوں ”رگ جاں سے جو قریب تھے“ کی طرف تو اس بار کی قطع نہایت چونکا دینے والی تھی جہاں ہمیں رومی کی بے بسی پر دکھ اور رنج ہوتا ہے وہیں صبا سمائی کی چالاکی حیران کرتی ہے اور اہمل کی ایسے موقعوں پر خاموشی غصہ بھی دلاتی ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے چونکہ پچھلی قسط کا اختتام انتہائی دلچسپ موڈ پر ہوا تھا۔ شاز یہ آپ! آپ کو تو کیا کہنے اگر ہمارے سامنے آپ ہوتیں تو یقیناً ہم آپ کے ہاتھ چوم لیتے۔ آپ دلوں میں گھر کرنے کا فن خوب

جانتی ہیں۔ آپ کی اسٹوری کا سب سے اکھڑ اور بد مزاج کردار شہران مجھے بہت پسند ہے اس بار اس کا ذکر نہیں تھا مگر پھر بھی مجھے اس کا کردار بے حد پسند ہے۔ عابدہ سین کے مکمل ناول کا پپی اینڈ بہت اچھا لگا اور سہاس گل کے ناول کا اینڈ بھی حسب توقع تھا مگر اس بار نائلہ طارق اور انعم آپ! کی تحاریر شامل نہیں تھیں جن کا ہمیں بے حد دکھ ہے۔ باقی اور آل پورا کا پورا ردا بہترین تھا۔

سیما سحر کراچی
مائی سوٹ اینڈ ڈیر سٹ صالحہ آپ! السلام وعلیکم! اللہ پاک سے امید اور دعا ہے کہ آپ بخیریت اور خوش ہوں گی۔ پھر دیر سے خط لکھنے پر معذرت۔ ردا باقاعدگی سے ہمیں مل رہا ہے اس محبت کے لئے تو میں جتنا آپ کا شکریہ کہوں کم ہے۔ امی اور چھوٹی بہنیں اس عنایت پر بہت خوش اور آپ کے لئے دعا گو ہیں۔ آپ سے پھر معذرت کہ میں نے اب تک کچھ نہیں لکھا۔ دراصل میں اپنے معاملات میں اس قدر پریشان اور آپ سیٹ ہوں کہ باوجود کوشش کے کچھ نہیں لکھ پا رہی ہوں۔ ذہن منتشر ہے اور پریشان کن خیالات کا بیکراں سلسلہ نہ مجھے سونے دیتا ہے نہ جاگنے۔ مجھے دعاؤں کی سخت ضرورت ہے میرے لئے بہت دعائیں کیجئے گا ڈیر آپ!۔ آپ سے ڈائجسٹ کا ہی نہیں دل کا بھی رشتہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹے گا انشاء اللہ۔

ردا کے تمام اشاف اور قارئین کے لئے ڈھیروں دعائیں اور پیار اور سلام۔
☆☆☆

گوشے چشم

فرح ناز رفتی کراچی
سوٹ فرح! ہمیں بھی آپ سے بات کر کے
بے حد اچھا لگا! آپ کا افسانہ ہمیں مل گیا ہے آپ کی
حوصلہ افزائی کے لئے انشاء اللہ ہم اسے ضرور دماغ میں
شامل کریں گے اپنا بہت خیال رکھئے گا اور اپنی اہلی کو
ہمارا اسلام بھی کہئے گا۔

سیدہ ارم کراچی
لولی ارم! آپ کا سندیر اور نظم دونوں اس بار روا
میں شامل ہیں اب تو آپ خوش ہیں ناں۔

فرخندہ اعظم جہلم
مائی سوٹ اینڈ لولی فرخندہ! آپ کے پیار اور
خلوص کا بے حد شکریہ۔ یہ آپ سب قارئین کی محبت
ہی ہے جو مجھے لکھنے پر آمادہ کرتی ہے امید ہے آپ
آئندہ بھی ردا کی محفل میں شامل ہوں گی۔ اپنا بہت
خیال رکھئے گا۔

عانیہ نیازی ریوہ
سوٹ عانیہ! آپ تو ردا کے مستقل سلسلوں کی وہ
مستقل قاری و لکھاری ہیں جو ایک عرصے سے ردا میں
شامل ہو رہی ہیں آپ کے اس پیار و تعاون کا بے حد
شکریہ۔ اپنا بہت خیال رکھئے گا بہت سی دعائیں آپ

امیر انگن ٹیکل کراچی
سوٹ امیر! ہمیں آپ یاد ہیں آپ خود اکثر
طویل غیر حاضر ہو جاتی ہیں۔ امید ہے اب آپ کی یہ
آمد مستقل ہوا کرے گی! آپ کا ناول مل گیا ہے
انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہوگا۔ بہت ساریاں
آپ کے لئے۔

ثوبیہ ملک کراچی
سوٹ ثوبیہ! آپ کی ردا سے وابستگی اور محبت کا
بے حد شکریہ۔ آپ کا افسانہ ہمیں مل گیا ہے انشاء اللہ
جلد ردا میں شامل ہوگا! آپ یونہی ردا کے سنگ اپنا
سفر جاری رکھئے۔

سائرہ شفیق ناز کراچی
سوٹ اینڈ لولی سائرہ! آپ کے پیار اور
خلوص کے ہم دل سے شکر گزار ہیں اور آپ کے
بنائے ہوئے خوبصورت چین کا بے حد شکریہ! آپ
نے جس خوبصورتی سے اس پر ہمارا نام لکھا اسی
خوبصورتی سے آپ کا نام ہمارے دل میں بھی اتر
گیا! آپ کا تحفہ ہمیں بے حد پسند آیا اور آپ سے
محبت و خلوص کا بے حد شکریہ خوش رہئے اور اپنا بے
حد خیال رکھئے گا۔

کچن

چکن سموسہ
اشیاء:
چکن کا قیرہ:
ہر اسالہ:
اورک لمبن ہری مرچ کا پیسٹ:
1 کھانے کا چمچ
لال مرچ پاؤڈر:
چائے کا آدھا چمچ
گرم سالہ پاؤڈر:
چائے کا آدھا چمچ
نمک:
دھنیا پودینہ ہری پیاز (کٹی ہوئی):
2 کھانے کے چمچ
کوکنگ آئل (فرانی کے لیے): 2 پیالی
لیموں کارس:
1 چائے کا چمچ
ترکیب: قیرہ میں ہرے سالے کا پیسٹ لال
مرچ گرم سالہ نمک ڈال کر پانی خشک ہونے تک
پکائیں۔ ٹھنڈا ہونے پر اس میں کٹا ہوا پودینہ دھنیا
ہری پیاز لیموں کارس ایک چائے کا چمچ اچھی طرح
مکس کر کے سموسوں میں بھر لیں اور فرانی کر لیں۔

ضروری اشیاء برائے سموسہ:
آٹا:
کوکنگ آئل:
گرم پانی:
2 پیالی
4 کھانے کے چمچ
ایک چوتھائی چمچ

چائے کا آدھا چمچ
نمک:
ترکیب: آٹے میں کوکنگ آئل نمک اور
پانی ملا کر نرم آٹا گوندھ لیں۔ آٹے کے پیڑے بنا
لیں۔ ہر پیڑے کو اپنی پھلتی میں دائرے کی شکل میں
کھماتے ہوئے آخر میں دبا کر چپٹا کر لیں۔ اس
پیڑے کو ٹین سے رول کر کے 4 انچ کی گول روٹی
کی بنا لیں اور پھر اسے درمیان میں سے دو ٹکڑوں
میں کاٹ لیں۔ نیم دائرہ روٹی کو سموسے کے لگانے
کے طور پر استعمال کریں۔ سیدھے کنارے کو
قدرے گرم پانی سے گھلا کر لیں۔ نیم دائرہ حصے کو
اس طرح فولڈ کریں کہ ایک ٹکونی بن جائے۔
سیدھے کناروں کو دبا کر ایک دوسرے میں پیوست
کر دیں۔ اس طرح کہ درمیان میں خلا نہ رہے۔
ان کون میں چکن کی فٹنگ بھر دیں۔ اب اوپری
کناروں کو گھلا کر کے ملا دیں تاکہ سموسے کی شکل
اختیار کر لے۔ درمیانی آنچ پر ان سموسوں کو گولڈن
براؤن ہونے تک ڈیپ فرانی کر لیں۔

ڈیپ فرانی چکن سینڈوچز:
اشیاء:
چکن میں نمک اور کالی مرچ ڈال کر فرانی کر لیں
چکن (ریڑھ کیا ہوا): 1 پیالی
بنیز:
1 پیالی (کدو کش ہوئی)

ماونیز: آدھی پیالی
بریڈ سلاکس: 8 عدد

ترکیب: بریڈ سلاکس کو درمیان سے کاٹ کر رکھ لیں۔ چکن میں مایونیز ملا کر سلاکس پر لگائیں اور پیئر بھی لگائیں۔ پھر ایک پین میں مکھن ڈال کر سینڈوچز اچھی طرح فرائی کر لیں۔ سینڈوچز فرائی ہو جائیں تو نشوونما پر نکال لیں۔

بیف و دو بکجی ٹیبل رول

اشیاء: گائے کا گوشت: 1 کلو
قیمہ کرنے کے لیے دودھ مشین سے نکالیں:
ادریک، لہسن، پیسٹ: 2 کھانے کے چمچ
آلو (ابلا اور میس کیا ہوا): آدھی پیالی
ہری مرچ، ہر ادھنیہ: حسب ذائقہ
گرم سالہ پاؤڈر: چائے کا چوتھائی چمچ
گاجر (کدو کش): آدھی پیالی
ثابت گول لال مرچ: 10 عدد

انڈے: 2 عدد
کوننگ آئل: فرائی کرنے کے لیے
میدہ: آدھی پیالی
لیموں کارس: 2 کھانے کے چمچ
پاپے کا چورا: 2 پیالی
ہری پیاز: 2 کھانے کے چمچ

ترکیب: قیمہ میں ادریک، لہسن، گول لال مرچ ڈال کر بال لیں اور باریک پس لیں۔ اب قیمے میں گرم سالہ، لیموں کارس، ہر ادھنیہ، ہری مرچ، ہری پیاز (باریک کٹی ہوئی) آلو گاجر ملا کر ہاتھوں سے اچھی

طرح مکس کریں۔ لمبائی میں چار انچ لیے رول بنا کر میدے میں رول کریں۔ انڈے میں پیسٹیں پھر پاپے کے چورے میں لیٹ کر ہلکے گرم کوننگ آئل میں دھیمی آنچ پر پندرہ منٹ تک فرائی کریں تاکہ اندر تک پک جائے۔ ناریل کی ہری چٹنی یا ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

آلو کے کباب

اشیاء: انڈے: 2 عدد (ابلے ہوئے)
آلو: 1 کلو
ہری مرچ: 4 عدد (کٹی ہوئی)
پیاز (چورا شدہ): درمیانہ سائز
سفید زیرہ (بھنا ہوا): آدھا کھانے کا چمچ
ڈبل روٹی کا چورا: 1 کپ
نمک، کالی مرچ: حسب ذائقہ
تیل: تیلے کے لیے
ترکیب: آلو دھو کر بال لیں۔ چھلکا اتار لیں اور آلو کا بھرتا بنالیں۔ تمام مصالحے ملا دیں اور اچھی طرح مکس کر لیں، تھوڑی دیر رکھا رہنے دیں پھر ہاتھ کو گیلا کر کے کباب بنالیں۔ جب ملنا ہو تو کباب میں پہلے ڈبل روٹی کا چورا اور پھر انڈے لگا کر تیل میں۔ آلو کے کباب تیار ہیں۔ کچپ یا چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

دہی پھلکی

اشیاء: نمین: ڈیڑھ کپ
پیاز ایک عدد درمیانہ سائز (پیس لیں):

لہسن: 4 جوے (پیس لیں)
اجوائن: 1 چمکی
سفید زیرہ: 1 چائے کا چمچ
میٹھا سوڈا: آدھا چائے کا چمچ
نمک: آدھا چائے کا چمچ
کٹی ہوئی مرچ: آدھا چائے کا چمچ
دہی: 2 چائے کے چمچ
راستے کے اجزاء:

دہی: آدھا کلو
دودھ: 1 کپ
چٹنی: 2 چائے کے چمچ
دہی پھلکی کا مصالحہ: 1 چمچ
لال مرچ ثابت: 12 عدد
سفید زیرہ: 1 چائے کا چمچ
کالی مرچ: 10 عدد
ثابت دھنیہ: 1 چائے کا چمچ
اجوائن: 1 چمکی

تمام مصالحوں کو توڑے پر ہلکا سا بھون کر پیس لیں اس میں سیاہ نمک چمکی بھر سفید نمک دو چائے کے چمچ، ٹائری یا لیموں کارس تھوڑا سا ڈال لیں ورنہ کھٹائی پاؤڈر ملا لیں یہ مصالحہ آپ چاٹ میں استعمال کر سکتی ہیں۔

ترکیب: نمین میں میٹھا سوڈا، دہی، سفید زیرہ، پیاز، لہسن، نمک، مرچ ڈال کر تھوڑے پانی کے ساتھ پلینڈر میں اچھی طرح پھیٹ لیں، باؤل میں نکال کر دس منٹ رکھ دیں اور پھر درمیانی آنچ پر تیل یا گھی میں تیل لیں، دوسرے باؤل میں آدھا کپ دہی کو پھیٹ کر لسی بنالیں یعنی ایک سے ڈیڑھ کپ

پانی شامل کر لیں، چمکی بھر نمک ڈال کر نکال لیں اور سرونگ باؤل میں رکھتی جائیں اس کے بعد دودھ، دہی، نمک، مرچ، چٹنی ڈال کر پلینڈر میں اچھی طرح پھیٹ لیں، فائن پیسٹ بن جائے گا اس کو باؤل میں نکال لیں۔

المی: آدھا پاؤ
سفید زیرہ: آدھا چمچ
چٹنی: 4 چمچ
پانی: 1 کپ

ترکیب: اسٹیل کے برتن میں اتنا پکائیں کہ گٹھلیاں الگ ہو جائیں، اب چھان کر شیشے کی بوتل میں ڈال لیں اور فریج میں رکھ لیں، کافی دن تک خراب نہیں ہوتی۔ جب دہی بڑے سرو کرنے ہوں تو پہلے ڈش میں دہی پھلکی رکھیں اوپر سے دہی کا رائے ڈالیں، دہی پھلکی کا مصالحہ چمک دیں اور چٹنی بھی ڈال دیں یا الگ سے پیالے میں رکھ دیں خوش رنگ اور صحت بخش دہی پھلکی تیار ہے۔

شیر خرم

اشیاء: دودھ: 2 لیٹر
کھویا (چورا کر لیں): آدھا کپ
گھی: 1 پاؤ
بادام: 1/2 کپ
پستہ: 1/2 کپ
سبز الائچی: 5-6 عدد
کھوپرا (باریک کٹا ہوا): 1/2 کپ
ترکیب: ایک پین میں دودھ ڈال کر اس میں

سنگھار

چہرے پر ملیں آدھے گھنٹے بعد مین سے منہ دھولیں۔
☆ بالائی میں چند قطرے لیموں کا رس ملا کر
چہرے پر لگائیں ہر روز گاجر کا جوس پیئیں۔
☆ خوراک میں پھلوں کا استعمال زیادہ کرنے
سے بھی انسان کے چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔
☆ پانی زیادہ پینے سے بھی چہرہ شاداب رہتا
ہے۔ مین میں دودھ یا بالائی ملا کر اسے آہستہ آہستہ
کچھ دیر چہرے پر رگڑیں، چند منٹ بعد منہ دھولیں
صابن کا استعمال نہ کریں، چہرہ ملائم اور خوبصورت
ہو جائے گا۔

☆ لیموں کا رس آدھی چھٹانک، سفید گسر لین
ایک چھٹانک، گلاب کا عرق آدھا چھٹانک،
ہائیڈروجن پر آکسائیڈ اور بورک پاؤڈر آدھا آدھا
ماشہ ان سب اشیاء کو یک جان کر کے کسی صاف شیشی
میں محفوظ کر لیں اور رات کو سوتے وقت منہ دھو کر خشک
کر کے چہرے پر لگائیں اور صبح منہ دھولیں یہ رنگت
نکھرنے کے علاوہ منہ کی خشکی بھی دور کر دے گا۔

☆ انڈے کی سفیدی ایک چمچ، لیموں کا رس ایک
چمچ، بادام روغن چند قطرے ان سب کو خوب اچھی
طرح ملا لیں اور اسے چہرے پر ملیں، خشک ہونے پر
نیم گرم پانی سے منہ دھولیں، رات کو منہ دھو کر چند دانے
لیموں کے رس میں بھگو دیں اور صبح نہار منہ

رنگت نکھاریے

☆ نمک ملے پانی سے منہ دھونے سے رنگ
نکھڑا آتا ہے۔ بادام کی گریاں بغیر چھلے کسی مٹی کے
کھردرے برتن پر رگڑیں اور ان میں تھوڑی سے
بالائی ملا کر چہرے پر ملیں ایک گھنٹہ بعد کسی اچھے
صابن سے منہ دھولیں، بادام روغن کو پانی میں
پھینٹ کر چہرے پر لپ کرنے سے رنگ نکھڑتا
ہے۔

☆ زیتون کے خالص تیل میں چند قطرے
لیموں کا رس ملا کر چہرے پر مساج کریں۔ شہد نیم گرم
پانی میں ملا کر روزانہ پیئیں۔

☆ انڈے کی سفیدی میں پنے کی وال باریک
پیس کر کریم بنا لیں اور چہرے پر ملیں، دس منٹ بعد
چہرہ دھولیں۔

☆ شکر کے شربت میں لیموں کا رس نجوڑ کر پینے
سے رنگ نکھڑتا ہے۔

☆ رات کو سونے سے پہلے دودھ میں زیتون کا
تیل ڈال کر پینے سے رنگ نکھڑتا ہے۔

☆ لیموں کے عرق میں ملانی مٹی پیس کر چہرے
پر لپ کریں۔

☆ گسر لین میں آدھا لیموں کا رس نجوڑ کر

چاشنی بن جائے تو اس میں رس گلے (بالز) ڈال کر
ہلکی آگ پر پکائیں۔ رس گلے پک کر پھول جائیں تو
انہیں برتن میں نکال کر اس کے بعد چینی کا قوام تیار
کریں جو کہ زیادہ گاڑھا نہ ہو۔ تیار شدہ چینی کے قوام
میں پستے کے ٹکڑے اور رس گلے ڈال دیں اور کسی
پیالے یا ڈش میں نکال کر فریج میں رکھ لیں، ٹھنڈا
ہونے پر نوش فرمائیں۔

خوبانی کا میٹھا

اشیاء:
دودھ:
خوبانی:
چینی:
کسٹر ڈاؤر:
کریم:
ترکیب: خوبانی ایک دن پہلے بھگو دیں پھر
خوبانی میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں جب
خوبانی گل جائے تو نیچے اتار کر گھلی نکال دیں اور
پھر سے پکائیں اس میں ڈیڑھ پاؤ چینی ڈال کر چمچ
چلاتا شروع کر دیں اس وقت تک پکائیں جب تک
گاڑھی فیرنی کی طرح نہ ہو جائے پھر اتار کر ٹھنڈا
ہونے دیں دوسری پتلی میں دودھ چڑھا کر اس میں
کسٹر ڈاؤر ملا کر کسٹر تیار کر لیں اسے ٹھنڈا کر
لیں اب شیشے یا چینی کی ڈش میں ایک تہہ کسٹر ڈی
ڈالیں اور پھر خوبانی، آخر میں کسٹر کی تہہ بچھا دیں
اور فریج میں ٹھنڈا ہونے رکھ دیں جب ٹھنڈا ہو
جائے تو کریم خوب پھینٹ کر اوپر ڈال دیں اور
پیش کریں۔

کھویا کس کر کے چولہے پر رکھ دیں اور ڈھکن
ڈھانپ کر پکنے دیں جب دودھ اور کھویا کس ہو کر
اپنے لگیں تو اس میں سونیاں اور چینی ڈال کر کچھ دیر
مزید ابالیں پھر اس میں تمام میوے ڈال دیں اور
ہلکی آگ پر چند منٹ پکائیں تاکہ آمیزہ گاڑھا ہو
جائے۔ ایک دوسرے پین میں گھی گرم کر کے
الاجچی کے بیج کڑکڑائیں پھر اس گھی کو مع الاجچی
شیر خراماں ڈال دیں اگر چاہیں تو خشبو کے لئے
چند قطرے عرق گلاب یا کیوڑا ڈال کر ڈش میں
نکال لیں۔

رس گلے

اشیاء:
چاول کا آٹا:
دودھ:
ٹائری:
چینی:
پستہ:
ترکیب: ایک برتن میں دودھ ڈال کر چولہے پر
رکھیں جب دودھ ابلنے لگ جائے تو اس میں ٹائری
ڈال دیں جب دودھ پھٹ جائے تو چولہے پر سے
اتار لیں اور کسی باریک کپڑے میں ڈال کر پوٹی باندھ
کر نجوڑ لیں۔ دودھ سے تمام پانی نجوڑ جائے تو پچی
ہوئی پنیر کو پلٹ میں ڈال کر اس میں باریک پسا ہوا
چاول کا آٹا ملا کر کس کر لیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک
دونوں اجزاء کو آپس میں کس کرتی رہیں اور پھر اس
آمیزے کی چھوٹی چھوٹی بالز بنا لیں اب پستے کو
باریک کاٹ کر رکھ لیں پھر ایک برتن میں چینی اور تین
کپ پانی ڈال کر چولہے پر رکھیں جب ایک تار کی

کھالیں۔ انار کا جوس رنگ نکھارتا ہے۔
☆ پیچے کا چھلکا جلد پر رگڑ کر لگانے سے جلد کا

رنگ نکھر جاتا ہے اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔
☆ دودھ پینے سے جلد ملائم اور سفید ہوتی ہے۔

☆ پالک جلد کی رنگت نکھارتی ہے اس کے علاوہ گرم پانی جسم کی رنگت قائم رکھنے میں ایک زبردست معاون ہے۔
☆ آم رنگ نکھارتا ہے اور بدن کو فربہ کرتا ہے۔

☆ زیتون کا تیل، بادام روغن، گلسر لین تینوں کو ہم وزن لے کر رات کو سوتے وقت روزانہ چہرے پر مالش کریں اور صبح منہ صابن سے دھولیں۔۔
☆ کھیرے کا رس نکال کر چہرے پر لگا کر اسے سوکھنے دیں باقاعدگی سے ایسا کرنے سے چہرے کی جلد صاف ہو جاتی ہے۔

☆ روغن بادام میں شہد ملا کر چہرے پر لگانے سے خشک اور بے رونق جلد تروتازہ ہو جاتی ہے اس محلول کو چہرے پر لگا کر 20 منٹ کے بعد چہرہ دھولیں۔
☆ پسلی ماش کی دال میں تھوڑا سا بادام روغن یا زیتون کا تیل اور پانی ملا کر چہرے پر ملنے سے چہرہ نکھر آتا ہے۔

☆ آدھا پاؤ دودھ میں دو عدد لیموں کا رس نیچو لیں جب دودھ اچھی طرح پھٹ جائے تو اس کو چھان کر پانی علیحدہ نکال کر ایک بوتل میں ڈالیں اس پانی کی مقدار کے برابر اس میں عرق گلاب شامل کر لیں

اس لوشن کو رات سونے سے پہلے چہرے پر لگائیں اور صبح منہ دھولیں۔

☆ ایک پیالی گرم پانی میں تین ماشے شہد ڈالیں اور اس میں ڈیڑھ تولہ دودھ ڈال کر مکس کر لیں اس محلول کو روئی یا اسفنج کی مدد سے چہرے پر لگائیں پندرہ منٹ بعد تازہ پانی سے منہ دھولیں۔
☆ دو بڑے چمچے دودھ میں ایک چھوٹا چمچ نمک ڈال کر حل کریں اور رات کو سوتے وقت روئی کی مدد سے چہرے پر لگائیں۔ صبح اٹھ کر منہ دھولیں۔

☆ لیموں کا ایک ٹکڑا دودھ میں بھگو دیں، ایک گھنٹہ بعد اسے چھان لیں اور چہرے پر لگائیں، شہتوت کے ورخت کے پتے سے کچھ کانٹے لے کر دودھ کے ساتھ پتھر پر گھس لیں، اس کا لیپ روزانہ رات کے وقت چہرے پر لگائیں۔

☆ رات کو سونے سے پہلے دودھ روئی کی مدد سے چہرے پر لگائیں پانچ منٹ تک دودھ میں روئی بھگو بھگو کر چہرہ صاف کریں، پھر پندرہ منٹ تک اسے یونہی رہنے دیں۔ پندرہ منٹ بعد تازہ پانی میں ایک چمچ دودھ ڈال کر چہرہ دھولیں اس سے جلد سفید اور ملائم ہو جائے گی۔ روزانہ ایک ٹماٹر کا گودا اور انڈے کی سفیدی دونوں اچھی طرح مکس کر کے چہرے پر لیپ کریں پندرہ منٹ بعد تازہ پانی سے چہرہ دھولیں۔

☆ کچا دودھ لے کر اس میں تھوڑا سا بیسن اور ایک چنگلی ہلدی شامل کر لیں یہ لیپ پندرہ منٹ صبح اور پندرہ منٹ کے لئے شام کو چہرے پر لگائیں۔

☆☆☆☆☆